سازمان تبلیغات اسلامی
شعبه بین الملل

مغربی تمدن کی ایک جھلک

مؤلف: حضرت سید مجتبی موسوی لاری

786
2128

سازمان تبلیغات اسلامی

قسمت

روابط بین المللی

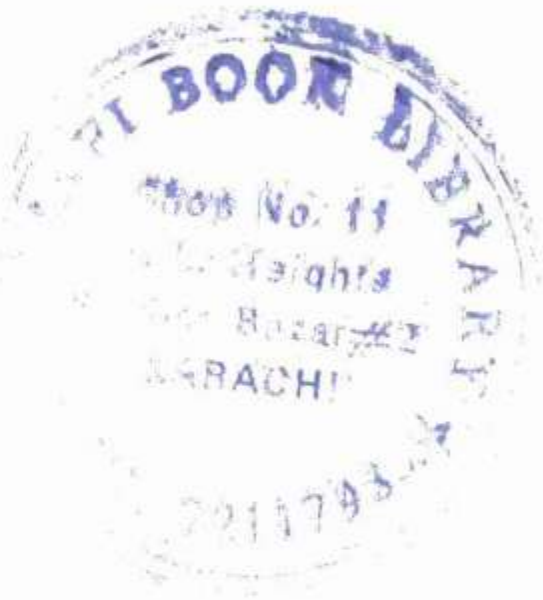

مغربی تمدّن کی ایک جھلک

مؤلف

حضرت سید مجتبی موسوی لاری

۲

نام کتاب : مغربی تمدّن کی ایک جھلک
نام مصنف : سرکار علامّہ مجتبی موسوی لاری
تعداد : دس ہزار
ناشر : سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین الملل
مترجم : مولانا روشن علی پرنسپل منصبیہ عربی کالج میرٹھ
پریس : مہر قم
کتابت : محمد عباس خوشنویس بگھروی
تاریخ : ۱ ربیع الاول ۱۴۰۳ ھ

اِهداء

اپنی تمامتر خامیوں کا معترف ہوتے ہوئے اس کتاب
کو امام زمانہ حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کی
بارگاہ میں پیش کر کے طالبِ مغفرت ہوں۔

رَوشن علی

فہرست

مضمون	صفحہ
حصّہ اوّل	
سیرِ زندگی و تمدنِ بشر	۹
حجریٰ زمانہ	〃
دھاتوں کا زمانہ	۱۰
تاریخ کا پہلا دَور	۱۲
تاریخ کا وسطی دَور	〃
دَورِ تجدّد	〃
آج کا ترقی یافتہ مغربی تمدّن	۱۴
عیسائیت کے اسباب ترقی	۲۷
کلیسا کے جرائم	۲۹
اسلام کے خلاف مسیحی تبلیغات	۴۴
مغربی دنیا کا اخلاق	۴۹
کلیسا کی عبادت	۶۰
الکحل کے نقصانات	۶۵
آج کی دنیا میں زندگی کے تناقضات	۷۰
موجودہ تمدن کی وحشت گری	۷۵
نسلی امتیاز	۸۳
گھریلو زندگیوں میں افراتفری	۸۹
حیوان دوستی	۹۵
مہر و محبّت کی کمی	۹۹
حصّہ دوم	

مضمون	صفحہ
دنیاوی مشکلات کا حل	۱۰۷
کم نظری	۱۲۱
اسلام اور اقتصادی مشکلات	۱۳۰
مغربی تمدن میں اسلامی نقوش	۱۴۴
علمی و ادبی انقلاب	۱۴۸
طبابت	۱۵۴
دواسازی	۱۵۸
اسپتال	۱۶۰
کیمیا	۱۶۲
ایجادات	۱۶۶
ریاضیات	۱۶۹
جغرافیہ	۱۷۱
ہُنر	۱۷۳
الکحل اور اسلام	۱۸۰
اسلامی و نسلی امتیازات	۱۹۲
اسلام عدالت و آزادی کا دین ہے	۱۹۶
جہاد اسلامی کی عِلّت	۲۱۱
اسلام کی نظر میں معاشرہ	۲۳۵
طلاق در اسلام	۲۵۳
مُتعہ	۲۶۹
تعدّد ازواج	۲۷۸

دیباچہ

"مغربی تمدن کی ایک جھلک" آپکے سامنے ہے۔ مغرب اسلام کے خلاف جو مستقل پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ اسکی حقیقت تو پڑھے لکھے لوگوں کو پہلے ہی سے معلوم تھی۔ لیکن انقلابِ ایران کے بعد یہ حقیقت برافگندہ نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے بی۔ بی۔ سی لندن ہو یا امریکہ کا ریڈیو یا کسی بھی مغربی ملک کے ذرائع نشر و ابلاغ ہوں سبھوں نے بار بار ـــــ جب انقلاب کے بعد مجرمین کو سزائیں دی جارہی تھیں ـــــ یہ تو اعلان کیا کہ آج اتنے لوگوں کو گولی ماردی گئی۔ آج اتنے آدمیوں کو قتل کر دیا گیا! لیکن کبھی آپنے یہ بھی سُنا کہ آج اتنے لوگوں کو معاف کیا گیا؟ آج اتنے لوگوں کو شبہ کا فائدہ پہونچا؟

رہبر انقلاب اسلامی آیۃ ـــــ العظمیٰ۔ الامام المجاہد سرکار روح اللہ الموسوی الخمینی مدظلہ العالی کے بارے میں کیا کیا خبریں یہی بی۔ بی۔ سی لندن نے نشر نہیں کیں؟ جن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا مثلاً ابتدائے انقلاب میں برابر سرکار آیۃ اللہ کو خود ساختہ صدر کہتا رہا۔ اور مہینوں ان کو "صدر" کے لقب سے نوازتا رہا اور درپردہ غیر شعوری طور پر لوگوں کو یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ یہ انقلاب اپنی حاکمیت منوانے کے لیے ہے، جذبۂ حکومت نے سرکار خمینی مدظلہ کو انقلاب پر آمادہ کیا ہے۔ حالانکہ انقلاب کے بعد سے آپ ابتک ایک دن کے لیے بھی صدر نہیں بنے۔!

یہ غلط پروپیگنڈے آج ہی سے نہیں ہمیشہ سے کیے جارہے ہیں۔ مثلاً مغربی پریس، مغربی دانشور، مغربی مفکرین برابر یہ کہتے رہے ہیں کہ اسلام "جامع دین" نہیں ہے۔ اسلام زندگی کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام کے پاس کوئی نظامِ زندگی نہیں ہے۔ طرزِ حکومت اور حکومتی قوانین کا اسلام کے پاس فقدان ہے۔ اسلام تو صرف حیض و نفاس کا مذہب ہے۔ کچھ اخلاقی قدریں اسلام کے پاس ضرور ہیں، مگر انسانی معاشرہ کے سدھار کے لیے اسلام کے پاس کچھ نہیں ہے ـــــ لیکن آپ اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام کیا ہے؟ اور اس کے مقابلے میں مغرب کتنا تہی دامن ہے، کتاب ختم کرنے کے بعد ہی آپ اسکا اندازہ لگا سکیں گے۔

کچھ مصنف کے بارے میں!

اس کتاب کے مصنف آیۃ اللہ السید مجتبیٰ موسوی لاری ہیں۔ آپ کی ذات گوناگوں صفات کی حامل ہے، اتنے بڑے عالم ہو کر اتنا سادہ مزاج رکھتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ آپکی سیرت کو دیکھ کر آئمہ معصومین کی سیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے جرائد میں آپ کے بلند پایہ علمی مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور آپ باور کریں کہ جناب مصنف ہمارے یہاں جتنے غیر معروف ہیں اتنے ہی مغربی ممالک میں اور علمی حلقہ میں مشہور ہیں۔ آپکے مضامین کے ترجمہ زیادہ تر غیر اردو زبانوں میں برابر ہوتے رہتے ہیں۔ اردو میں شاید یہ موصوف کی پہلی کتاب ہے۔ جو اردو داں طبقہ کے سامنے آرہی ہے۔ کاش ارباب قلم

متوجہ ہوں تو مصنّف کے دیگر مقالے، کتابیں، مضامین اردو زبان میں بھی منتقل ہو جائیں۔

کچھ کتاب کے متعلق یہ کتاب انگریزی، جرمنی، فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ خود فارسی میں اب تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسی سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دیگر زبانوں میں جب یہ کتاب چھپی ہے تو اس کے پریس، علماء و مفکرین نے اپنی اپنی زریں رائے سے مصنف کو بھی مطلع کیا اور اخباروں و رسالوں میں اس کتاب پر تبصرے بھی شائع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ تمام تبصروں کو یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ تمام تبصرے خود ایک مستقل حجم رکھتے ہیں۔ البتہ چند اقتباسات کو بطور نمونہ میں یہاں پر نقل کروں گا۔

اس کتاب کا ترجمہ تو دو سال پیشتر ہو چکا تھا مگر خدا بھلا کرے کاتب صاحب کا جنہوں نے دو سال سے زیادہ کتابت میں صرف کر دیئے۔ اب طباعت کی منزل میں کتنی دیر ہوئی ہے۔ خدا ہی بہتر جانے۔ چنانچہ روزنامہ پولستار ۴ر جون ۱۹۷۷ء چاپ لندن میں ہے۔

کتاب تمدن غرب از دیدگاہ اسلام، مصنفہ سیّد مجتبیٰ موسوی لاری ایرانی
از انتشارات ایتیموس۔ قیمت: ایک لیرہ۔

چند سال پہلے ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب "کیا انگریز آدمی ہیں؟" کے نام سے لکھی تھی، یہ کتاب کچھ اس سلیقہ سے لکھی گئی تھی کہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہم لوگ واقعی اخلاقی کمزوری اور دیگر خامیوں میں مبتلا ہیں۔ یہ کتاب انگریزوں کو بھی بہت پسند آئی اور بازار میں بہت زیادہ فروخت ہوئی۔

ایرانی مصنّف جناب سیّد مجتبیٰ نے بہت صاف طریقے سے نقل کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ انگریز محتاجوں اور غریبوں سے زیادہ کتوں پر توجہ کرتے ہیں۔ موصوف نے طبقاتی نابرابری پر بہت سخت نکتہ چینی کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں قارئین کو اسلام کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اور ایک امریکی مصنف کی ایا صوفیہ میں نماز سے متعلق تحریر کو بطور شاہد پیش کیا ہے کہ کس طرح محمود و ایاز کا فرق نماز میں ختم ہو جاتا ہے۔ کالے گورے میں کوئی تفریق نہیں رہتی۔ اور اس سے مصنّف یہ ثابت کرنا چاہتے کہ اس سے شخصی آزادی، ڈیموکریسی، برابری کا جو ثبوت ملتا ہے وہ بہت ہی واضح ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ امریکہ کے سیاہ پوشوں کے لیے اسلام ہی میں جائے پناہ ہے۔

جو لوگ محمد علی کے تبدیلیٔ اسم پر متردد ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے۔ یہ کتاب اسلامی معلومات کے لیے بہت ہی مفید ہے

جو لوگ اسلام کے بارے میں بحث کرتے ہیں ان کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

مؤلف کا مقصد یہ ہے کہ مغرب کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمی کو دور کریں، اور مغربی لوگ جو اس قسم کے نقد و تبصرہ کے متحمل ہوتے ہیں ان کو بھی اپنے بارے میں اور معاشرہ کے بارے میں انصاف سے کام لینا چاہیئے۔

روزنامہ "دی اسٹار"، ۱۲ر جنوری ۱۹۷۸ء چاپ لندن لکھتا ہے:

دوسرے لوگ ہم کو اس طرح دیکھتے ہیں!

دوسروں کا ہمارے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس سلسلہ میں ایک کتاب "تمدن غرب از دیدگاہ اسلام" لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ایک ایرانی عالم نے اسکو لکھا ہے۔ وہ مسلمان طالب علم جو یورپ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور مغربی رسوم کے دلدادہ ہیں ان کی ہدایت و رہنمائی کیلئے لکھی گئی ہے۔ جنسیات، طبقاتی نابرابری، الکحل، مفاسد معاشرہ کے عنوان سے جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ واقعات درست ہیں اور ان کا انکار ممکن نہیں ہے۔ جنس کے موضوع پر مصنف کا یہ کہنا بجا ہے کہ مغربی اس سلسلہ میں اخلاقی حدود کو توڑ کر کچھ آگے ہی نکل گئے ہیں۔

مجلہ خاور میانہ بین المللی جون ۱۹۷۸ء چاپ لندن لکھتا ہے کتاب "سیمائے تمدن غرب" مولفہ آقائی سید مجتبیٰ موسوی لاری ترجمہ آثار فرانسس گلدین۔ مطبوعہ اپتیموس قیمت ایک پونڈ۔ مغربی معاشرہ کی صحیح ترجمانی کرتی ہے اور غیر متعلق شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آقائی سید مجتبیٰ ایک مذہبی و علمی خانوادہ کی ایک بلند پایہ شخصیت ہیں۔ مسلسل تین نسل سے ان کے بزرگ ایران نو کی تعمیر میں مشغول رہے۔ مؤلف کے والد بزرگوار جنبش انقلابی کے روح رواں تھے جنہوں نے اس صدی کے پہلے دہے میں قاچاریہ سلسلہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ مولف نے ایران کے مقدس شہر قم میں اپنی علمی پیاس بجھائی اور آج بھی وہیں اقامت پذیر ہیں۔ تحصیل علم کے بعد ۲۹ سال کی عمر میں بغرض معالجہ آپنے جرمنی کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کے دقیق مشاہدات، وسیع مطالعات اس کتاب میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔

مولف کی شخصیت ان بزرگ علماء سے کسی طرح کم نہیں ہے جن کا تذکرہ کتاب "استعمار الجدید یرش تمدن غرب" میں کیا گیا ہے بلکہ آپ ان کے برابر ہیں۔ بس یہ ہے کہ آپ بیسوی صدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ہماری ناہم آہنگی، تمدن کی بے راہ روی، بیکاروں اور بھوکوں اور ناز و نعم میں پروردہ کتوں کے وجود، مجرم جوان، بے حیا عورتوں کے وجود نے مصنف کے جذبات کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ بقول مصنف اگرچہ اس کتاب کے بعض حصے (انگریزوں کے لیے) تکلیف دہ ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جناب سید مجتبیٰ موسوی نے جس طرح ہمارے معاشرہ پر نقد و تبصرہ کیا ہے وہ اسلامی معاشرہ کے نقائص پر بھی اسی طرح اعتراض کرتے ہیں۔ البتہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ خلوص و صداقت پر مبنی ہے۔

میں لوگوں سے سفارش کرتا ہوں کہ اس کتاب کو خرید کر ضرور پڑھیں

روزنامہ ڈیلی ایڈورٹائیزر دوشنبہ ۱۳ر جنوری ۱۹۷۷ء چاپ کیلیفورڈ لکھتا ہے "کتاب تمدن

غرب از دیدگاہ اسلام" مولفہ سید مجتبیٰ موسوی۔ مترجمہ فرانسیس گلدین از انتشارات اپتیموس۔

دو سو سال یا اس سے پہلے کے مغربی یورپ کے باشندے اپنے یورپی دوستوں کے ساتھ مشرق کا سفر کرتے تھے تو شرق کی پراسرار باتیں دریافت کر کے پلٹتے تھے اور بیان کرتے تھے۔

لیکن اب صورتحال بدل گئی ہے۔ مشرقی لوگ اپنے دوستوں کے ہمراہ ان اطراف کا سفر کرتے ہیں اور ہمارے معاشرہ کی چیزوں کو سیکھتے ہیں۔

سید مجتبیٰ موسوی ایک ایرانی عالم ہیں جو ۱۹۶۳ء میں بغرضِ علاج جرمنی آئے تھے اور یہاں کی دیکھی ہوئی چیزوں کو اپنی کتاب میں پیش کیا ہے، یہ کوئی چاپلوسی نہیں ہے۔ بلکہ مصنف کا اصلی مقصد صرف اتنا ہے کہ یورپ کے پاس سوائے صنعتی ترقی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم لوگ دین و اخلاق سے عاری ہیں، ہمارا معاشرہ فاسد ہے۔

اور مصنف نے جو کہا ہے وہ خلافِ انصاف بھی نہیں ہے۔ خود ہمارے مصلحین اور سیاسی مفکرین بھی اس بات کو کہہ چکے ہیں کہ ہمارا معاشرہ فنا کی طرف رواں دواں ہے۔ البتہ ایک غیر یورپی کی رائے کا معلوم کرنا ایک حد تک مفید ہے۔ چاہے وہ موسمی صدا ہی کی طرح ہو کہ وقتی طور پر خوشگوار ہوتی ہے۔ البتہ انگلستان میں حکومت موسسات دینی کے لیے سنگین مصارف نہیں برداشت کرتی۔ اسی طرح ذرائع نشر و انتشار پر کوئی پابندی نہیں لگاتی۔

طلاق مصنف نے ٹالسٹائی کا یہ قول نقل کیا ہے: کثرت طلاق کی ایک وجہ عورتوں کی حد سے بڑھتی ہوئی آزادی بھی ہے۔ آج یورپ میں بہت سے بالغ نظر ٹالسٹائی کے اس نظریہ سے متفق ہوں یہ بات مشکوک ہے۔ مصنف طبقاتی نابرابری کو ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن جہاں تک معلمات کا مسئلہ ہے وہ لندن کی حد تک درست نہیں ہے۔ ویسے اسپین و یورپ کے طرز زندگی میں کافی تفاوت ہے۔

اسی طرح مصنف نے تاریخی حقائق اور روشن دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ اسلامی سلطنتوں کا کارنامہ ہے کہ جنہوں نے علم و دانش کو زندہ رکھا ہے۔ اور اسلامی ممالک علم و دانش سے اس وقت مالا مال تھے جب مغربی لوگ نیم وحشی تھے۔ اسی طرح مصنف کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ بقول پروفیسر وسٹرمن افریقہ میں ہم لوگ کالوں کو نیم وحشی سمجھتے ہیں لیکن اسلام انکو برابری کا درجہ دیتا ہے اور ان کا احترام کرتا ہے۔ یہ سب صحیح ہے۔ مگر یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے کہ مسیحیت نے کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام ہی نہیں دیا۔ صرف مسلمانوں نے ہی دنیا کو روشنی دکھائی ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اگر ہم اسلامی تعلیم کی پیروی کرتے اور اسی طرح دنیا کے دیگر مذاہب کی بھی پیروی کرتے تو ہمارے معاشرہ کی دلفریبی کچھ اور ہی ہوتی۔ ہم اخلاقی قدروں سے محروم نہیں ہیں، البتہ مکمل اخلاقی قدروں پر عامل نہیں ہیں۔ جان ہملٹن۔

بہرحال قلم برداشتہ چند سطریں لکھ دی ہیں۔ غلطی سے صرف صاحبان عصمت ہی محفوظ ہیں۔ اس لیے اپنی ہر فروگذاشت پر محترم قارئین سے معذرت چاہتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ دامن عفو میں جگہ دینگے۔ اور مجھے مطلع بھی کر دینگے تاکہ آئندہ اصلاح کر لوں۔ فقط والسلام

روشن علی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرِ زندگی و تمدّنِ بشر

کرۂ زمین پر آغازِ آفرینش کے سلسلے میں جتنا جتنا تجربہ و تحقیق کا کارواں آگے بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی پیدائشِ زندگی کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی لئے یہ مسئلہ پُراسرار و پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ حالانکہ انسان کی پیدائش کی ابتداء کا زمانہ اس زمین پر کچھ بہت زیادہ نہیں گزرا بلکہ زمین کی عمر اور اس پر وجودِ حیات کے مقابلے میں اس کی مدّت کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی ماقبل تاریخ میں انسان پر کیا تغیّرات ہوئے، زندگی کی رنگ آمیزی کیونکر تھی یہ بات اب تک پردۂ خفا میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ماہرین آثارِ قدیمہ نے مٹّی کے قلب و جگر کو چاک کرکے ماضی کے انسانوں کی باقی ماندہ نشانیوں کا دقیق مطالعہ و تحقیق کرکے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ کچھ کم دلچسپ نہیں ہیں[1]۔

حجری زمانہ ماہرین نے اپنی تحقیقات کی بنیاد پر ماقبل تاریخ کے زمانوں کو مختلف دوروں پر تقسیم کیا ہے۔ حجری دور میں انسان اپنی بھوک مٹانے اور زندگی کو باقی رکھنے کیلئے لکڑی، پتھر جیسے سادہ ہتھیاروں سے شکار کیا کرتا تھا اور جانوروں سے خوفزدہ

---

[1] ماہرین آثارِ قدیمہ نے بتایا ہے کہ بشر پر مختلف دور گزر چکے ہیں اور ترقی یافتہ تمدن بھی تھا جو گزر چکا ہے۔ زمین کی گہرائیوں میں بڑی مشکل سے کچھ مبہم سے آثار ملتے ہیں۔ ممکن ہے جو دور ابھی باقی ہے اس کی ابتداء آدمؑ سے ہوئی ہو۔

بھی رہتا تھا۔ اسی لئے اپنی جان کی حفاظت کے لئے غاروں میں پناہ لینے پر مجبور تھا۔ اس زمانے کا انسان فضائی تغیّرات سے بہت ڈرتا تھا، تاریکی سے بہت زیادہ رنجیدہ ہوتا تھا، اپنی ساری توانائی صرف دشمن کو مغلوب کرنے میں صرف کرتا تھا۔ بالکل ابتدائی صورت میں پتھروں سے اور ہتھوڑوں سے نیزے کی اَنی بناتا تھا۔

انسان نے اسی زمانے میں آگ جلانا سیکھا، اسی آگ سے کھانا پکاتا تھا، تاریکی ظلمت کو دُور کرتا تھا، اسی حالت میں کئی قرن گزر گئے اور رفتہ رفتہ قدیم حجری زمانے کو پیچھے چھوڑ دیا جب انسان جدید حجری زمانے میں داخل ہوا تو اپنی زندگی کے مختلف طریقوں میں تبدیلی بھی لایا۔ لیکن پھر بھی وسائلِ زندگی کی تکمیل پتھروں ہی کے ذریعے کرتا رہا۔ بس فرق اتنا تھا کہ اب جو چیزیں بناتا تھا وہ صاف وشفّاف، مُنظّم، صیقل شدہ ہوتی تھیں۔

سنگ وچوب کے سابق تجربوں سے اپنے رہنے کے لئے مکان بنایا۔ گوندھی ہوئی مٹّی، آگ، سورج کی مدد سے مٹّی کے برتن بنائے۔ تھوڑا بہت کاشتکاری اور حیوانوں کے پالنے کا طریقہ دریافت کیا، یہی وہ زمانہ ہے جب بیج بونے، درخت لگانے، تیر وکمان سے بعض حیوانوں کو ہلاک کرنے، نیزے سے مچھلی کا شکار کرنے لگا۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ حجری دَور ختم ہوگیا۔ اور انسان نے اپنی پوری سرگزشت اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے بطور یادگار چھوڑی ——— اس کے بعد فلزّاتی دَور کا آغاز ہوا۔

دھاتوں کا زمانہ

فلزاتی دَور درحقیقت تمدّن کے شباب کا زمانہ تھا۔ انسانی زندگی کا دھارا بدل گیا تھا اور انسانی زندگی نئے مرحلے میں داخل ہوگئی تھی۔ اب انسان ایک ایسا بھوکا حیوان ——— جو ہمیشہ اپنی غذا کی بھاگ دوڑ میں مشغول ہو ——— نہیں رہا تھا۔ حوادثات اور گوناگوں واقعات سبب بنے کہ انسان اپنی شکم پروری کو چھوڑ کر اپنے آس پاس کی دنیا کی طرف بھی متوجّہ ہو، فطرت سے جنگ کرنے میں انسانی فتوحات کی تعداد جس قدر بڑھتی گئی اُسی نسبت سے انسانی ضرورتیں بھی

بڑھتی گئیں۔ مختصر یہ کہ جس مَوجُود نے بھی میدانِ بربریت میں سر بلند کیا اسی نے اپنے لئے ایسی راہ کا انتخاب کیا جس کا اختتام تمدّن پر ہوتا تھا۔ جو انسان جہل و نادانی میں گرفتار تھا وہ موفق ہوا کہ علم و دَانش کی طرف بڑھے۔

انسان کو جو چیز تمام حیوانوں سے جُدا کرتی ہے وہ ایک اندرُونی چیز ہے جس کو عقل و ادراک کہا جاتا ہے۔ اور جو موجودات میں بہترین چیز ہے۔ انسان کو خدا نے عقل دی اور اس کی طبیعت میں ایک ایسی قوّت ودیعت کر دی جو انسان کو نئی نئی راہوں کی تلاش و جستجو پر اُبھارتی رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جتنا جتنا آگے بڑھتا گیا اتنا ہی بیقراری، تجسّس، خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جس چیز نے تاریخ کو وجود بخشا اور انسان کی رفتارِ ترقی کو بدلا وہ یہی "عقل" ہے۔ خدا کے اسی عطیہ کے سہارے انسان چیزوں میں وقّتِ نظر سے کام لینے لگا اور غور و فکر کرنے لگا، تجربات کرنے لگا اور ان سے حاصل شدہ اطلّاعات کو قوّتِ حافظہ میں جمع کرتا رہا، اور نت نئے واقعات و حوادث میں اسی سے فائدہ حاصل کرتا رہا۔

حضرت عیسیٰ کی ولادت سے چار ہزار سال پہلے انسان نے تمدّن کے مختلف مَیدانوں میں قدم رکھا۔ الفبا، خط، تجارت اور دیگر تمدّن کے اہم عناصر کی بنیاد رکھی۔ اسی دَور میں پتھروں سے معماری کا کام شروع ہوا، وسائلِ زندگی کے آلات ایجاد کئے گئے، لوہے اور تانبے کا اِستعمال شروع ہوا۔ اسی دَور میں ایک بڑا دِین ظاہر ہوا حضرت ابراہیمؑ نے سرزمینِ بابل پر خدائے یگانہ کی توحید کا پرچم بلند کیا، اور خداوند عالم نے سرزمین بابل کے سرگشتہ معاشرے کی رہبری کا تاج حضرت ابراہیمؑ کے سر پر رکھا اور جناب ابراہیمؑ نے بھی محنت شاقہ برداشت کر کے ان کے غیر منطقی عقائد و افکار سے جنگ شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سربراہان افکارِ باطل حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے میں صَف بستہ ہو گئے۔ سب سے بڑا خطرہ ابراہیمی تبلیغ کو نمرُود کی ذات سے تھا۔ اس نے اپنی بھرپُور

طاقت وقوّت سے ابراہیمؑ کو کچل ڈالنا چاہا۔ لیکن ابراہیمؑ نے بھی خدا پرستی کی تبلیغ میں طاغوتی لشکروں سے ٹکرانے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس کی بلکہ اپنی ثابت قدمی سے نمرود کی اہرمنی طاقت کو پراگندہ کر دیا۔ اور طول طویل سفر کر کے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کی مدد سے سرزمینِ حجاز میں پہنچ کر خانۂ خدا کی بنیاد رکھی۔ فلزات کا دَور ختم ہوتے ہی ہم تاریخ کے پہلے مرحلے میں پہنچ جاتے ہیں۔

تاریخ کا پہلا دَور

حضرت عیسیٰؑ سے سات سو پچاس سال پہلے تک کے حوادث کو تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے۔ سلطنتِ رُوم کی تشکیل کے دو قرن گزرنے پائے تھے کہ ایران میں زردشت نے اپنے خود ساختہ عقائد و افکار کو نشر کرنا شروع کر دیا، اور ادھر لاؤتسے (LAO-TSE) اور کنفیوشس (CONFUCIUS) نے جاپان و چین میں، اور مہاتما بدھ نے ہندوستان میں بساطِ فلسفہ کی بنیاد ڈالی، ارسطو اور افلاطون کی یونان میں پرورش ہوئی۔ آخر کار جب رُوحِ مادیت لوگوں کی پوری زندگی میں زہر بن کر سرایت کر چکی تو خداوند عالم نے معاشرے کی اصلاح کے لئے حضرت عیسیٰؑ کو بھیجا تاکہ یہودی مادیت کے پھندے سے بشریت کو نجات دیں۔ آپ نے فساد و تباہی کو ختم کرنے اور تہذیب اخلاق کا پرچار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

تاریخ کا وسطی دَور

اس دَور کی اہم دَین "وسائل ارتباط، عمارتیں، صنعتیں، طبابت" ہیں۔ ۴۷۶ میلادی سے قرونِ وسطیٰ کے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دَور میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ قدرت روحانی کے علاوہ پورے معاشرے کے افکار و عقائد پر کلیسا کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ یورپ میں خونریزی، جہالت، پراگندگی، وحشی پن، اسی دَور کی دَین ہے۔ اسی دَور میں مشرق میں اسلامی تمدّن کی بنیاد پڑتی ہے (دوسرے حصّے میں ہم اس پر بحث کریں گے۔)

دَورِ تجدّد

استانبول میں سلطان محمد کے داخلے اور مشرقی روم کی حکومت کے خاتمے پر ۱۴۵۳ء سے دورِ تجدّد کی ابتدا ہوتی ہے۔ یورپ میں جرمنی، فرانس،

انگلستان کی بنیاد پڑتی ہے۔ قطب نما کی ایجاد کے سہارے اوقیانوس اطلس کو طے کر کے امریکہ کی دریافت ہوتی ہے۔ اس دور سے میں نہضت فکری و علمی، ملکوں کے درمیان روابط کی استواری ہوتی ہے۔ ۱۷۸۹ء کے دور میں فرانسیسی انقلاب کے بعد دُنیا "صنعتی دنیا" ہو گئی ایجادات، اختراعات کا سلسلہ بہت آگے بڑھ گیا۔ ہر چیز کا رنگ بدل گیا۔ مختصر یہ کہ اسی عظیم انقلاب کے بعد یورپی دنیا نے اپنی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

آج کا ترقی یافتہ مغربی تمدّن

آج جس دنیا کے دامنِ تربیت میں ہم پرورش پا رہے ہیں، اس نے قافلۂ انسانیت کو معاشی و اجتماعی ترقی کی راہ پر رواں دواں کر کے شگفت انگیز مرحلے میں پہنچا دیا ہے۔ آج کا انسان انقلابِ فکری کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ عظیم علمی قوتوں سے آراستہ ہو چکا ہے، ہر روز اپنے آفتابِ فکر کی شعاعوں سے مشکلات و ضروریاتِ زندگی کی تاریکیوں کو دور کر رہا ہے۔ کل انسان اپنی ناتوانی و بے مائیگی کی وجہ سے جن مشکلات سے دوچار تھا صنعتی و علمی ترقی نے ان کا زیادہ تر حصّہ ختم کر دیا ہے، کیونکہ علم و دانش کی ترقی نے انسان کی مشقّت کا زیادہ تر بوجھ صنعتی مشینوں کے کندھے پر ڈال دیا ہے اور خود انسان ہلکا پھلکا ہو کر لذّاتِ زندگی سے نفع اٹھا رہا ہے۔ اسی طرح عظیم و فوق العادۃ اکتشافات عالم کی دشواریوں پر عملی وسائل کے ذریعے بہت زیادہ قابو پا لیا ہے۔ روز بروز کاموں کی زیادتی نے زندگی کی مشین کو بہت زیادہ مشغول بنا دیا ہے۔ کل جب وقت کی کوئی قیمت نہ تھی اور چیز کو شب و روز کے پیمانے میں ناپا جاتا تھا۔ لیکن آج سکنڈ و منٹ سے پیمائش کی جاتی ہے اور قابلِ توجہ علمی امور بہت مختصر سی مدّت میں پورے ہو جاتے ہیں۔

برق و بخار کے ایجاد سے پہلے کشتیوں کا دار و مدار ہواؤں کے رحم و کرم پر تھا لیکن آج برق و بخار سے چلنے والی مشینوں کے طفیل اقیانوس انسان کے زیرِ تصرّف ہے۔ آج اسباب کے نقل و حمل اور مسافرت کے لئے چوپایوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ بڑی بڑی بسیں، تیز رفتار ریل گاڑیاں، کوہ پیکر ہوائی جہازوں نے اس مشکل کو آسان کر دیا ہے۔ دُور دراز کا سفر گھنٹوں

اور منٹوں میں انجام پانے لگا ہے۔ آج فکرِ بشر وسیع و عریض زمین ہی تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ آفاقِ زمین سے گزر کر تسخیر کرات میں مشغول ہے۔ آسمانوں کی بلندی، دریاؤں کی گہرائی، فکرِ بشر کی جولان گاہ بن گئی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب اس طویل و عریض دنیا کے بارے میں انسانی معلومات بہت ہی ناقص اور معمولی تھیں، لیکن آج اسی دنیا کے بارے میں انسانی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ فطرت کے انمول شہ پاروں میں ذوقِ جستجو نے قدرت علم و تحقیق کے سہارے، اور تجربہ گاہوں میں پے در پے تجربوں نے دنیا کی خوبصورتی اور لاتعداد موجودات کے چہرے سے نقاب کشائی کی ہے۔ علوم فطرت کے مطالعہ کے لئے لیبارٹریوں کو جدید وسائل سے آراستہ کیا گیا ہے۔ الکٹرونی ذرہ بینوں کے ذریعے کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اس سے ہزار گنا بڑا کر کے دیکھا جا سکتا ہے مختصر یہ کہ آج کی ترقی یافتہ مغربی دنیا نے بشریت کو جن ایجادات سے روشناس کرایا ہے وہ چشم پوشی کے قابل نہیں ہیں۔ ان کا بہرحال اعتراف کرنا پڑے گا۔ اور کوئی بھی شخص ان چیزوں کی اہمیت کا انکار نہیں کر سکتا۔

طبی نقطۂ نظر سے یہ ترقی قابلِ صد توجہ ہے۔ اس سے پہلے علم طب ضعف و ناتوانی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ بہت سی بیماریاں لاعلاج تھیں ان کی کوئی دوا ہی نہ تھی صحنِ عالم میں قدم رکھنے سے پہلے پہلے بچے مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ کچھ تو اس دنیا ہی سے راہی ملکِ عدم ہو جاتے تھے اور کچھ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کسی طرح زندگی کا کچھ حصہ پورا کرتے تھے۔ آج بھی دلوں میں اس قسم کے ہزاروں واقعات کی یادیں باقی ہیں۔

اس کرۂ خاکی پر جب سے انسان نے قدم رکھا ہے اسی وقت سے برابر انسانی زندگی تغیر و تحول کا شکار رہی ہے۔ اور یہ تغیر ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس زمانے میں انسان نے جو علمی و فنی اختراع کئے ہیں اس کی وجہ سے یہ زمانہ ایک خصوصی امتیاز کا حامل ہو گیا ہے اور اس زمانے کا نام عصر ترقی، عصر تکامل ہو گیا ہے۔ مگر ان تمام ایجادات کی فراوانی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی

چاہیئے کہ اس عالمِ رنگ و بُو کی کتابِ اسرار کے صرف حروفِ تہجی ہی کو علماءِ علمِ طبیعی پڑھ پائے ہیں ابھی تو کتابِ رازہائے قدرت کی بسم اللہ ہوئی ہے۔ اس کی انتہا تو بس خدا ہی کو معلوم ہے۔

مغربی تمدّن کی ترقی کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے کہنے دیجیئے کہ اس تمدّن میں بہت بڑی بڑی خامیاں باقی رہ گئی ہیں جن کی اہمیت و بزرگی مثبت پہلوؤں سے کسی طرح کم نہیں ہے علم و دانش نے معاشرے کے رفاہ عام اور آسائش کے جو وسائل پیدا کئے ہیں اور کتاب عمر میں جس نئی فصل کا دروازہ کھولا ہے اس کا ہم اعتراف کرتے ہوئے اور احترام کرتے ہوئے اتنا ضرور عرض کریں گے کہ بشریت کی سعادت و نیک بختی جن فضائل سے وابستہ تھی ان کا فقدان ہو گیا ہے اور یہ متمدن معاشرہ ان فضائل کے فقدان کی وجہ سے ذلّت و پستی کے گہرے کنویں میں گر پڑا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ صنعتوں میں مغرب اوجِ ترقی پر پہنچ گیا ہے اور اس سلسلے میں نمایاں ترقی بھی کی ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ انسان کی روحانیت صفر کے درجے کو پہنچ گئی ہے جس حساب سے علمی ایجاد نے ترقی کی ہے اسی نسبت سے افکار میں تنزّل ہوا ہے۔ کشمکش و اختلاف کے اسباب روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں۔

مغرب نے رُوحانی قدر و قیمت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ مغرب مشینوں کا غلام بن گیا ہے یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ واقعی راحت و آرام، سعادت و خوش بختی مشینی غلاموں کے حصّہ میں آئی ہے۔ عقل زندگی کو ایک نظام ضرور عطا کر سکتی ہے اور وہ نظام رفاہ عام کا سبب بھی بن سکتا ہے، مگر عقل سعادت و خوش بختی کو نہیں ایجاد کر سکتی کیونکہ یہ عقل کا کام نہیں ہے سعادت تو ایک چیز ہی دوسری ہے۔ عقل کا کام فائدہ مند، نقصان دہ، اچھے، بُرے میں تمیز کرنا نہیں ہے عقل تو صرف صحیح و غلط میں تمیز کر سکتی ہے۔ بشری نظامِ زندگی اگر تنہا عقل کا مرہُون ہو جائے تو پھر زندگی ایک دہکتا ہوا جہنّم بن جائے۔ اور بقول "برٹرانڈ راسل" (BERTRAND RUSSELL) اس قسم کے نظام سے مبارزہ واجب ہے۔

مغربی تمدّن جہاں بشریت کے لئے قیمتی تحائف لے کر آیا ہے اسی کے ساتھ ساتھ ایک

ایسا مہلک و بے مہار نظام بھی لایا ہے جو اپنے دامن میں ہزاروں ہولناک جرائم و مفاسد لئے ہوئے ہے۔ بے لگام خواہشاتِ نفس نے روح کے تار و پود بکھیر دئے ہیں، لوگوں سے آسائشِ فکری و روحی اور اطمینانِ قلب چھین لیا ہے۔ مغربی تمدّن میں علم نے حیاتِ معنوی کے محیط میں کوئی چراغ روشن کرنے کے بجائے اس کی تیرگی و تاریکی کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔

یہ علمی کامیابی و برتری بھی، جنگی کامیابی و برتری کی طرح اپنے دامن میں مصائب، آلام نفوس، خسارے، ناقابلِ اصلاح بدبختیاں لے کر آئی۔ اس باغِ تمدّن میں جو پھول کھلتا ہے وہ اپنے پہلو میں جان لیوا کانٹے بھی رکھتا ہے۔ موٹر گاڑیاں، ہوائی جہاز، کارخانے، آلاتِ جرّاحی، اسبابِ تعیش، زندگی کی سہولتیں بیشک آج کے مغرب کے بہترین تحائف ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ایٹم بم، برباد کرنے والے اسلحے، ہلاک کرنے والے گاز، جٹ طیارے، راکٹ، اشعۂ موت، جناتیوں کی وسعت کاریاں، اخلاقی بے راہ روی بھی یہی تمدّن مغرب بشریت کے سر پر لادنے والا ہے۔

اس تمدّن کی دنیا میں عقل کا کام صرف منافع حاصل کرنا ہے۔ مادی چیزوں کے علاوہ گویا عقل کسی اور چیز کا ادراک ہی نہیں کر پاتی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلتوں کا فقدان ہو گیا، بہت سے اخلاقی مفہوم موت کے ہاتھوں سپردِ خاک ہو گئے اور یہ ایسا زخم ہے جس کا اندمال ناممکن ہے۔ اگرچہ ہماری زندگی علمی فعالیت و میدان سعی و کوشش سے دُور ہو گئی ہے لیکن تعلیم و تربیت، اجتماع، مظاہر تمدّن کا دور دورہ ہے۔ مظاہر تمدّن کا سیلاب بڑی شدّت کے ساتھ روان دواں ہے کیونکہ ممالکِ اسلامی کی سرحدیں بطورِ کلّی خارجی افکار و اخلاق کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ ان کی عادتیں، رسومات ہمارے معاشرے کو متاثر کر رہی ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ دانش و افکارِ صحیح بھی اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہیں لیکن روحی و اخلاقی مفاسد، نفسیاتی خواہشات، سرکش فطرت اپنے اثرات بہت جلد اور گہرے ڈالتی ہیں، اسی لئے ہماری علمی پیش رفت، صنعتی اجتماع مغربی ملکوں کے پاسنگ بھی نہیں ہے لیکن مفاسد کے کامل ترین نمونے، بے راہ روی

وغیرہ مغرب کے زہریلے اثرات کثرت سے موجود ہیں کیسی بھی معاشرے کی اخلاقی پستی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد اچھائی و برائی میں فرق نہ کر سکیں، ایسا معاشرہ کبھی بھی خوش بختی سے دوچار نہیں ہو سکتا۔

سب سے زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ کچھ لوگ اس متمدن دنیا کی ظاہری چیزوں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور اس کے اخلاقی بحران، دردناک مصائب کو بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں آج کی متمدن دنیا اپنی سطحی زیبائش کو اس خوبصورتی سے پیش کرتی ہے کہ اس قسم کے افراد جب اس کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں تو ان میں قوتِ تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔ حد یہ ہے کہ غلط حرکتوں اور بری عادتوں کو بھی اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اس زرق برق اور پرشکوہ زیبائش دنیا میں اپنے کو اتنا گم کر لیتے ہیں کہ مغربی آداب و رسوم سے معمولی سے اختلاف کو بھی بہت بڑا نقص اور عیب سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اس کمی کو اپنے لئے باعثِ ننگ و عار سمجھنے لگتے ہیں۔ اور یہ بات استقلالِ فکری کے فقدان کی دلیل ہے اور مذہبی و دینی معلومات سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور چونکہ ان لوگوں میں مذہبی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے نہ تو قدرتِ مطالعہ ہے اور نہ یہ تجزیہ و تحلیل کر کے اچھائی و برائی کو سمجھ سکتے ہیں اس لئے بہت سے مذہبی حقائق کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔

البتہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یورپ کی مختلف قومیں اپنے آداب و رسوم، دین و مذہب کو چھوڑے بغیر اس خیرہ کن تمدن سے فیض یاب ہو رہی ہیں (مثلاً) جاپان نے اپنے مذہب، رسومات، خصوصیات کو چھوڑے بغیر برق رفتاری کے ساتھ تمدن کی طرف پرواز کیا اور اتنی ترقی کی کہ آج ترقی یافتہ ممالک میں اس کا شمار ہونے لگا ہے۔ جاپان تنہا وہ ملک ہے کہ جس نے ساٹھ سال کی مدت میں پسماندہ ممالک کے دائرے سے نکل کر دنیا کے متمدن ترین ملکوں میں اپنا شمار کرایا اور اپنا لوہا منوا لیا، جاپان مغرب زدہ نہیں ہوا، اس نے یورپ کی اندھی تقلید نہیں کی، بلکہ رسوم و قومیت، دین و مذہب کے بقاء کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی پیروی میں ضرورت سے زیادہ متعصب رہا، صدیوں پہلے جو دین و مذہب تھا وہی اب بھی ہے جاپان میں

بودھ مذہب، اور شنٹو (SHINTO) کا احترام آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا حالانکہ یہ مذاہب ایسے ہیں جن کی رکاکت سے ہر عقل مند واقف ہے ـــــ لیکن یہ ہمارے (بزعم خود) روشن فکر حضرات ـــ جو تحلیل و تجزیہ کے ذریعے روشن ترین اجتماعی مسئلے اور واضح ترین مذہبی دستور کو بھی نہیں سمجھ سکتے اور نہ جن کے پاس فکر و شعور ہے ـــ لچر سے لچر مذہب پر ہونے والے اعتراضات کو بڑی خوشی و فخر کے ساتھ محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ "ہم آزاد خیال ہیں" قبول کر لیتے ہیں۔

یہ غفلت کا مارا گروہ حقائقِ امور اور واقعاتِ زندگی کو آزادی کے ساتھ سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ ہی تلاش و جستجو کر کے حقیقت تک پہنچ سکتا ہے! ایک نکتہ جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ مادی زندگی کے مختلف اطوار اور بہترین قسم کے تغیرات جو بشری زندگی میں ظاہر ہوئے ہیں اور جنہوں نے فکر انسانی میں وسعت بخشی ہے وہ ان دانش مندوں کے سعی پیہم و محنت و مشقت کا نتیجہ ہے جو تجربہ گاہوں کے گوشوں میں بیٹھ کر علمی جہاد کرتے ہیں اور اپنے علم کے زور سے فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی زندگی کی کامیابی تلاشِ مسلسل میں مضمر ہے۔ نہ یہ کہ ہوس بازی، کھلم کھلا آوارہ گردی، بے راہ روی کی وجہ سے صنعت و اختراعات میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے! علومِ مادی و معنوی میں تکامل ایک ہی جہت سے ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ دو مختلف جہتوں کی وجہ سے ممکن ہے۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ ایک جہت کی ترقی دوسری جہت کی تنزلی کے ہمراہ ہو (اس لئے اگر واقعی تکامل مادی و معنوی مقصود ہے تو دنیاوی ترقی کے ساتھ مذہبی ترقی بھی ضروری ہے)

تہران میں کچھ دنوں قبل ہونے والی علمی کانفرنس میں یورپ کے ایک مشہور استاد نے اپنے دورانِ تقریر یہ فرمایا: مغرب معنویات کے سلسلے میں مشرق کا محتاج ہے۔ مشرقی معنویات مغرب کے بہ نسبت کہیں زیادہ پُر مایہ ہیں، اگر مشرق علوم و صنعت میں مغرب سے استفادہ کرتا ہے تو مغرب کو معنویات میں مشرق سے استفادہ کرنا چاہئے۔

انسانی معاشرہ زندگی کی ٹیکنک و صنعت کے علاوہ کچھ دوسری چیزوں کا بھی محتاج ہے

اگر بشری معاشرے کے سیاسی و اجتماعی اسباب انسانی معاشرے کو زندگی کے اصلی فلسفے سے الگ کردیں، اور زندگی کو مشترک ارمانوں سے عاری کر کے ہمیشہ تلاش معاش کا ذریعہ بنادیں تو جامعہ بشری پر ایک سختی و ظلم کی حکمرانی ہو جائے گی۔

دنیائے بشریت ابھی اپنے دورِ طفولیت سے نہیں گزر سکی اور نہ ابھی بلوغ و رشد کی ان منزلوں تک پہنچ سکی ہے کہ قلبِ فطرت میں چھپے ہوئے بیش قیمت ذخائر سے استفادہ کر سکے، اور اسی لئے بچوں کی طرح کودکانہ احساس کی بنا پر بیشتر انسانی زندگی میں تحت تاثیر ہے۔ عقل و منطق کی جگہ تعصب و احساسات نے لے رکھی ہے، ابھی تک عقل و روحِ بشریت اپنے کو اوہام کی قید و بند اور خرافات کے چنگل سے نہیں نکال سکی۔ چاہے وہ اوہام و خرافات بتوں کی پرستش کی صورت میں ظاہر ہوں، یا متمدن و ترقی یافتہ قوموں کی کورانہ تقلید میں علوم مادی کی پرستش کے عنوان پر ظاہر ہوں۔ ان تمام ناخوشگوار تجربات اور جدید انحرافات کے مشاہدے کے بعد بشریت کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ یا صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے اور یا پھر نیست و نابود ہو جائے۔ مشہور جامعہ شناس پٹری اے سوروکین (PITIRI-A-SOROKIN) کہتا ہے: زندگی کا ہر اہم ترین پہلو، سازمان، تمدن معاشرہ غربی غیر عادی بحران میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اس تمدن کے جسم و روح دونوں سخت بیمار ہیں۔ بڑی مشکل سے مغربی تمدن کے پیکر میں ایسا نقطہ تلاش کیا جا سکتا ہے جو مجروح نہ ہو یا ایسے رگ پٹھے تلاش کئے جا سکتے ہیں جو اپنا وظیفہ صحیح طریقے سے انجام دے رہے ہوں! ہم واضح طور سے دو زمانوں کے مابین برزخ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گذشتہ کل کے جاں بلب پر شکوہ مادی زمانے کی انتہا اور آنے والے کل کے معنوی تمدن کے طلوع کے درمیان ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گذشتہ کل کی تابندگی جو چھ قرنوں تک روشن رہی، ابھی اس کی لرزاں لو اور کل کے شام کا ڈوبتا ہوا سورج ابھی تک ٹمٹما رہا ہے مگر اب یہ روشنی درخشاں ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے فروغ کی امید نہیں رہی ہے۔ غروب ہونے کے ساتھ اس کے تیرگی کا سایہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ رہروانِ منزل کا منزل تک پہنچنا دشوار سے دشوار تر ہو جائے گا۔ برزخ مدنی

کی شب یلدا اپنی تمام بیماریوں کے ساتھ، اپنے تاریک سایوں کے ساتھ، اپنے تمام خوف و ہراس، دہشت و دل آزاری کے ساتھ ہمارے سامنے آرہی ہے۔

اِن تمام اوصاف کے باوجود اس شبِ ہول انگیز کی صبح صادق، ایک فرہنگ جامع و غنوی کے ساتھ آنے والے انسان کے خیر مقدم کے لئے منتظر ہے۔[1]

دوسروں کے آداب و رسوم، تشکیلات و وضع کو آنکھ بند کر کے قبول کر لینا بالکل خلافِ عقل بات ہے۔ مقلّد جب تک اندھی تقلید کرے گا، زنجیرِ اطاعت کو گردن میں ڈالے رہے گا۔ جس طرح تقلید مخرّب استقلال و طفیلی گری ہے اسی طرح ابتکار سرچشمۂ استقلال ہے۔ ہاں اخذ و اقتباس اگر معقول صورت سے ہو تو وہ بھی قابلِ تعریف ہے جیسے کوئی انسان ایک ہاتھ میں کوئی چیز لے اور دوسرے ہاتھ سے اسی چیز کی ترمیم و اصلاح کر کے دنیائے علم و صنعت کے سامنے پیش کرے تو یہ بات قابلِ تعریف ہے (اخذ و اقتباس سے یہی مُراد ہے اندھی تقلید مُراد نہیں ہے) ہمارے افکار و اخلاق میں جو ہرج مرج ہوتا ہے وہ بجھے اور تقلیدی افکار کے مخلوط ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے اخلاقی و تاریخی حالات سے بے خبر ہو کر مغرب کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک عظیم اسلامی مفکر کہتا ہے: ہم یہ کبھی نہیں جانتے کہ عزلت فکری و اجتماعی اختیار کر لی جائے اور تمدن کی رفتار جو تاریخ کو قہری طور پر آگے بڑھا رہی ہے اس سے گوشہ نشینی اختیار کر لی جائے، نہیں نہیں ہم تو اس کارواں کے برابر کے شریک و سہیم ہیں بلکہ ہم مسلمان تو وہ ہیں جنھوں نے معاشرۂ انسانی کو عظیم سرمایہ بخشا ہے۔ ہماری ہی محنت اور ہمارے ہی اقدامات سے اس ترقی یافتہ تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ لیکن افسوس آج ہماری نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہم نے اپنی ارزش اور اپنا احترام اپنے ہی ہاتھوں کھو دیا ہے۔ جس دن ہم کو اس کا احساس ہو جائے گا اسی دن غلامی و استعمار سے ہمارے افکار، ہمارے قلوب آزاد ہو جائیں گے

---

[1] خداوند دو کعبہ۔ ص ۱۹

آزاد خیال افراد کی طرح ہمارے افکار بھی پاک و بلند ہو جائیں گے۔ لیکن ہم تو فریاد اسی گداگری کی رسوائی سے کرتے ہیں کہ جس کی بنا پر آج ہم غلاموں کی طرح سینہ پر ہاتھ رکھے ان کے سامنے کھڑے ہیں اور اس عاریتی متاع کو اس کے مالک کو واپس نہیں کرتے کاش ہم ایسا کرتے کہ وہ لوگ ہمارے تابع ہوتے۔!

یہاں تمدّن کے دو معنی ہیں۔ (۱) تمدّن کی بنیان گذاری میں اپنا اہم حصّہ ہاتھوں سے نہ جانے دیں اور اس پائدار روش حیاتی و ذاتی کو جو ہماری زندگی کی جڑوں سے پھوٹتی ہے انسانی تجربات کا سہارا لے کر فروغ اور تطبیقات زندگی میں محفوظ کر لیں۔ (۲) دوسروں کے فریبندہ تمدن کے ظواہر "جن کو انھوں نے اپنے لئے آمادہ و حاضر کیا ہے اور جن کے معین مشخصات ہیں" ہم اپنی زندگی کے لئے منتخب کر لیں بغیر اس کے کہ ہم اس کا مطالعہ کریں یا اپنے تمدّن کو اس میں دخیل کریں۔ تمدّن کے پہلے معنی وہ ہیں جو انسانیت کے بلند افکار سے ہم آہنگ ہیں لیکن تمدّن کے دوسرے معنی مقلّد بندروں کے لئے درخورا متنا ہوں تو ہوں انسانوں کے لئے بہرحال نہیں ہیں[1]۔

اگرچہ متمدّن قوموں کے اندر رُوحِ مادیت حدِ افراط تک پہنچ چکی ہے اور عملاً ایک یورپی کا مقصدِ زندگی "صرف زندگی بسر کر لینا" کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ اپنے دینی معتقدات کے بھی پابند ہیں اور اپنے مذہب سے ایک مخصوص تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ ایسا مذہب جو تحریف شدہ ہے اور جس میں مختلف خرافات کی آمیزش ہے۔ اور جس مذہب میں اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے کہ لوگوں کے معنوی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی مذہب کے پابند ہیں اور تعجّب ہے کہ ایسا دین ترقی یافتہ دنیا پر حکومت کرے اور مغربی تمدّن کے روحی و معنوی حدود کو متعیّن کرے۔

یکشنبہ کے دن تمام دوکانیں، ادارے بند رہتے ہیں اور ہر طرف سے کلیسا کے ناقوسوں کی مخصوص آواز کانوں سے ٹکراتی رہتی ہے کلیساؤں میں مختلف طبقے کے لوگ نہایت متانت سے

---

[1] اسلام و دیگراں۔ ص ۴۲

پادری کے کلام کو سنتے رہتے ہیں۔ ٹیلی وژنوں سے مخصوص مذہبی پروگرام کلیسا کی نگرانی میں لوگوں کے لئے نشر کئے جاتے ہیں۔ دین و مذہب سے لگاؤ رکھنے والے لوگ اپنے نومولود بچے کو فوراً کلیسا لے جاتے ہیں اور پادری کے ہاتھوں نام گزاری کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ بچے کے کان میں مذہبی دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ پادریوں کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا ہے، ان کو معاشرے کا روحانی باپ کہا جاتا ہے۔ کلیسا کے مذہبی سنگین اخراجات کے لئے حکومت لوگوں سے ٹیکس وصول کر کے کلیسا کے سپرد کر دیتی ہے اور لوگ یہ دینی ٹیکس دینے پر خواہ مخواہ مجبور ہیں۔ اس طرح دستگاہ کلیسا کے مصارف پورے ہوتے رہتے ہیں۔

"مطبوعات کمیٹی" کے نام سے ایک کمیٹی ہے جس کی سربراہی کلیسا کرتا ہے اور تحتانیہ وفوقانیہ کے سارے تعلیمی پروگرام کلیسا ہی کے زیر نگرانی انجام پاتے ہیں۔ مدارس کے نویں درجے تک طلاب ہر اتوار کو کلیسا جانے پر مجبور ہیں اور اس پروگرام میں جو خاص کر انھیں کے لئے ترتیب دیا جاتا ہے اور ان کے دینی تعلیم میں شمار ہے" شریک ہونے پر بھی مجبور ہیں۔ اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ معصوم بچوں کا گنہگاروں کی مخصوص جگہ پر جانا اور پادری کے سامنے اقرار گناہ کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح فلمیں بھی کمیٹی سے پاس ہونے کے بعد ہی منظر عام پر لائی جا سکتی ہیں۔ اس کمیٹی کے افراد میں کلیسا کے پادری، اطباء، ماہرین معاشیات، ماہرین اقتصادیات، روان شناسوں کا وجود ضروری ہے۔ مذہبی، روحی، اقتصادی، اجتماعی لحاظ سے جب چھان بین کر لی جاتی ہے تب کہیں اس کے نمائش کی اجازت دی جاتی ہے۔

جرمنی میں کیتھولک مذہب کے ایک اسپتال میں اتفاق سے مریض کی حیثیت سے میرا بھی داخلہ ہوا اور ایک اسلامی عالم ہونے کے ناطے میری طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی (وہاں میں نے دیکھا کہ) ہر وارڈ میں حضرت عیسیٰ کا ایک مجسمہ نصب ہے۔ روزآنہ شام کو تعطیل کے وقت وہاں پر بیماروں کے شفا کے لئے دعا کی جاتی ہے۔ ایک دن اسپتال کے ہال میں میں نے خود

دیکھا کہ حضرت علیؑ کے مجسّمے کے پاس لوگ شمع جلا رہے ہیں، ذرا یہاں ٹھہر کر سوچئے! مرکزِ علم و دانش میں دن کے وقت مجسّمے کے پاس شمع جلانا معیوب نہیں ہے لیکن ہمارے یہاں عام آدمی اگر رات کی تاریکی میں امام زادوں کی قبر پر شمع جلائے تو لوگ اس کا کس قدر مذاق اُڑاتے ہیں اس کو دقیانوسی، ارتجاعی نہ معلوم کس کس لقب سے نوازتے ہیں وہ لوگ دوسروں کے عقائد کا لحاظ کرتے ہیں اور ہمارے نوجوان اپنے ہی عقائد کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

احترام کا اندازہ آپ اس واقعے سے کیجئے کہ ایک مرتبہ مجھے خون کی ضرورت ہوئی تو سول سرجن نے مجھ سے آکر پوچھا، اسلام کس قسم کے خون کو جائز سمجھتا ہے؟ مثلاً کیا مسلمان کے جسم میں غیر مسلمان کا خون چڑھایا جا سکتا ہے۔؟ بہرحال اسلام جیسا کہتا ہو اسی حساب سے ہم آپ کے لئے خون مہیّا کریں گے۔!

ترقی سے ترقی یافتہ اجتماع میں بھی وہ لوگ اپنی آزادی کی ایک حد معیّن کئے ہوئے ہیں۔ وسائل تمدّن و زندگی سے کبھی سوء استفادہ نہیں کرتے۔ مثلاً ٹیلی ویژن پر ورزشی مقابلے، درسی کلاس، دُور دراز ملکوں کے لوگوں کی طرز زندگی وغیرہ کی نمائش کرتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ پروگرام کا زیادہ حصّہ لوگوں کے عام معلومات میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ شخصی آزادی کی بنا پر کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسروں کے سکون کو غارت کر دے۔ مثلاً ریڈیو اتنی زور سے نہیں کھول سکتے جس سے مسافر یا پڑوس والوں کو زحمت کا سامنا کرنا پڑے۔ کسی مالک مکان کو یہ حق نہیں ہے کہ رات کی خصوصی نشستوں کو اتنا طول دے دے جس سے پڑوسیوں کو زحمت ہونے لگے۔ شہر کے کسی بھی حصّے سے ریڈیو کی آواز آپ کے کانوں تک نہیں پہنچے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن جب ہوٹل میں میرا قیام تھا اسی کے قریب ناگہانی طور پر ریڈیو کی آواز آنے لگی، یہ پہلی مرتبہ میرے کانوں میں ریڈیو کی آواز آئی تھی اور وہ بھی ایرانی موسیقی! چونکہ میرے لئے یہ بالکل نئی بات تھی اس لئے میں اس فکر میں رہا کہ کسی فرصت کے وقت اس معاملے کی تحقیق کروں گا۔ اتفاقاً ایک دن کے بعد انھیں اطراف میں رہنے والے ایک ایرانی میری ملاقات کو آئے

میں نے بھی فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے اُن کے سامنے اس واقعہ کو بیان کیا۔ آپ کو تعجّب ہوگا کہ میرے ہموطن نے کچھ دیر خاموش رہ کر چہرے پر شرمندگی کے آثار نمایاں کرتے ہوئے زیرِ لب تبسّم کرتے ہوئے فرمایا، بھائی یہ غلطی مجھ ہی سے ہوگئی تھی!

اب آپ سوچئے کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں ان جدید وسائلِ زندگی کا استعمال کتنا غلط طریقے سے ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژنوں سے جن مناظر کو دکھایا جاتا ہے وہ معاشرے کے اخلاق کو کتنا خراب کرنے والے ہیں۔ اس بات کو آپ خود بھی جانتے ہیں (عیاں راچہ بیاں) آپ کو ماننا پڑے گا کہ دیکھنے والوں کے اخلاق، ان کی رُوحانیت کس قعرِ ذلّت میں پہنچے گی۔؟

ہمارے یہاں جدھر دیکھو ریڈیو کی آواز آتی رہے گی، اور نہ صرف یہ کہ آتی رہیگی بلکہ اس انداز سے آئے گی کہ جس سے انسان کے اعصاب کیا رُوح تک لرز اٹھتی ہے۔

اِس قسم کے آلات کے ایجاد کرنے والوں نے اِن آلات سے فائدہ اٹھانے کی کوئی شرط نہیں رکھی، اور نہ کوئی شرط رکھی جاتی ہے۔ ان کے خواب وخیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ یہ چیزیں ایسے گروہ (جیسے ہمارے یہاں) کے ہاتھ میں پہنچیں گی جس سے وہ لوگوں کو ایذاء وتکلیف پہنچاتے رہیں گے۔

بلا اِستثناء تمام ایجادات، اخباری ذرائع، علمی آلات کا یہی حشر ہے۔ سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان چیزوں سے استفادہ مخصوص تربیت کے بعد ہونا چاہئے کیونکہ زیادہ تر لوگ بے منطق اور بہت سی چیزوں کے بارے میں غلط طرزِ فکر بلکہ ظالمانہ روش رکھتے ہیں۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ اس قسم کی غلط بات وبائی بیماری کی طرح بہت جلد لوگوں کے مزاجوں میں سرائیت کر جاتی ہے۔ اور لوگ بھی غلط طریقے سے استفادہ کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کے بہ نسبت لوگوں کو یہ زیادہ تکلیف پہنچائے۔

مادی زندگی کے کامل وسائل سے استفادہ کرنے کا ہمارا یہ طریقہ ہوگیا ہے۔
مجھے کہنے دیجئے کہ اس سے زیادہ اندھاپن اور بے عقلی کی بات اور کیا ہوگی ؟ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ معیوب نہیں ہے کہ انسانیت کے آداب و رسوم سے اتنا بے بہرہ ہو جائے؟ اور اپنی آزادی کے لئے کوئی حد معین نہ کرے؟ بے لگامی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے جس کو ہمارے ملک میں "شخصی آزادی" کا نام دیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یورپ کی زندگی نقائص سے خالی ہے بلکہ اس کے نقائص تو بہت زیادہ ہیں جیسا کہ ہم اس کے بعد تفصیلاً بیان کریں گے۔ مگر یورپ والے کم از کم ان باتوں کا تو لحاظ رکھتے ہیں۔

عیسائیت کے اسبابِ ترقّی

اِس زمانے میں موجودہ مذاہب "خواہ آسمانی ہوں یا غیر آسمانی" مختلف تحریفات اور تغیّرات کی وجہ سے اپنے اندر ترقی کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بلکہ روز بروز رُو بہ تنزّل و انحطاط ہیں۔ صرف عیسائیت ایک ایسا مذہب ہے جو ساری دنیا میں قابلِ توجہ کوششوں کی حامل ہے۔ اس لحاظ سے ساری دنیا میں صرف اسلام اور عیسائیت ہی ایک دوسرے کے مقابل قرار دئے جا سکتے ہیں۔ عیسائیت کی ترقی کسی مخصوص علّت کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ مختلف عوامل کی بنا پر آئین مسیح ایک حسّاس موقعیت کا حامل ہوگیا ہے۔ دائرہ تبلیغ کی وسعت کسی بھی مذہب کی ترقی کی ضامن ہے۔ تبلیغ کے ذریعے معاشرے کے افکار کو مُتاثّر کر کے ایک مُعیّن ہدف کی طرف اس کو مائل کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسان فطرتاً تبلیغ سے متاثّر ہوتا ہے۔ انسان کی روح و زندگی میں تبلیغ کا گہرا اثر ہوتا ہے۔

قرونِ اخیرہ میں نہضت علمی و اجتماعی میں یہ مسئلہ ایک اہم صورت اختیار کر گیا ہے۔ مسیحیت نے مذہبی مقامات کی طرف تمام ساز و سامان عظیم تبلیغ کے ذریعے یہ کوشش کی کہ مسیحیت دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل جائے ایک طرف تو مذہبی تبلیغات کے لئے ساری توانائیاں خرچ کی جا رہی تھیں۔ اور دوسری طرف لوگ ضرورت سے زیادہ مادیات میں دل چسپی لینے کی وجہ سے اپنی شعاعِ فکر اور قوت تعمق کو امورِ معنوی میں صرف کرنے سے کترانے لگے تھے۔ مادیات کے ظواہر کی دل بستگی نے تاریک و سیاہ پردے لوگوں کے افکار پر ڈال رکھے تھے۔ اور لوگوں کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ حقیقت کی جستجو کریں

اور رُوحانیت کے مسائل میں غور و فکر کر سکیں اور مزید برآں ہماری تبلیغی کوششیں ناہونے کے برابر تھیں، ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت نے ترقی کی اور اسلام گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں ہم ترقی یافتہ دنیا کے سامنے اسلام کی مقدس تعلیم اور اس کا درخشاں چہرہ پیش نہیں کر سکتے اور نہ اسلام کے خصوصی امتیازات کو کماحقہٗ واضح کر سکتے ہیں۔ یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر عیسائیت بہت آگے بڑھ گئی ہے اور خلاف منطق و عقل قسم کے اعتقادات کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ مغربی ملتوں کے روح کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ صدیاں گزر گئیں کہ مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے نشر و اشاعت کے سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر کوشش نہیں کی گئی۔ اور قرونِ اولیٰ میں جو نہضت و کوشش مسلمانوں کی طرف سے کی گئی تھی وہ ذمہ داران و بادشاہانِ اسلام کی عدم توجہ کی وجہ سے رفتہ رفتہ ختم ہوگئی اور جبھی سے اسلام میں گہرا شگاف پڑ گیا۔ مسلسل سیاسی شکستوں کی وجہ سے مسلمانوں کی جہانبانی کی قدرت بھی ختم ہوگئی اور باقی ماندہ اسلامی اتحاد مغرب کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

کلیسا کے جرائم

چونکہ عیسائیت کے پاس معاشرے کی تربیت و ادارت کے لئے کوئی اصول و قوانین اور نہ ہی کوئی خاص سسٹم تھا، اس لحاظ سے یہ لوگ محروم و فقیر تھے اور یہی وجہ ہے کہ مذہبی رہنما کبھی بھی سیاسی، اجتماعی، اور حکومت کے مسائل میں دخل نہیں دیتے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی تک یہی صورت برقرار تھی لیکن ۷۵۶ء میں قیصر نے جب اپنے اختیارات کا کچھ حصّہ پوپ کے حوالے کر دیا تو اسی وقت سے پادریوں کی سلطنت و حکومت، رعب و جلال کا دور شروع ہوا۔ اور ان کی مذہبی دستگاہ بھی مالی و اقتصادی لحاظ سے قوی و مضبوط ہوئی اور پھر ارباب مذہب و سیاست میں اختلاف کا ہونا امر ناگزیر ہو گیا۔ اور بادشاہوں اور پادریوں کے درمیان ٹھن گئی۔

اب جو لوگ روحانیتِ مسیح کا مظہر کلیسا کو سمجھتے تھے وہ پادریوں کے ہوا خواہ ہو گئے اور ان کی پشت پناہی کرنے لگے (اور ایسے لوگ زیادہ تھے) نتیجہ یہ ہوا کہ دن بدن دستگاہ کلیسا کا اثر و نفوذ بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ کلیسا بلا شرکت غیرے مردمان یورپ پر مطلق العنان حاکم بن گیا۔

نصرانیت کے مذہبی وسیع اختلافات سے پہلے ہر مسیحی شہر پر ایک اسقف (پادری) حکومت کرتا تھا۔ اور چند شہروں کے اجتماع کا نام ولایت ہوتا تھا اور اس کا عہدے دار خلیفہ کہلاتا تھا اور ریاست نصرانیت کا سب سے بڑا حاکم پوپ ہوتا تھا۔ تمام مذہبی امور میں اسی کو دخل کلّی ہوتا تھا۔ اسقفوں اور خلفاء کا عزل و نصب بھی اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ

قسطنطنیہ کے مسیحی خلفاء یہ سوچنے لگے کہ پوپ کے اثر و نفوذ سے اپنے کو الگ کرلیں اور اپنے لئے ایک مستقل حوزہ بنالیں۔

خلفاء قسطنطنیہ اور پوپ کے درمیان چند شدید اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۰۵۲ء میں ان کے درمیان اختلاف کلّی ہو گیا اور اس طرح مسیحیت دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ مشرقی یورپ قسطنطنیہ کی روحانیت کا تابع ہو گیا اور اپنے کو آرتھوڈوکس (ORTHODOX) کہلانے لگا۔ اور مغربی یورپ لہستان سے لے کر اسپین تک پوپ ہی کی اطاعت میں باقی رہا اور یہ لوگ اپنے کو کیتھولک (CATHOLIC) کہلانے لگے۔ یہ دونوں مذہب جو آپس میں کلّی اختلاف رکھتے تھے ایک دوسرے کے کفر کا فتویٰ دینے لگے۔ سولھویں صدی کے اوائل میں پروٹیسٹنٹ (PROTESTANT) نامی ایک مزید مذہب پیدا ہوا۔ اس مذہب کے بانی لوتھر اور اس کے رفقاء کار نے جنّت فروشی اور بخشش گناہ جیسے مسائل پر پوپ کی مخالفت کا پرچم بلند کر دیا۔ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ کلیسا کو تمام بُرائیوں سے پاک کیا جائے۔ لوتھر کے طرف داروں کی کثرت ہو گئی اور ان تمام انقلابات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت مسیح کا سیدھا سادا مذہب تین مختلف شعبوں میں بٹ گیا۔

پوپ کی تمام تر قوّت و قدرت کے باوجود بارھویں تیرھویں صدی میں یورپ کے عیسائیوں میں بدعتوں کا دور دورہ ہو گیا اور ایسی عقائدی ترقیاں جو پوپ کی نظر میں مَردُود تھیں وہ پوپ اور کاتولیکیوں کے لئے باعثِ تشویش ہو گئیں۔ نتیجتاً ۱۲۱۵ء میں ان کے بدعتوں کو روکنے کے لئے پوپ کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا اور اس فرمان کے بموجب فرانس، اٹلی، اسپین، جرمنی، لہستان اور دیگر مسیحی ملکوں کے ہر شہر میں ایک ادارہ بنام "انگیزیسیوں" قائم کیا گیا جس میں متہم افراد کو بلوا کر اُن پر مقدّمہ چلا کے سزا دی جاتی تھی۔

یہ ادارہ اور اس کے لعنتی افراد اپنی اہرمنی قدرت کے زعم میں ہر قسم کی آزاد خیالی پر پابندی لگاتے تھے، انھوں نے رائے عامہ میں اتنا اضطراب پیدا کر دیا تھا کہ اگر کوئی متہم ہو جاتے

کہ اس کے عقائد کلیسا کے انکار و عقائد کے خلاف ہیں تو جہنّمی شکنجوں میں اُس کو کس دیا جاتا تھا۔ حد یہ ہو گئی تھی کہ اگر کبھی مُردہ لوگوں پر بھی کفر و الحاد کا اتہام لگا دیا جاتا تھا تو مخصوص طریقے سے ان کی ہڈیوں کے صندوق پر محاکمہ کیا جاتا تھا" ویل ڈورانٹ" (WILL DURANT) اپنی تاریخ تمدن میں محاکمہ تفتیش کے خصوصیات اس طرح بیان کرتا ہے، محکمہ تفتیش دادرسی کے مخصوص آئین و قوانین رکھتا تھا۔ کسی بھی شہر میں دیوان محاکمات قائم کرنے سے پہلے کلیسا منبروں سے "فرمانِ ایمان" لوگوں کو سُنایا جاتا تھا اور اُن سے کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی ملحد، بے دین، بدعتی کا سُراغ رکھتا ہو تو "محکمہ تفتیش" کو مطلع کر دے۔ ان لوگوں کو دوستوں، پڑوسیوں، رشتہ داروں کی چغل خوری اور اتہام پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ ان کو تشویق و ترغیب دی جاتی تھی۔ چغل خوری کی مکمّل حمایت کے وعدے کے ساتھ ساتھ ان کی بات کو راز میں رکھنے کا وعدہ کیا جاتا تھا۔ جو شخص کسی ملحد کو پہچاننے کے بعد اس کو رُسوا نہ کرے یا اپنے گھر میں چھُپا لے خود وہ شخص ملعون و کافر اور قابلِ نفرین قرار دیا جاتا تھا۔ کبھی مُردے بھی متہم بکفر و الحاد ہوتے تھے تو ان کا مخصوص طریقے سے محاکمہ کیا جاتا تھا۔ ان کی جائداد ضبط کر لی جاتی تھی، ان کے ورثار محروم قرار دے دئے جاتے تھے، مُردے کے کفر و الحاد کی خبر دینے والے کو میّت کے مال کا ۳۵ سے لے کر ۵۰ فیصد تک کا وارث بنا دیا جاتا تھا۔ مختلف مقامات پر اور مختلف زمانوں میں شکنجہ کا طریقہ بھی مختلف تھا، کبھی ملزم کے ہاتھوں کو پشت پر باندھ کر لٹکا دیا جاتا تھا اور کبھی اس طرح باندھ دیا جاتا تھا کہ حرکت کرنا ممکن نہ ہو۔ اور پھر اس کے گلے میں اتنا پانی ٹپکایا جاتا تھا کہ اس کا دم گھُٹ جاتا تھا۔ کبھی بازوؤں اور پنڈلیوں کو رسّیوں سے اتنا مضبوط کس کر باندھ دیا جاتا تھا کہ رسّیاں گوشت میں پیوست ہو جاتی تھیں[1]۔

یورپ میں مسیحی مذہبی مقامات کا اثر و نفوذ اتنا بڑھ گیا کہ جرمنی و فرانس کے دس سے زیادہ بادشاہ اور سیاسی لیڈروں پر پوپ کے ذریعے کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا اور حاکموں کو معزول کیا

---

[1] تاریخ تمدن ویل ڈورانٹ۔ جلد ۱۸۔ ص ۳۵۱

گیا۔ کچھ کو تائب ہونا پڑا۔ مثلاً جرمنی کے ہنری چہارم کو ۱۰۷۵ء میں پوپ کے حکم سے بے اعتنائی برتنے پر "گریگوری ہفتم" (GREGORY VII) کی طرف سے کافر قرار دیا گیا۔ اور اس کو حکومت سے معزول کر دیا گیا۔ مجبوراً ہنری توبہ کرنے والوں کا لباس پہن کر پوپ کی خدمت میں معذرت کے لئے حاضر ہوا۔ پوپ نے تین دن تک اس کو ملنے کی اجازت نہیں دی۔ تین دن کے بعد اس کی توبہ کو قبول کیا۔[۱]

اسی طرح لوئی ہفتم کو پوپ "اینوسینٹ دوم" (INNOCENT II) کی طرف سے ۱۱۴۰ء میں کافر قرار دیا گیا ۱۲۰۵ء میں بادشاہ انگلستان "جان" اور پوپ "اینوسینٹ دوم" کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ بادشاہ نے اسقفوں پر حملہ کیا اور پوپ نے اس کے کفر کا فتویٰ دے دیا۔ کچھ مدّت بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ بادشاہ نے مجبور ہو کر ایک اعلان کیا مجھے غیبی فرشتے نے خبر دی ہے کہ انگلستان و آئرلینڈ کو "عیسیٰ اور اُن کے حواریین ہمارے ولی نعمت پوپ "اینوسینٹ" اور کاتولیک کے جانشینوں کے" سپرد کر دوں۔ اس کے بعد ممالک مذکورہ پوپ کی نیابت میں ہمارے پاس رہیں گے اور ہم ان کے نائب ہوں گے اور ہم نے یہ طے کیا ہے کہ روحانیت رُوم کو ہر سال دو قسطوں میں ایک ہزار انگریزی چاندی کا پاؤنڈ دیا کریں گے، اگر میں یا میری اولاد میں سے کوئی اس اقرار نامے کی مخالفت کرے تو وہ حقِ سلطنت سے محروم ہو جائے گا۔[۲]

مارسل لکھتا ہے کہ آزاد خیال اور پوپ کی حکم عدولی کے جُرم میں پانچ ملیون اشخاص کو سُولی پر چڑھا دیا گیا۔ ان کو سرحدِ مرگ تک پہونچنے سے پہلے مرطوب و تاریک گڑھوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ ۱۴۸۱ء سے پہلے ۱۴۹۹ء تک یعنی ۱۸ سال کے اندر اندر "محکمہ تفتیش" کے حکم پر ۱۰۲۰ آدمیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ۶۸۶۰ آدمیوں کو دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ ۹۷۰۲۲ آدمیوں کو شکنجوں میں اتنا کسا گیا کہ آخر کار اُن کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔[۳]

---

[۱] تاریخ آلبرمالہ۔ ج ۳۔ ص ۲۴۷ [۲] تاریخ تحولات اجتماعی۔ جلد دوم [۳] تاریخ تحولات اجتماعی۔ ج ۲۔ ص ۱۴۳

قرونِ وسطیٰ میں "محکمہ تفتیش عقائد" کے حکم پر تین لاکھ پچاس ہزار دانشمندوں و مفکرین کو زندہ جلا دیا گیا۔[1]

وکٹر ہیوگو (VICTOR HUGO) فرانس کا مشہور شاعر ارباب کلیسا و "محکمہ تفتیش عقائد" پر اس طرح نقد و تبصرہ کرتا ہے: تاریخ ترقی بشر میں حیات کلیسا کو نہیں شمار کرنا چاہئے بلکہ اس کو صفحات تاریخ کے پس پشت قرار دینا چاہئے۔ کلیسا وہی تو ہے جس نے محض اس بات پر کہ "ستارے اپنی جگہ سے نہیں گرتے" "پارنیلی" (PARNILI) کو تازیانے مار مار کر زخمی کر دیا تھا۔ اور "کامپلاند" (CAMPLAND) کو صرف اس کے اس عقیدے کی بنا پر کہ اس دنیا کے علاوہ بے شمار اور دُنیائیں بھی ہیں۔ ستائیس مرتبہ جیل بھیجا اور شکنجوں میں کسا۔ اور ہاروے کو محض اس بات پر شکنجے میں کسا کہ وہ بے چارہ یہ کہتا تھا کہ انسان کی رگوں میں خون حرکت کرتا ہے۔ جامد خون زندہ رگوں میں نہیں رہ سکتا اور "گیلیلیو" (GALILEO) کو توریت و انجیل کے برخلاف حرکتِ زمین کے عقیدے پر جیل بھیج دیا تھا۔ یہ کلیسا وہی تو ہے جس نے کرسٹفر کولمبس (CHRISTOPHER COLUMBUS) کو ایک ایسے مسئلے پر جس کی پیش بینی "سینٹ پال" نے توریت و انجیل میں نہیں کی تھی جیل کی کال کوٹھری میں بند کر دیا تھا، کیونکہ قانون آسمان کا کشف اور حرکتِ زمین کا عقیدہ لامذہبیت کی علامت تھی۔ ایسی بات کہنا جو خلاف مشہور ہو کلیسا دشمنی سمجھا جاتا تھا۔ یہ کلیسا وہی تو ہے جس نے (پاسکال) کو مذہب کے نام پر (مونٹی) کو اخلاق کے نام پر (مولر) کو مذہب اور اخلاق کے نام پر کافر قرار دے دیا تھا۔[2]

کلیسا نے اپنے اثرات کا استعمال مسلمانوں کے خلاف بھی خوب خوب کیا۔ نجات بیت المقدس کے بہانے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ ۱۰۹۵ء سے ۱۲۷۰ء تک مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ لڑی گئی، ان صلیبی جنگوں کی بنیاد پوپ اور راہبوں کی کینہ توزی اور تعصب تھی ان لوگوں نے دھوکا دہی کے ذریعے یورپ کے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا تھا۔ صلیبی جنگوں

---

[1] دائرۃ المعارف قرن بیستم۔ ج ۶۔ ص ۵۹۸ [2] تاریخ آزادی فکری۔ ص ۱۴۷

کے شروع ہونے سے پہلے (اربن دوم) پوپ نے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی ایک انجمن بنائی تھی اسی انجمن میں مسلمانوں سے جنگ کا حتمی فیصلہ کیا گیا تھا۔ پوپ نے تمام اسقفوں و راہبوں کو یہ حکم دے دیا تھا کہ لوگوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر ورغلائیں اور خود بھی فرانس میں اپنے ماننے والوں کو جنگ پر آمادہ کرتا رہا۔ بیتُ المقدس پر قبضہ کرنے کے لئے پہلا عظیم لشکر ایک ملیون آدمیوں پر مشتمل تھا۔ یہ آدمیوں کا سیلاب جب چلا ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ پورا یورپ ایشیا کی طرف متحرک ہے پہلی منزل سے لوگوں کو غارت کرنا، دریا بُرد کرنا، آگ میں جلانا، مثلہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ فوجی وغیر فوجی کا کیا سوال بچوّں اور عورتوں کو تہ تیغ کر دیتے تھے تین سال کے بعد ۱۰۹۹ء میں بیتُ المقدس پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ اس کامیابی میں ان کو بہت نقصان بھی اُٹھانا پڑا۔ کیونکہ ایک ملیون لشکر میں سے صرف بیس ہزار افراد بچے تھے اور لاکھوں آدمی طاعون، بیماری اور غیر مسلموں کے ہاتھ سے تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ اس مذہبی لشکر کے وحشیانہ پن سے اطلاع کی خاطر میں اپنے محترم قارئین کے سامنے فرانس کے مشہور مؤرخ "گوسٹاوی لوبون (GUSTAVE -LEBON) کی عین عبارت کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:- صلیبی مجاہدین کی بداعمالی و بدکرداری نے۔ جو ان تمام حملوں میں ظاہر ہوئی اُن کو روئے زمین کے وحشی ترین، بے شعور ترین، اور درندہ ترین صفت کے لوگوں کی صف میں لاکھڑا کر دیا۔ یہ نام نہاد مجاہدین اپنے ہم سوگندوں، دشمنوں، بیگناہ رعایا، لشکریوں، عورتوں، بچوّں، جوانوں کے ساتھ یکساں ظلم کرتے تھے اور بلا کسی تفریق کے سب کو قتل و غارت کرتے تھے۔ (رابرٹ) پادری جس نے چشم دید حالات بیان کئے ہیں وہ کہتا ہے۔!

ہمارا لشکر گزرگاہوں، میدانوں، کوٹھوں پر مسلسل گشت و حرکت کرتا تھا اور قتل عام سے اس کو ایسی لذت ملتی تھی جیسے اس شیرنی کو قتل کرنے میں ملتی ہے جس کے بچے کو کوئی اُٹھا لے گیا ہو۔ ہمارا لشکر جوان و بوڑھے کے قتل میں کوئی فرق نہیں کرتا تھا، اپنی سہولت کی خاطر کئی کئی آدمیوں کو ایک رسّی میں باندھ کر سُولی پہ لٹکا دیتا تھا۔ ہمارے لشکری ہر اُس شخص کو قتل کر دیتے تھے جو اُن

کے سامنے پڑ جاتا۔ مُردہ لوگوں کا پیٹ چاک کر دیتے تھے۔ زر و جواہر کا پتہ جہاں بھی چل جاتا تھا اس کو ڈھونڈ نکالتے تھے۔ یہاں تک کہ "بوہمانڈ" (BOHEMOND) جو سردار تھا اُس نے قصر میں جمع شدہ لوگوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا، پھر عورت، مرد، بڈھے، ناتواں، بیکار قسم کے لوگوں کو قتل کر دیا اور جوانوں کو بیچنے کے لئے انطاکیہ روانہ کر دیا۔ اس خون آشام فوج کا افسر "گودفرے ہارڈوین وِلے" (GODFREY HARDOUIN VILLE) پُوپ کو لکھتا ہے، اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ بیت المقدس میں ہمارے ہاتھوں کیا بلا نازل ہوئی، تو بس اتنا سمجھ لیجئے کہ رواق سلیماں اور معبد میں سے ہم میں سے کسی کا گزر ہوتا تھا تو گھوڑے زانو تک خون میں ڈوب جاتے تھے۔[2]

یہ اُن روح فرسا واقعات کا معمولی سا نمونہ ہے جسے عیسائیوں نے قرونِ وسطیٰ میں مفکرین و دانش مندانِ یورپ اور مسلمانوں کے ساتھ صلیبی جنگوں میں روا رکھا تھا۔

یورپی ممالک میں "انقیوزیشن (INQUISITION) کے شکنجوں اور سختیوں نے مفکرین اور دانش مندوں کو لرزہ بر اندام کر دیا اور وہ لوگ کلیسا کے اس ظالمانہ و وحشیانہ برتاؤ سے لوگوں کو نجات دلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ارباب کلیسا اور دانش مندوں کا جھگڑا رفتہ رفتہ سخت سے سخت تر ہو گیا۔ اربابِ کلیسا کی طرف سے مفکرین کے لئے جو اختناق فکری اور انتقاد عقائد و افکار پیدا ہو گیا تھا اس کے باوجود علوم طبیعی روز بروز ترقی کر رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب کلیسا کو پیچھے ہٹنا پڑا اور دانش مندوں، آزاد خیالوں، اور طرفدارانِ علم کے لئے میدان خالی ہو گیا۔

کلیسا کی یہی بیہودہ سختیاں اور شرم آور مظالم کے سبب دانشمندوں کا ایک گروہ فطری طور پر دین سے بیزار ہو گیا اور ان کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ دین جہالت و اوہام کا طرفدار ہے، اور علم و دانش کا دشمن۔

خلاصہ یہ کہ محکمہ تفتیش کے وحشیانہ رفتار، شرم آور مظالم نے آسمانی مذاہب کو شدید دھچکا پہنچایا، اور جاہلوں کے دل میں عام طریقے سے تمام ادیان سے نفرت بیٹھ گئی۔

---

[1] تمدنِ اسلام و عرب۔ ص ۴۰۷ [2] تاریخ آلبرمالہ۔ ج ۳۔ ص ۲۲۶

اسی طرح دولت و ثروت کی خاطر محروم و رنجیدہ افراد کے ساتھ کلیسا کی روش نے روس میں ایک شدید ردِ عمل پیدا کر دیا اور لاشعوری طور پر کمیونسٹوں کی پشت پناہی کا سبب بنا اور کمیونسٹ لیڈر وسیع پیمانے پر دین کے خلاف زہر پھیلانے لگے اور مزدور پیشہ افراد کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ مذہب تو سرمایہ داروں کی دستاویز ہے، جمہوریت سے پہلے روس میں کلیسا کے پاس جائداد منقولہ و غیر منقولہ اتنی تھی کہ اس کا حساب مشکل ہے کلیسا کی ذاتی ملکیت ملیونوں ہکتار[1] اور بینکوں میں اس کا ذخیرہ سیکڑوں ملیون روبل طلائی تھا۔ کلیسا اور معابد کو جنگلوں اور چراگاہوں سے وسیع فائدے حاصل ہوتے تھے۔ ماہی گیری تجارت، صنعت وغیرہ سے بڑی بڑی آمدنیاں ہوتی تھیں۔

فردوف اس سلسلے میں لکھتا ہے: یہ کلیسا جو روس کا سب سے بڑا سرمایہ دار، سب سے بڑا زمیندار، سب سے بڑا بینک دار تھا۔ دیہاتیوں سے بہت ہی بے رحمانہ طریقے سے نفع اندوزی کرتا تھا۔ اور تمام مزدوروں کو انجام سے بے خبر ہو کر بری طرح اپنے فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں اور کلیسا کے دیہاتی خادموں کے دلوں میں ان کی طرف سے کینہ پیدا ہو گیا، اور اُن کو "رہبری کے لباس میں غلامی کے طرفدار" کہتے تھے[2]۔ یہ عیسائیت جو ایک دن آداب و رسوم کہنہ کی حافظ تھی اپنی تمامتر سابق درخشانیوں کے باوجود آج اپنے اصول و مبانی کو مضبوط بنانے کے لئے علم و تمدن کے ہر ممکن ذریعے سے استفادہ کر رہی ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ تنہا کیتھولک کلیسا چار ہزار تبلیغی انجمن رکھتا ہے جو دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ انجمنیں مبلغ خطیر نشر و اشاعت مسیحیت کے لئے خرچ کرتی ہیں۔ اور اُن کا تبلیغی سلسلہ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے، حد یہ ہے کہ کانگو، تبت، افریقہ کے وحشی ترین خطوں میں اُن کی تبلیغ ہو رہی ہے، صرف انگلستان کا کلیسا تبلیغ پر سالانہ نوسو

---

[1] دو ہزار میٹر مربع کا ایک ہکتار ہوتا ہے۔ ۱۲ [2] مذہب و اتحاد جماہیر شوروی۔ ص ۷

ملیون تومان خرچ کرتا ہے۔ ہماری ساری تبلیغات پر جو رقم خرچ ہوتی ہے اس کے مقابلے میں تنہا اس کلیسا کا خرچ کہیں زیادہ ہے۔

اب تک صرف انجیل کا ایک ہزار سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ صرف ۱۹۳۷ء میں یعنی ایک سال میں تین اداروں نے انجیل کے ۲۴ ملیون نسخے امریکہ میں تقسیم کئے۔

وٹیکن کا ایک اخبار جس کا نام "اوسرواٹورے رومانو (OSSERVATORE-ROMANO) ہے، روزانہ تین لاکھ کی تعداد میں چھپتا ہے۔ یہ علاوہ اُن ماہناموں کے ہے جو ماہانہ کئی ملیون کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ اب تک مذہبی اداروں کی طرف سے ۳۲ ہزار پرائمری اسکول، سکنڈری اسکول، یونیورسٹی، اسپتال کھولے جا چکے ہیں۔ دنیا میں چار قوی مذہبی ادارے ہیں جو صرف تبلیغات دینِ مسیح کی نشر و اشاعت کرتے رہتے ہیں۔ ایک وٹیکن میں ہے اور چوتھا عدیس اَبابا میں کھولا گیا ہے۔

اصولی طور پر عیسائی تبلیغ کے تین طریقے ہیں۔ (۱) عہدِ جدید کے کتابوں کے ترجمے، (۲) کلیسا و گرجا گھروں کی تعمیر۔ (۳) "جمعیتہائے تبشیریہ" کے نام سے دنیا بھر میں تبلیغی جماعتوں کو بھیجنا۔

پروٹسٹینٹوں نے بھی ضرورت سے زیادہ اقدامات کئے ہیں چنانچہ ریڈر ڈائجسٹ لکھتا ہے! کلیسا کی قدیمی رسم وصولی زکوٰۃ کی از سرِ نو تجدید کرنے کے لئے امریکہ میں پروٹسٹینٹوں نے کلیسا کو حیاتِ نو بخشنے اور عظیم انقلاب لانے میں جو روحانی اور مادی دونوں لحاظ سے قابلِ ذکر ہے۔ اہم رول ادا کیا ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد سے کم از کم دس اداروں میں یہ رسم شروع ہو گئی ہے اور اس کے عجیب و غریب فائدے ظاہر ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت تبلیغی انجمنوں کا کام دُگنا اور تگنا ہو گیا ہے۔ کلیسا کے لئے سیکڑوں عمارتیں بنوادی گئی ہیں۔ مُبلغین کی جماعتیں داخلی اور خارجی طور پر بہت مضبوط ہو گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہوئی ہے کہ انجمنوں کی طرح

افراد کو بھی یہ احساس ہو گیا ہے کہ اس قدیم طریقے کی پیروی سے کتنے نجات بخش نتائج پیدا ہوں گے۔

عیسائی مبلّغین نہ تو یہودیوں سے خوف زدہ ہیں نہ ہندوؤں سے، اور نہ بُودھ مذہب سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب دین ایک ایسی محدود قوم سے تعلّق رکھتے ہیں جو اپنے دائرۂ عمل سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ عیسائی مبلغین صرف اسلام سے خطرہ محسوس کرتے ہیں جس کے طرزِ فکر اور مخصوص خیالات سے دوست، دشمن سب ہی واقف ہیں۔ ویٹکین میں اسقفوں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے پوپ اعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا: افریقہ میں عیسائیت اور مغربی اقوام کو اسلام سے جو خطرہ درپیش ہے وہ افریقہ میں کمیونسٹوں سے مغربی اقوام کو درپیش خطرے سے کہیں زیادہ ہے۔[لہ]

بیرونی ملکوں میں اگرچہ اسلامی تبلیغات صفر ہیں لیکن اسلام اپنی امتیازی صفت وسیع معارف و قدرتِ تحرک کی بنا پر دنیا کے بعض حصّوں میں خصوصاً افریقہ میں بہت ترقی کر رہا ہے۔ مظلوم سیاہ پوستوں کے لئے اسلام بہترین پناہ گاہ ہے اور کلیسا اس خطرے سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

بلجیم کے دو تحقیقی اداروں نے لکھا ہے کہ: بیسویں صدی عیسوی کے ابتدا میں صرف کانگو میں چار ہزار مسلمان تھے جبکہ آج "مانیہ ما" (MANIYEMA) اور "کیوو" (KIVU) اور "اسٹانلی ویل" (STANLEYVILLE) میں مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ ۳۶ ہزار ہو گئی ہے۔ مارسل کارڈر جو یورپی عالم ہے اور اسلام کے مطالعے میں منفرد ہے اس کے قول کو رسالہ (پرو) چاپ راہبر

لہ روزنامہ سودیوٹیلسکی زیٹیونق (SVDEVTSCHEZEITVNG) لکھتا ہے

دنیا کے پانچ ملکوں کی یہ بین الملی انجمن جو پادریوں اور راہبوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ تقریباً ہر صدی میں ایک بار تشکیل پاتی ہے۔ اس انجمن کے تشکیل کا مقصد دنیائے عیسائیت کے درپیش مشکلات کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ آخری اجتماع میں ویٹکین کے اندر جو پوپ کا دار السلطنت ہے دنیا بھر کے کلیساؤں کے تقریباً سات ہزار مذہبی رہنما جمع ہوئے تھے۔ اور اس میں کلیسا کے مشکلات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ انجمن ایک سال کے اندر اپنے تین اجلاس کرتی ہے۔ اور ہر اجلاس کی مدت دو ماہ ہوتی ہے۔ مصادر رسمی کلیسائی کے مطابق تقریباً چھ سو پچاس ملیون

[illegible]

پیرس نے نقل کیا ہے کہ: پہلے اسلام امیروں اور شاہزادوں کا مذہب تھا، لیکن آج مزدوروں کا مذہب ہوگیا ہے۔ ایسے لوگوں کا مذہب جو بہتر اور آرام دہ زندگی کے لئے سیلاب کی طرح رَواں دَواں ہیں۔ اب یہ بات ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شمالی افریقہ سے جنوبی افریقہ کی طرف بڑی سرعت کے ساتھ اسلام بڑھ رہا ہے اور صحیح مردم شماری سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔

رسالہ "ریوو ڈی پیرس (REVOE DEPARIS) مسلمانوں، بُت پرستوں، عیسائیوں کی افریقہ میں مردم شماری کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ بتاتے ہوئے کہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ لکھتا ہے: بطور کلی افریقہ کے آدھے کالے آدمیوں کو مسلمان ہی شمار کرنا چاہیئے۔ اسلام عجیب وغریب سُرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ ہر سال تقریباً پانچ ہزار آدمی اسلام قبول کرتے ہیں۔ اور یہ تیزی پہلے سے نہیں تھی بلکہ تقریباً اسی صدی کے اندر اندر یہ بات پیدا ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں جامعہ ازہر کے چار فارغ التحصیل عالموں نے شہر (مباکو) میں ایک دینی مدرسہ کھولا جو اسلام کو بجلی کی طرح سے پھیلا رہا تھا مگر حکومت فرانس نے اس کو بند کرا دیا۔

نیپلس یونیورسٹی (NAPLES UNIVERSITY) کے استاد ڈاکٹر "واکیا وَاگلیری" (Dr VACIEAVAGLIERI) لکھتے ہیں: پتہ نہیں کیا بات ہے کہ اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کو ضرورت سے زیادہ آزادی، اور مسلمانوں کے پاس وسائلِ تبلیغ کی قِلّت کے باوجود آخری سالوں میں اسلام ایشیا اور افریقہ میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ نہ معلوم اس دین میں کونسی اعجازی قوت پوشیدہ ہے یا کونسی طاقت اس کے ساتھ مخلوط کر دی گئی ہے۔ اور نہ معلوم کیا قصہ ہے کہ لوگ رُوح کی گہرائیوں کے ساتھ اسلام قبول کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اسلامی دعوت پر لبیک کہہ رہے ہیں۔

عیسائیوں نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کے اپنے سارے وسائل استعمال کر ڈالے چنانچہ استاد محمد قطب لکھتے ہیں: جنوبی افریقہ میں انگریزوں کی ایک منظم کشتی رانی کی کمپنی ہے۔ اس

کمپنی میں بہت سے مسلمان بھی کام کرتے تھے مگر چونکہ یہ کمپنی عیسائی ہے لہٰذا مسلمانوں کو کیونکر برداشت کرتی۔ کمپنی نے مسلمانوں کو ایذا پہنچانے کا نیا ڈھنگ اختیار کیا کہ مسلمانوں کو مزدوری کی جگہ شراب کی بوتلیں دینے لگی۔ اور چونکہ مسلمانوں کے یہاں نہ صرف یہ کہ شراب نوشی حرام ہے بلکہ اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان شراب کی بوتلیں لے کر توڑ دیتے تھے، اس طرح بیچاروں کا کافی نقصان ہوتا تھا۔ آخر کار ایک مسلمان قانون داں نے ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ ایسی مزدوری پر پہلے آپ لوگ اعتراض کریں اگر اس کا کوئی اثر نہ ہو تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ آپ جانتے ہیں اس مشورے پر عمل کا نتیجہ کیا ہوا؟ جیسے ہی کمپنی کو اس کی اطلاع ہوئی اس نے تمام مسلمانوں کو نکال باہر کیا۔ بشر دوستی کا مفہوم یہ ہے۔!

اس دور میں مبلغین اسلام کے لئے افریقہ میں بہت وسیع میدان موجود ہے۔ اگر اسلامی مبلغین محنت و خلوص سے کام شروع کر دیں تو افریقہ میں بہت زیادہ لوگ دل و جان سے اسلام قبول کر لیں گے۔ افریقہ اس وقت ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو جنبہ ہائے مادی و معنوی میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ اور معاشرے میں مساوات و برابری قائم کر سکے اور لوگوں کو صلح کی طرف دعوت دے سکے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ عیسائیت ان مسائل کو حل کرنے پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ خود کلیسا نا برابری کا قائل ہے۔ ابھی تک افریقہ میں کلیسا کی طرف سے اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ایک جگہ گورے اور کالے سب مل کر عبادت کر سکیں۔ عمومی طور پر انگریزوں کا برتاؤ کالوں کے ساتھ غیر انسانی ہے۔ کانگو کے مرحوم لیڈر (لومومبا) پیرس کے ایک اخبار میں لکھتے ہیں: میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اسکولوں میں ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ عیسائیت کے اصول کا احترام کیا جائے۔ اور اسکولوں کے باہر ان اصولوں کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ اور تمام انسانی و تمدنی اصول کو پیروں تلے روندا جاتا ہے اور اس کی تعلیم اور ہم سیاہ پوستوں سے یورپی لوگوں کے برتاؤ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

افریقہ میں اسلام کی سرعتِ انتشار سے نہ صرف عیسائی خوف زدہ ہیں بلکہ امریکہ کی تمام مذہبی

انجمنیں خود امریکہ میں کالوں کے مشرف باسلام ہونے سے پریشان ہیں اور اپنے تمام تر ذرائع کو ان کے درہم برہم کرنے میں استعمال کرتی ہیں۔ آج کل شاید ہی امریکہ کا کوئی اخبار ہو جو کالوں کے خلاف تبلیغ میں مشغول نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ کچھ ممبران پارلیمنٹ نے مسلمانوں پر (ریگیک) حملہ کرنے کے بعد امریکہ کے رئیس جمہوریہ سے خواہش کی کہ سیاہ پوست مسلمانوں کی ساری انجمنیں توڑ دی جائیں اور ان کے تمام اقدامات کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے۔

لیکن (بفضل الٰہی) سیاہ پوست مسلمانوں کی کوششوں کو جتنا جتنا روکا جا رہا ہے اُن کی تعداد میں اسی قدر اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔ اور ان کے اقدامات اور ان کی کوششیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اس وقت سیاہ پوستوں نے امریکہ کے ۲۷ صوبوں میں ۷۰ شعبے کھول رکھے ہیں۔ اسی طرح شیکاگو (SHIKAGO) اور ڈیٹرائٹ (DETROIT) میں دو اہم اسلامی مرکز موجود ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے بہت سے مرکز کھول رکھے ہیں۔ متعدد مسجدیں بنا ڈالی ہیں۔ "کلمات محمد" کے نام سے ایک روزآنہ اخبار بھی نکالتے ہیں۔ اور امریکہ کے بعض شہروں میں تو یہ عالم ہے کہ جب یہ لوگ کوئی جلوس سڑک پر نکالتے ہیں تو مذہبی نشان اٹھا کے چلتے ہیں اور آگے آگے ایک بینر ہوتا ہے جس پر "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" لکھا ہوتا ہے۔

تمام سیاہ پوست مسلمان اپنے دینی فرائض کو کمال عقیدت سے ادا کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں اسلامی پردے میں رہتی ہیں۔ یہ لوگ عمومی طور پر گوشت یا دوسری چیز کو کوشش کر کے ایسے قصّاب والیسی دوکانوں سے خریدتے ہیں جن کے یہاں چاند، ستارے کی تصویر بنی ہوتی ہے کیونکہ مسلمان ہونے کی یہ پہچان ہے۔ یہ لوگ بہت کوشش سے عربی زبان سیکھتے ہیں، اسکولوں اور کالجوں میں اپنے جوانوں کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ قرآن کی زبان ضرور سیکھیں۔ ان کے اندر چوری قتل وغیرہ قسم کے عیوب بالکل نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ دشمن یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ کالوں کے اسلام نے ان کے ہر قسم کی بُرائیوں اور عادتوں کو چھڑا دیا۔

مسیحی مُبشّرین جو افریقہ میں سرگرم تبلیغ ہیں وہ کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتے کہ سیاہ پُوست ترقی کریں اور اُن کی طرح کے ہو جائیں، بلکہ وہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایسے افراد تیار ہوں جو صرف کلیسا ہی کے تابع رہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کو استاد وِسٹرمین (WESTERMAN) نے بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں، جب کوئی کالا مسلمان ہوتا ہے تو معاشرے کے افراد میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے۔ اور خود اس کے اندر بہت جلد خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ خود اپنی حیثیت کو پہچاننے لگتا ہے۔ اور جلد ہی اس بات کا احساس کر لیتا ہے کہ اس عالمِ رنگ و بُو کی ایک فرد وہ بھی ہے۔ اور یورپین سے محدُود حد تک ارتباط رکھنے لگتا ہے۔ وہ سیاہ پوست جو پہلے مہتروں جیسی زندگی بسر کرتا تھا اسلام لانے کے بعد ایسی عظمت کا حامل ہو جاتا ہے کہ خود یورپین اس کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے برخلاف جب کوئی سیاہ پوست عیسائی ہو جاتا ہے تو اپنی حیثیت سیاہ پوست مسلمان سے بالکل جُدا دیکھتا ہے۔ کیونکہ ہم لوگوں کی (عیسائیوں) بنیاد ہی سیاہ پوستوں سے علیحدگی پر رکھی گئی ہے۔ جب وہ ہمارے تمدّن سے دوچار ہوتے ہیں تو اس کا تحمّل نہیں کر پاتے۔ ہم نے نہ ابھی تک کالوں کو تعلیم دی ہے اور نہ خود ان کو اس کا احساس ہے کہ ان کے اندر ممتاز خصوصیات موجود ہیں۔ کیونکہ ہم نے کبھی اپنا فریضہ ہی یہ نہیں سمجھا کہ کالوں کے تمدّن کی طرف توجّہ دیں یا اُن کو ترقی دیں یا اُن کی حالت کو اپنی حالت کے مطابق کریں۔ ہم ہمیشہ سیاہ پوستوں کا یُورپین سے نہایت ناپسندی کے ساتھ تعارف کراتے ہیں اور اُن کو ایک نہایت ہی بدصورت یُورپی سمجھتے ہیں۔ مگر اسلام ایک سیاہ افریقی کا تعارف اس طریقے سے کراتا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ پر بھی محترم رہے اور دوسروں کی نظروں میں بھی محترم ہو۔ وہ اجتماعی برابری جو اسلام نے ذاتاً سیاہ پوست مسلمانوں کو دی ہے اس کا (عشرِ عشیر) بھی ہم سیاہ پوست عیسائی کے یہاں نہیں پاتے۔

ایسے بھی یورپی ہیں جن کی نظر میں کالوں کی کوئی وقعت نہیں ہے اُن کی نظر میں

خس وخاشاک میں زندگی بسر کرنے والا بے دین سیاہ پوست اور عیسائی سیاہ پوست میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کسی ایسی فرصت کے منتظر ہیں کہ جس میں کالے مُسلمان کالے عیسائی پر برتری کو آشکارا کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن افریقیوں نے آخری زمانے میں عیسائی تعلیمات کو دیکھا ہے وہ آج نہ صرف مسلمان بلکہ مُبلّغِ اسلام ہو گئے ہیں اور چونکہ افریقیوں کو اپنے یورپی بھائیوں سے مساوات کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ اِس لئے وہ اسلام سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ افریقہ میں اگر کوئی دین اختیار کرنے کے قابل ہے تو وہ صرف اسلام ہے[1]

---

[1] الاستعمار والتبشیر۔ ۱۲

اسلام کے خلاف مسیحی تبلیغات

اسلام کے معنوی اثر و نفوذ سے اصحابِ کلیسا ضرورت سے زیادہ فکرمند ہیں، وہ چاہتے ہیں اسلام کی عالمی شخصیت کو داغدار بنا دیں۔ اسلام کے خلاف زبردست تبلیغ کرتے ہیں اور کبھی تو افترا پردازی تک سے باز نہیں آتے وہ ہر طریقے سے آفتابِ حقیقت کو چھپانا چاہتے ہیں اور ایسے ایسے کام کرتے ہیں جس سے دنیا والے اسلام سے کسی طرح ہم آہنگ نہ ہو سکیں۔

بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ "ایک رات ٹیلی ویژن سے اسلامی حکومتِ یمن کے حالات وہاں کی مساجد کی طرزِ تعمیر، نماز و دیگر عباداتِ اسلامی کے ادائیگی کے طریقے دکھائے جا رہے تھے اور ٹیلی ویژن سرزمینِ یمن کے باشندوں کی محرومیت کا تفصیل سے ذکر کرتے کرتے اسلام کی طرف متوجہ ہوا اور اسلام پر رکیک قسم کے حملے شروع کر دئے کہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑا روڑا اسلام ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کے قافلۂ تمدّن کو دو سو سال پیچھے کر دیا۔ ابتدائی مراحل میں توقف، عقب نشینی یہ اسلام کا پروگرام ہے۔ آج کی دنیا میں پیدا ہونے والے مختلف انقلابات سے محرومی اسلام کی پیروی اور اس کے دستور کی پابندی کی وجہ سے ہے۔"

ذرا آپ غور کریں اس قسم کی زہریلی تبلیغ جب یورپ والوں کے سامنے کی جائے گی جو مسلمانوں کے اعتقادی مسائل سے ناواقف ہیں۔ اور اگر اُن کے کچھ معلومات ہیں بھی تو بالکل غلط سلط۔ تو اس تبلیغ کا اثر اُن کے ذہنوں پر کیا پڑے گا۔ اور اسلام کے بارے میں

جس کا انھوں نے مطالعہ ہی نہیں کیا ہے، ان کے خیالات کیسے ہوں گے۔ کیا اِس قسم کی حق کشی نوعِ بشر کے ساتھ خیانت کے علاوہ کچھ اور ہے۔ ؟

اِس قسم کی تبلیغات کے لئے کیا کہا جائے۔ اگر مادی زندگی میں اہلِ یمن کا پچھڑے ہونا مذہب کی بناء پر ہے تو پھر جنوب اٹلی کے لوگوں کا ـــــ جہاں پر پوپ کی حکمرانی ہے ـــــ جدید تمدّن سے بے بہرہ ہونا کس وجہ سے ہے ؟ آخر وہ لوگ انتہائی فقر و فاقہ کی زندگی کیوں بسر کر رہے ہیں ؟ اور اپنی حیاتِ چند روزہ کی بقا کے لئے پڑوس کے دوسرے ملکوں میں جا کر محنت مزدوری کرنے پر کیوں مجبور ہیں اور یونان والے جو یورپی ہیں اور غیر مسلمان ہیں وہ بہت سے اسلامی ملکوں سے زندگی کی دوڑ میں کیوں پیچھے ہیں ؟ حالانکہ یونان عیسائیت کی پیدائش سے پہلے زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے تھا، لیکن جس دن سے اس نے عیسائی مذہب قبول کیا زندگی کی دوڑ میں عقب سے عقب تر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ پھر عظیم عثمانی سلطنت کے زیرِ پرچم آئے۔

اگر اسلام ہی پسماندہ ہونے کا سبب ہے ! تو پھر ایشیا کے بعض ملکوں کے غیر مسلم اسلامی ممالک سے کہیں زیادہ خراب حالت میں کیوں زندگی بسر کر رہے ہیں ؟ حالانکہ بہت سی جگہوں پر مثلاً "بوسنیہ" (BOSNIA) میں مسلمان، کیتھولک (CATHOLICS) اور ارتھوڈکس (ORTHODOX) لوگوں سے بہت سے لحاظ سے برتری رکھتے ہیں۔ رُوس کے بہت سے مُسلمان اپنے پڑوسی ملکوں کے غیر مسلمانوں سے اگر بہتر زندگی نہیں بسر کر رہے ہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں ! چین کے مسلمان بودھ مذہب پر برتری رکھتے ہیں۔

اصل قِصّہ یہ ہے کہ مغربی ممالک کے تبلیغی ادارے زیادہ تر حقائق کو برعکس بیان کرتے ہیں اور بے بنیاد چیزیں ایسے لوگوں میں منتشر کرتے ہیں جو اسلام کے بارے میں معمولی واقفیت بھی نہیں رکھتے، یہ ساری بدمعاشیاں اربابِ کلیسا کے اشاروں پر وابستگانِ کلیسا کرتے ہیں۔

عظیم مفکّر و رائٹر محمد قطب لکھتے ہیں : ایک مغربی شخص سے مصر میں ایک مرتبہ کچھ دیر

تک اسلام کے بارے میں گفتگو کا اتفاق ہوا۔ آخر میں اس نے کہا، میں کیا بتاؤں آپ جو چیزیں بیان کر رہے ہیں وہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے لیکن میں اس دَور میں اپنے کو آج کے تمدّن سے محروم نہیں کر سکتا مثلاً میں ہوائی جہاز کا سفر کرنا چاہتا ہوں (مگر آپ کا اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مترجم) میں نے بہت ہی تعجّب سے پوچھا آخر آپ کو تمدّنِ امروزہ کے لذائذ۔ کے حصُول سے کون منع کر رہا ہے؟ اُس نے فوراً میری بات کے جواب میں کہا کیا آپ کا اسلام گھر بیٹھ رہنے اور صحرائی زندگی کی طرف واپسی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا آپ کا اسلام یہ نہیں چاہتا کہ ہم پھر بدّوؤں کی سی زندگی بسر کرنے لگیں[1]؟ (آپ نے دیکھا کہ اس مغربی کے ذہن میں کتنی غلط بات بٹھادی گئی تھی۔ اب ذرا دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ مترجم)

جرمنی کے ایک ایسے ہوٹل میں میرا قیام تھا جس کا مالک انگلینڈ و فرانس سے آخری ڈگریاں لے کر واپس ہوا تھا اور وہ عربی زبان بھی جانتا تھا ایک دن کہنے لگا: "میں ایک موحّد ہوں۔ خدا کو پہچانتا ہوں اس پر کامل یقین رکھتا ہوں مگر دینی درسگاہوں نے اپنے ماننے والوں کو جس خدا کا تعارف کرایا ہے اور جس کی پرستش و عبادت کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ میری سمجھ سے باہر ہے اور وہ عقل کی کسوٹی پر کسی قیمت پورا نہیں اُترتا۔ فکر و اِدراک اچھّی طرح جانتا ہے کہ فطرتِ بشری کے بالکل خلاف یہ بات ہے۔ اس کے بعد اس نے بہت ہی افسردہ لہجے میں کہا، یکتا پرستی کی دنیا میں صحیح تعلیم کی ضرورت ہے۔ لوگوں کے خدا کے بارے میں جو غلط تصورات ہیں اُن کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ معرفتِ انسانی کی سطح کو حدِ امکان تک توحیدِ خالص تک پہنچانا چاہئے۔"

یہ بے چارہ اسلام کی خالص توحید سے بے خبر تھا۔ اس کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ توریت و انجیل میں کافی تحریف کی وجہ سے وحدانیت کا تصوّر مسخ ہو چکا ہے اور قرآن میں یہ بات نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ عہدِ قدیم کے کتابوں کی طرح قرآن نے بھی خدا کا تصور پیش

---

[1] اسلام و نابسامانیہائے روشن فکراں۔ ص ۲۹۸

کیا ہے اور قرآن بھی حلول کا قائل ہے۔ اِس کے بعد دین اسلام کے اصول سے متعلّق ایک مختصر رسالہ جو جرمنی زبان میں چھپا تھا میں نے اس کے حوالے کیا کہ آپ اس کا مطالعہ فرمائیں۔

عیسائیوں کی غلط تبلیغ ہی کیا کم ہے کہ اس پر ہمارے بعض ہموطن مسلمان ہونے کی حیثیت سے مغربی ممالک میں جاکر ایسے اعمال و کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے اسلام کے بارے میں مزید غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ یہی جرمنی ہوٹل والا ایرانیوں کے اعمال و کردار کو دیکھ کر کسی ایرانی کو اپنے ہوٹل میں جگہ ہی نہیں دیتا تھا۔ اس کے ایک قدیمی دوست نے بہت اصرار کر کے اس کو آمادہ کیا کہ مجھے اپنے ہوٹل میں چند دن کے لئے جگہ دیدے۔ چند ہی دنوں میں اس کا اعتماد میرے اوپر ضرورت سے زیادہ ہو گیا اور یہ اعتماد اس لئے نہیں پیدا ہوا کہ میں نے خلافِ عادت ضرورت سے زیادہ اس کے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کی ہو۔ نہیں! بلکہ صرف میں نے خلافِ قاعدہ کوئی کام نہیں کیا اس لئے اس کا اعتماد میرے اوپر بہت ہو گیا اور وہ میرا بہت زیادہ احترام کرنے لگا۔ (چونکہ وہ مبالغہ آمیز میری تعریف کرتا تھا اس لئے اس کا ذکر نہیں کروں گا) حد یہ ہو گئی تھی کہ اگر اس کا کوئی مہمان آتا تھا تو میرا کمرہ اپنے مہمان کو دے دیا کرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا کہ رات کو میرے کمرے میں سو رہنا حالانکہ اس کے کمرے میں اس کے سارے کاغذات اور تمام ضروری چیزیں میزوں پر رکھی رہتی تھیں

ایک مدّت کے بعد مجھے وہ جگہ بدلنی پڑی۔ جب میں جانے لگا تو اس نے میرا پتہ نوٹ کر لیا۔ اس کے بعد جب کوئی ایرانی آتا تھا تو وہ پہلے مجھے ٹیلیفون کر کے پوچھ لیتا کہ اگر آپ ضامن ہوں تو میں اس کو جگہ دوں (چونکہ نئے آنے والے مسافرین جن کا پہلے سے کوئی انتظام نہ ہو اُن کے لئے کمرہ حاصل کرنا اور ابتدائی ایّام گزارنا بہت مشکل ہے) اس لئے یہ سوچ کر کہ میرے ہموطن ہیں پریشان نہ ہوں، میں ان کی ضمانت کر لیا کرتا تھا، ایک رات کچھ نئے ایرانی آئے

اور اُن کو جگہ نہ مل سکی تو میں نے اُن لوگوں کو اُسی ہوٹل میں بھیج دیا۔ صبح کو مالک کا فون آیا کہ رات کو آنے والے مسافر بہت بداخلاق تھے مجھے انھوں نے سخت تکلیف پہنچائی۔ میں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ اس سے معذرت کی اور اُس کے بعد طے کر لیا کہ اب کسی کی سفارش نہ کروں گا۔

اِس زمانے میں جبکہ دُنیا بہت حساس ہو گئی ہے اسلام کے لئے بہترین موقع ہے کہ تبلیغ کر کے متمدّن اقوام کے دلوں کو تسخیر کیا جائے۔ اِس زمانے میں حالات بہت سازگار ہو چکے ہیں کہ آئین مقدّس اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ کسی دین کا مطابق فطرت بشری ہونا خود اس کی نشر و اشاعت کا ضامن ہے لیکن اس کے ساتھ جدید طرز تبلیغ اور صحیح نقشہ پیش کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک قاعدے کے تبلیغ کا فقدان ہے۔ غلط طریقۂ تبلیغ، چاہے وہ فرد کی کوشش سے ہو یا جماعت کی کوشش سے، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا اور اگر کبھی اس کا اثر ہُوا بھی تو بہت کم ہوتا ہے جو بادِ مخالف کے جھونکوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام کے اندر حیرت انگیز پیش رَوی کی جو قوّت چھپی ہے اس سے اور جدید طریقہ ہائے تبلیغ کی اہمیت سے چشم پوشی کرنا ہمارے لئے بہت مضر ہے۔ بہترین قوانین اور عمدہ سے عمدہ آئیڈیا رکھنے کے باوجود ہمارا سکوت و جمود قابلِ تعجّب ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بناء پر دوسرے لوگ بڑے پیمانے پر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مَغربی دُنیا کا اَخلاق

یورپین لی زندگی ایک مشینی زندگی ہوکر رہ گئی ہے اور ایک ایسے جسم کی حرکت بن گئی ہے جس میں رُوحِ حیات نہ رہی ہو۔ مادی زندگی کے مختلف شئون میں ترقی کرنے کی وجہ سے متمدن انسان بہت سی مصیبتوں اور جھمیلوں سے چھٹکارا پاچکا ہے اور رفاہ و آسائش کی طرف بہت آگے بڑھ چکا ہے لیکن اس کے باوجود رُوحِ مادیت نے تمام مظاہرِ حیات میں لوگوں کی توجّہ کو بہت سے حقائق کی معرفت سے روک رکھا ہے۔ اور اسی وجہ سے اخلاقی و معنوی جہات طاقِ نسیاں کے سپرد ہوگئے۔

آج کا تمدّن اپنے ہمراہ جو مصیبتیں اور ناگواریاں لے کر آیا ہے اُن کو آنکھ بند کرکے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اب تک جتنے بھی ایجادات، اکتشافاتِ زندگی کو سہل بنانے اور تمدّن کو آگے بڑھانے کے لئے کئے گئے ہیں وہ انسانی تشویش و فکری ناراحتی کو نہ تو دُور کرسکے ہیں اور نہ ہی اجتماعی خطرناک قسم کے بحُران و مشکلات کو دُور کرکے معاشرے کی خوش بختی و راحت کو واپس لاسکے ہیں۔

انسان مختلف جسمانی ضرورتوں کے علاوہ ایک عطشِ معنوی اور طلبِ رُوحی بھی رکھتا ہے۔ انسان جس طرح جسمانی لذّتوں کا شیفتہ و شیدائی ہے اسی طرح فکری پناہ گاہ اور معنوی ضرورتوں کا بھی خواہش مند ہے تاکہ مادے کے علاوہ دوسری ضرورتوں کو پورا کرسکے افکارِ انسانی کو دائرہ مادیت کے اندر محدُود کرنا ایک ناقابل معافی گناہ ہے اور فطرتِ انسانی سے کسی بھی طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔

بشریت کی بزرگ ترین تمنا یعنی سعادت بخش زندگی کا پہلا مرحلہ اُس وقت شروع ہوتا ہے جب فکر اپنی سیر تکامل میں تمدّنِ مادی کے مرحلے سے گزر جائے اور صنعتی و علمی نجتب خیز صلاحیتوں کی ترقی ہو جائے اور رُوحانی قوتیں بروئے کار آجائیں۔ اور کمالاتِ انسانی کے اس منبع سے صحیح فائدہ حاصل کیا جانے لگے۔ کیونکہ ان دونوں قوتوں کے توازن کے بغیر صد در صد انسانی سعادت حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اخلاقی و اجتماعی عیوب کو دیکھنے کے بعد ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ بشری تکامل کے اسباب شائستہ طریقے سے پورے نہیں ہیں اور آج کے انسان نے خوش بختی کے اسباب معلوم کرنے میں اشتباہ کیا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی مُسلّم ہے کہ صفحاتِ تاریخ میں کوئی بھی قوم ایسی نہیں گزری کہ جس کے زندگی کے تمام گوشوں میں فساد ہی فساد ہو اور کوئی خوبی اُن کے اندر موجود ہی نہ ہو۔ اسی طرح مغربی دنیا میں تمامتر اخلاقی مفاسد کے باوجود ابھی کچھ خوبیاں باقی ہیں۔ مثلاً زیادہ تر لوگ امانت دار ہیں۔ سچے ہیں۔ اگرچہ ان خوبیوں سے اُن برائیوں کا جبران نہیں ہوسکتا، یہ چیزیں اخلاقی فضائل میں یقیناً شمار ہوتی ہیں مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ چیزیں مختلف مصالح کی بنا پر کی جاتی ہوں اور کچھ خاص عوامل و اسباب کے ماتحت بجا لائی جاتی ہوں۔ مغربی دنیا میں ان اخلاقی سرمایہ کو دین کا جزو نہیں سمجھا جاتا اور نہ ان کی بجا آوری آسمانی قانون ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے اس لئے نہ تو ان کی کوئی قیمت ہے اور نہ کوئی معنویت ہے یہ تو صرف حصولِ منفعت کی خاطر ان چیزوں کو کرتے ہیں۔ وہاں کے لوگ ان اخلاقیات کو مادی منفعت کے دریچے سے دیکھتے ہیں اور معاملات میں ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اگر ان اخلاقیات اور مکارم اخلاق میں کوئی مادی منفعت نہ ہو تو پھر نہ ان کا کوئی اعتبار ہوگا نہ ان کی کوئی قیمت ہوگی اس لئے تمام مغربی دنیا میں اخلاق کو حصولِ منفعت کا وسیلہ سمجھ کر برتا جاتا ہے۔

اور عصمت و عفّت کے معاملے میں تو مغرب نے حریمِ اخلاق سے بہت زیادہ تجاوز کر لیا ہے اور اس مسئلے میں تباہی اپنے درجۂ کمال کو پہنچ چکی ہے۔ ابتدا میں ہر شخص اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ عصمت ایک انمول موتی ہے اس کا برباد ہو جانا اخلاقی تباہی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یا تو یہ حقیقت فراموش کر دی گئی اور یا پھر گمراہ کرنے والوں نے اس کو ختم کر دیا۔

اِس دَور میں پاک دامنی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے گویا کہ صحنِ معاشرہ سے دامن کش ہو چکی ہے۔ ایک دوست نقل کر رہا تھا: جرمنی ریڈیو سے ایک دن ایک نوجوان عورت اپنی مشکل کو پیش کر کے اس کا حل چاہتی تھی اس نے کہا میں ایک ایسی لڑکی ہوں جس نے ایک جوان سے سالہا سال محبّت کی ہے لیکن امتدادِ زمانہ اور ہر وقت کی صحبت، پے در پے محبّت کرنے سے میری محبت میں کافی کمی آ چکی ہے۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ کسی دوسرے جوان سے رابطہ مہر و اُلفت قائم کروں گی۔ کیا میں اس نوجوان کو نہ کھوتے ہوئے دوسرے نوجوان سے محبّت کے پینگ بڑھاؤں یا اسی نوجوان پر اکتفا کروں اور دوسرے کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دوں؟ رہبر نے جواب دیا کہ ۲۸ سال سے پہلے پہلے تم ایک یا کئی سے تعلّقات رکھ سکتی ہو، اس کی وجہ سے تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن مقامات سے نفوسِ بشری کی تہذیب و اصلاح ہونی چاہیئے۔ عفّت، تقویٰ، فضیلت کی ترویج کرنی چاہیئے، اِنھیں مقامات سے ترویج فحشا و منکر ہو رہی ہے اور خود راہ نما انحراف و ناپاکی و گمراہی کا مرتکب ہونے کے ساتھ ساتھ اس قسم کے لوگوں کی پشت پناہی بھی کرتا ہے اور اخلاقی قید و بند کو توڑ دینے کا حکم عام کرتا ہے۔ اور روابط خصوصی کے ضمن میں شادی سے پہلے فحشا کے مفہوم واقعی کو بدلنا چاہتا

ہے اور آزادیٔ مطلق کے نام پر شادی سے پہلے کی بے راہ روی کو بے عفتی کے دائرے سے خارج کرنا چاہتا ہے اور لوگوں کو شرف و تقویٰ کے برخلاف اُبھارتا ہے۔

ویل ڈورانٹ (WILL DURANT) مشہور جامعہ شناس تحریر کرتے ہیں: شہری زندگی کچھ ایسی ہوگئی ہے جو آدمی کو شادی بیاہ سے روکتی ہے، یہاں کی زندگی لوگوں کی جنسی شہوت کو ہمہ وقت رابطہ جنسی کی بنا پر اُبھارتی رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نامشروع طریقے سے اس جذبے کو سکون پہنچانا بہت آسان ہوگیا ہے۔

جس تمدّن کے اندر شادی بیاہ میں تاخیر کی جاتی ہو اور اتنی زیادہ کہ کبھی کبھی تیس تیس سال کے نوجوان غیر شادی شدہ ہوتے ہیں وہاں اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے کہ انسان وقف ہیجاناتِ جنسی ہو کر رہ جائے اور غلط باتوں سے اپنے کو بچانے کی قوّت کمزور پڑ جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پاکدامنی جو کبھی فضیلت میں شمار ہوتی تھی، اب اس کا تمسخر اُڑایا جاتا ہے۔

شرم و حیا جو کبھی انسان کی زیبائش میں چار چاند لگاتی تھی اَب وہی شرم و حیا ناپسندیدہ عنصر بن چکی ہے۔ نوجوان اپنے گناہوں پر فخر کرتا ہے۔ عورتیں مَردوں سے مساوات کے چکّر میں گرفتارِ عشق و ہوسِ نامحدود ہو جاتی ہیں اور اس کے نتیجے میں عورت و مرد شادی بیاہ سے پہلے ہی اپنے ارمان پورے کر لیتے ہیں۔

سڑکیں رنڈیوں سے خالی دکھائی دیتی ہیں مگر اس کی وجہ پولیس کا خوف نہیں ہے بلکہ آزاد خیال، بے پردہ گھومنے والی لڑکیوں نے رنڈیوں کے بازار کو ٹھنڈا کر دیا ہے[1]۔

آدمی کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ اپنی قوّتوں کو کنٹرول کر کے معتدل طریقے سے خرچ کرے۔ خلافِ فطرت اقدام ناگوار نتائج پیدا کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ آزادی

---

[1] لذاتِ فلسفہ - ۱۲

فکر کے ضمن میں انسان جس راحت و خوش بختی کا متلاشی ہوتا ہے وہ قانونِ فطرت کو پامال کرنے کے بعد کبھی حاصل نہیں کر پاتا۔

مغرب نے اپنے یہاں شہوت رانی کو عام کر دیا ہے۔ لیکن کیا شہوت پرست اس آزادی سے سیر ہو گئے ان کی پیاس بجھ گئی؟ کیا بچوں کی دیوانگی، اعصابی کمزوری، جرم و انتحار، اضطرابات اسی آزادی اور جنسی بے راہ روی کے نتائج نہیں ہیں؟

سویڈن میں تقریباً ربع صدی کی کامل جنسی آزادی نے جوانوں کے اندر کتنے وحشت ناک قسم کے دردانگیز حالات پیدا کر دئے کہ جس سے ذمہ داروں کا ناطقہ بند ہو گیا اور مجبوراً ایسے خطرناک و وحشت ناک قسم کے حالات پر پارلیمنٹ میں غور و خوض کرنا پڑا۔ اور وزیر اعظم نے کھلم کھلا کہا: بیس سال کے اندر ہم نے جو غلطی کی ہے اس کے تدارک کے لئے چالیس سال کی مدت درکار ہے۔

فریڈ (FRED) کے گمراہ کنندہ اصول کے ماتحت لوگ جنسی شہوت میں مبتلا ہو کر بالکل حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگے ہیں اور اس نے لوگوں کو تمایلات جنسی کے کیچڑ میں غوطہ دے دیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنسیات اخلاق سے الگ ایک چیز ہو گئے۔ اور جس دن سے عفت و عصمت تباہی و بربادی کے غار میں گری ہے پھر اس کے روکنے کے لئے کسی بند کا تصور ہی نہیں ہو سکا۔ اسی قسم کی تعلیمات کا نتیجہ مندرجہ ذیل دئے جانے والے اعداد و شمار ہیں۔

فاتح حکومتوں کے نوجوان جنھوں نے جرمنی عورتوں کے ساتھ معاشرت کی ہے اُن کے بارے میں مغربی جرمنی نے چند سال کے اندر اندر جو نتائج بتائے ہیں وہ یہ ہیں کہ اِس معاشرت کے نتیجے میں دو لاکھ ناجائز بچے ہوئے جواب تک جرمنی حکومت کے زیرِ سرپرستی پرورش پا رہے ہیں۔ اِن میں سے پانچ ہزار بچے سیاہ پوست ہیں۔

اور بقول جرمنی حکومت کے ناجائز پیدا ہونے والے بچوں میں بچ جانے والوں کی

یہ تعداد دسواں حصّہ ہے ورنہ زیادہ تر اسقاط، موت یا ماؤں کے گلا گھونٹ دینے کی وجہ سے اس دنیا میں نہ رہ سکے۔

یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ یہ صرف مغربی جرمنی کے اعداد و شمار ہیں مشرقی جرمنی کی صحیح تعداد کی اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے یقیناً گمانِ غالب کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مشرقی جرمنی کے حالات اگر اس سے بدتر نہیں ہیں تو اس سے بہتر بھی نہیں ہیں[1]۔

دوسرے مغربی ممالک بھی جرمنی سے پیچھے نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات وہ ہے جو مجلس اُمورِ اخلاق (NORTHAMPTON) میں تسلیم شدہ ہے۔ اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ انگلستان کے مرکز میں واقع ہونے والے نارتھمپٹن (NORTHAMPTON) میں ناجائز بچوں کی اوسطا تعداد پچاس فیصد ہے اور اس میں اس بات کی بھی تشریح کی گئی ہے کہ ناجائز بچوں کی افزائشِ نسل کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے یہ حصّہ زراعت پیشہ کسانوں سے خالی ہو کر صنعتی بنا[2]۔

ڈال کرینجی (DAL: CARNEGIE) لکھتے ہیں: امریکہ کی ایک علمی انجمن نے شوہروں کی اپنی بیویوں کے ساتھ خیانت کا ایک اعداد و شمار جمع کیا تھا جس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ ایسے شوہروں کو پیشِ نظر رکھا جائے جو مختلف طبقے اور مختلف سن و سال کے ہوں۔ اس اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً آدھے شوہر اپنی بیویوں سے خیانت کرتے ہیں اور کچھ لوگ پابندی سے اس عمل کو کرتے ہیں اور دوسرے آدھے شوہر جو اپنی بیویوں کا پاس و لحاظ کرتے ہیں وہ یا تو بربنائے مجبوری اور خوف رسوائی کی وجہ سے ہے یا پھر عدیم الفرصتی کی وجہ سے ہے۔ چند سال پہلے نیویارک میں ایک تھوڑی سی مدت کے لئے مکالمہ ٹیلیفونی کے ذریعے ریسرچ کی گئی تو پتہ چلا کہ بہت سی عورتیں بھی اپنے شوہروں سے خیانت کرتی ہیں[3]۔

---

[1] خواندنیہا سال ۱۵ شمارہ ایک سو دس (۱۱۰) [2] طلاق و تجدد صفحہ ۳۴ [3] آئین کامیابی

حکومت ہائے متحدہ امریکہ کے تمام اسپتالوں میں ۶۵۰ اسپتال صرف جنسی بے راہ روی سے پیدا ہونے والے امراض کے لئے مخصوص ہیں۔ ان میں ڈیڑھ فی صد لوگ اپنے معالج خصوصی یا خاندانی حکیم کی طرف رُجوع کرتے ہیں[1]۔

ہر سال امریکہ میں تیس سے چالیس ہزار بچّے فرائض زوجیت کے ادائیگی کے سلسلے میں ہونے والی بیماریوں سے مرتے ہیں۔ امریکہ میں اِن بیماریوں سے مرنے والوں کی تعداد دیگر امراض سے مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے[2]۔

سکسولوجی۔ رسالہ (SEXOLUGY) دسمبر ۱۹۶۰ء کے سرِ مقالہ میں لکھتا ہے:

سالہائے ماسبق کے بہ نسبت ناجائز بچّوں کی کثرت پیدائش امریکہ کے لئے عظیم دردسری کا باعث بن گئی ہے۔ منتشر ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں ۱۹۵۷ء میں دو لاکھ سے زیادہ ناجائز بچّے پیدا ہوئے تھے۔ اور گذشتہ بیس سال کے اندر اِن میں پانچ فی صد کا اضافہ ہو چکا ہے[3]۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے رسالہ "سیاہ وسفید" کی ایک سالانہ رپورٹ ایک ملیون فقرے پر مشتمل ہے جس میں ۴۵ فیصد ناجائز، آزادی وغیرہ سے متعلق ہے اور پچاس فیصد ناکتخدا لڑکیوں سے متعلق ہے[4]۔

ڈاکٹر مولینز (MOLENZ) جو لندن کے مغربی حصے میں مشغول طبابت ہیں وہ تحریر کرتے ہیں، انگریزوں کی کلیسا میں جانے والی ہر پانچ لڑکیوں میں سے ایک حاملہ ہوتی ہے۔ لندن میں ہر سال پچاس ہزار بچّے پیٹ سے گرائے جاتے ہیں۔ ہر بیس پیدا ہونے والے بچّوں میں ایک ناجائز ہوتا ہے۔ اوضاع زندگی کے بہتر ہونے کے باوجود ہر سال ناجائز بچوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر مولینز کا خیال ہے کہ زیادہ تر ناجائز بچّے مرفہ حال گھروں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان دوشیزاؤں کے یہاں

---

[1] دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۳ ہ صفحہ ۴۵ ہ [2] کتاب قوانین جنسی صفحہ ۴۰ ہ [3] اطلاعات شمارہ ۱۰۴۱۴
[4] سفید و سیاہ۔ شمارہ ۳۷۰

ہوتے ہیں جو دَولت مند گھرانے کی فرد ہوتی ہیں[1]۔

یہ اَعداد و شمار بتاتے ہیں کہ متمدّن انسان غریزہ جنسی میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اِس کی ہوس رانی اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ خاندانوں میں جو نظم و ضبط ہونا چاہیئے اور انسانی و اخلاقی قدر و قیمت جو ممکن طور پر ہونا چاہیئے وہ سب فراموش ہو چکی ہیں اور اس بے راہ روی کی اب کوئی حد اِن کے لئے متعین نہیں رہی۔

تہران کے اخباروں میں چند سال پیشتر یہ خبر چھپی تھی کہ امریکہ کے صوبہ اڈاہو (IDAHO) میں کچھ لوگوں نے اپنی اپنی عورتوں کو تین ہفتے کے لئے اَدلا بدلی کر لی تھی اور ہر ایک نے اپنے دوسرے دوست کو بطور ہدیہ اپنی بیوی دی۔ اس واقعے پر امریکہ میں بڑا واویلا مچایا گیا۔ مجبوراً حکومت نے عِفّت عمومی کو مجروح کرنے اور اشاعت فحشاء کے جُرم میں ان لوگوں کو عدالت میں کھینچ بلایا۔ یہ سارے خرافات لوگوں کی زندگی کے ایک شعبے میں یعنی جنسی مسائل میں ظاہر ہوتی ہیں۔

ہر مذہب و مِلّت میں بزرگانِ قوم کی روش اور مُربّیوں کے افکار و عقائد سے شخصی طرز فکر متاثر ہوا کرتا ہے۔ اب وہ طبقہ، جو خود معاشرے کے رہبری کا ضامن ہوتا ہے اس کی طرف سے اس قسم کے مفاسد کی نشر و اشاعت ہر چیز سے زیادہ اخلاقِ عمومی کو برباد کرتا ہے۔ اور چونکہ ہر فرد تقاضائے فطرت کے ماتحت نفسانی شہوات کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اِس لئے مربّیوں کی بُری تعلیم ہر قسم کے اخلاقی دستور سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور اس معاشرے کے افراد کے ذہن و فکر پر زیادہ اثر ڈالتی ہے۔ جو بھی اس قسم کے مکتبِ بے راہ روی میں تعلیم پائے گا اور ایسے معاشرے میں پرورش پائے گا وہ قہری طور پر اپنے اندر بے حساب آزادی کا احساس کرے گا۔ عفّت و عصمت اس کی نظر میں ایک بے معنی چیز ہو گی۔ اور اس کے افکار کی جولانی دائرہ شہوات نفسانی سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

---

[1] کیہان۔ شمارہ ۵۳۵۶

رزائلِ اخلاقی کی جانب داری کرنے والے درحقیقت ایک ایسی نسل گنہگار کی پرورش کرنے کے ذمہ دار ہیں جو نسل آستانۂ خواہشِ نفسانی پر کمزور و نحیف ثابت ہو اور عقل و وجدان اُن کے کندھے پر جو بوجھ ڈالے اس کو آسانی سے اُٹھا نہ سکے۔

کنیڈی نے ۱۹۶۲ء میں اعلان کیا: امریکہ کا مستقبل تکلیف دہ ہے۔ کیوں کہ بے راہ روی اور شہوتوں میں ڈوبے جوان اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے سکنے پر قادر نہ ہوں گے مثلاً فوج میں لئے جانے والے سات افراد میں چھ نالائق ہوں گے کیونکہ شہواتِ نفسانی میں غرق ہونے کی وجہ سے اُن کی بدنی اور رُوحی قوّت ختم ہو چکی ہوگی۔

خروشچوف نے بھی کنیڈی کی طرح ۱۹۶۲ء میں اعلان کیا، روس کا مستقبل خطرے میں ہے اور مستقبل کے نوجوانوں سے کوئی اُمید وابستہ کرنا دانش مندی نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ زنجیر بے راہ روی میں گرفتار ہیں۔

کتنے تعجّب کی بات ہے کہ علم و صنعت کے اس دورِ ترقی میں نسل جوان کی مشکلات کے سامنے متمدّن دُنیا نے گھٹنے ٹیک دئے۔ اور صنعتی تمدّن کے پیٹ سے روزآنہ ایک نہ ایک ایسی چیز پیدا ہوتی رہتی ہے جو خستگیٔ رُوح کا باعث ہے۔

کبھی فوجیوں کا دستہ غیر موزوں و نامنظم حرکات کرتا ہوا ظاہر ہوتا ہے اور جوانوں کے گروہ در گروہ اُن کے پیچھے لگ لیتے ہیں تو کبھی ہپّی متمدّن مرکزوں میں گھاس کی طرح اُگنے لگتے ہیں اور خشک مادی تمدّن کے خلاف انقلاب برپا کرتے ہیں اخلاقی و معنوی قدر و قیمت کو موہوم و بے اساس سمجھتے ہوئے معقول زندگی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور پھر زمانے کے تمدّن سے روگرداں ہو کر قید و بند کی زنجیروں کو توڑ کر اس طرح حیران و سرگرداں ہو جاتے ہیں کہ اپنے لئے کوئی روحی پناہ گاہ نہیں پاتے۔

اسی قسم کی اجتماعی خرابیاں، اور عوامل انحراف سے تاثر اور مظاہر فساد و آلودگی

کے مقابلے میں ان کا احساس اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ موجودہ تمدّن نے معاشرے کے افراد کو ایک مشین کے پُرزے بنا دیے ہیں۔ ان میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ انسان کے فطری و روحی تقاضوں کو قانع کر سکیں اور عواطف انسانی کا صحیح جواب دے سکیں۔

خودکشی کی کثرت بھی انھیں اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لوگ اگرچہ مادی زندگی کے لحاظ سے آسودہ حال ہیں لیکن خودکشی کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

پولیس کے بیان کے مطابق ۱۹۷۶ء میں مغربی جرمنی کے دس ہزار سے زیادہ افراد نے خودکشی کی اور اسی سال چھ ہزار سے زیادہ مَردوں نے اور سات ہزار سے زیادہ عورتوں نے جرمنی میں خودکشی کرنی چاہی جن کو بچا لیا گیا۔[1]

معاشرۂ فرانس جو جدید تمدّن میں ہر جگہ سے آگے ہے وہاں ہر سال ۳۵ ہزار افراد خودکشی کرتے ہیں۔

امریکی جوانوں میں نشہ آور چیزوں کا استعمال اس کثرت سے ہو گیا ہے کہ آخری ایّام میں نیویارک کی پولیس نے ایسے ۳۸ جوانوں کی لاش تلاش کی جن کی عمر ۱۶ سے ۳۵ سال کے اندر تھی اور جن کی موت کا سبب نشہ آور چیزوں کا استعمال تھا۔ ان میں بعض مرنے والے جوان تو ایسے تھے کہ مرنے سے پہلے اپنے بازوؤں سے سرنج بھی نہ نکال پائے تھے۔ نشہ آور چیزوں میں ان لوگوں کے نزدیک ہیروئن کو پہلا درجہ حاصل ہے۔ اس وقت صرف نیویارک میں ایک لاکھ آدمی ہیروئن کا عادی ہے بایں معنی کہ ہر اسّی افراد میں ایک شخص افیون کا عادی ہے۔

مالداروں میں ہنرپیشہ لوگ سب سے زیادہ ان چیزوں کے عادی ہیں۔ نیویارک کے ایک حکیم نے کہا ہے کہ امریکہ کے مشہور ترین ہنرپیشہ افراد میں ایک شخص

---

[1] مجلہ تندرست۔

۲۴ گھنٹے میں دس مرتبہ نشہ آور دوا کے استعمال کا عادی ہے اور ایک مرتبہ میں استعمال ہونے والی نشہ آور دوا کی قیمت ساٹھ ڈالر ہے۔ وہ حکیم مزید کہتا ہے کہ بہت سے مشہور لوگ جو سکتۂ قلبی کے شکار ہو کر مر جاتے ہیں ان میں سے اکثر اس نشہ آور دوا کے عادی ہوتے ہیں[1]۔

امریکہ جیسے متمدن ملک میں ہر پچیس منٹ پر ایک عظیم جرم کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور ہر ۲۴ گھنٹے میں ۳ قتل ۵ زنا بالجبر ۳۰ بڑی چوریاں اور ۳۰۰۰ ہزار چھوٹی چوریاں ہوتی ہیں۔

عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اسی امریکہ میں تباہ کاروں کے مبارزہ اور قانون اختصاص کے اجراء کے لئے چار ملیون ڈالر تک دئے گئے ہیں۔ نیویارک میں تباہ کاری کرنے سے پہلے پہلے سو ملیون ڈالر تک بطور پیشگی دئے جاتے ہیں[2]۔

یہ وہ روش ہے جس کی طرف خود باختہ لوگ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور اس قسم کی لیڈری پر فخر کرتے ہیں۔

---

[1] اطلاعات شمارہ ۱۳۰۱۵ [2] روح بشر صفحہ ۳۲

کلیسا کی عبادت

اگرچہ کلیسا اپنی پوری تبلیغی قوّت اور عظیم قدرت کے ساتھ مغربی معاشرے میں دخیل ہے لیکن اس کے باوجود پاکیزگیٔ اخلاق، صفائیٔ قلب لوگوں کے دلوں میں جس طرح ہونا چاہئے وہ نہیں ہے۔ کلیسا لوگوں کی شکستگی رُوح کا علاج نہیں کرسکا۔ مغرب کے بے لگام خواہشاتِ نفس کو محدُود نہیں کرسکا۔ جو مذہب اپنے ماننے والوں کو ناپسندیدہ اعمال کی ضرورت سے زیادہ اجازت دیتا ہو وہ ان کو گناہ و پلیدگی کے چنگل سے کیونکر بچا سکتا ہے اور اخلاقی فساد کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر انحطاط کو کیوں کر دور کرسکتا ہے؟ جس عبادت، تزکیۂ نفس کے ذریعہ انسانیت کے مدارج عالیہ تک پہنچنا تقربِ خدا اور خاص نیّت سے ہونا چاہئے۔ وہ اپنے واقعی مرکز سے منحرف ہوکر آلودگیوں کے نذر ہوچکا ہے۔

عیسائیت صرف عقائد ہی میں خرافات سے دوچار نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں مفہومِ عبادت تک بدل چکا ہے۔ اگر آپ تعجّب نہ کریں تو میں یہ عرض کروں کہ کلیسا میں ایک ڈانس ہال بھی بنوایا جاتا ہے تاکہ شہوت پرست جوانوں کو اس ذریعے سے عبادت کی طرف مائل کیا جائے۔ اور اس راہ سے نسل جوان کو کلیسا کے جال میں پھانسا جائے۔ جس عبادت گاہ کو حریمِ عفّت و تقویٰ، پسندیدہ صفات کی پرورش کا گہوارہ ہونا چاہئے وہ اس افسوس ناک وضع سے دوچار ہے۔ دینی رہنما۔ جن کو اس فسادِ اخلاق کے سیلاب کے سامنے سدِّ سکندری بن جانا چاہئے تھا وہ ـــــ خود ہی اس معاشرے کی اخلاقی پستی کے باقاعدہ شکار ہیں یہیں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عیسائیت مغربی دنیا

میں اخلاقی انقلاب لانے سے مجبور ہے۔ اور نہ ایسی دست گاہ انسان کو خداشناسی کے پاک و پاکیزہ خیالات سے بہرہ مند کرسکتی ہے اور نہ دنیا کو اخلاقی بحران سے نجات دلاسکتی ہے۔

ذیل کی خبر اربابِ کلیسا کی روش پر روشنی ڈالتی ہے۔

رُوحانی باپ (یعنی پوپ) کلیسا کے اندر رقص و موسیقی کے ذریعے گمراہوں کی ہدایت کرتے ہیں۔ کناڈا کے مانٹریل (MONTREL) ریاست کے گرجا فرانسس میوکس (FRANCIS MiEUX) کے ۳۵ سالہ پوپ زبردست ماہر موسیقی ہیں۔ ان کو شعر گوئی اور گانے میں کافی مہارت ہے۔ اب تک انھوں نے ڈیڑھ ہزار نظمیں کہی ہیں یہ پوپ صاحب مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ اس فن کے ماہر بھی ہیں[1]۔

کیا عبادت گاہوں میں اس قسم کے اعمال کا بجالانا دین و مذہب کے ساتھ مسخرہ بازی نہیں ہے؟ عبادت انبیاء کرام کے عالی ترین تربیتی دستور کا نام ہے۔ پُر آشوب مادی دنیا کے مفاسد، اور ضرورت سے زیادہ مادیات سے دل چسپی سے علیحدگی بغیر خدا سے توجّہ کئے ہوئے کسی کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ آدمی کی پوری زندگی کا اصلی محور ذات پروردگار عالم کی معرفت ہے۔ اس لئے کہ بغیر معرفتِ الٰہی زندگی کی کوئی تعمیر صحیح نہیں ہوسکتی۔

یہ عبادت ہی ہے جو انسان کو آزاد شہوتوں کی قید و بند سے رہائی دلاتی ہے اور قربِ الٰہی کی منزل تک پہنچاتی ہے۔ ملاحظہ تو فرمایئے کہ ایسی پر ارزش حقیقت کس طرح ایک گروہ کے خواہشاتِ نفس کے ہاتھوں برباد ہوگئی ہے۔

غفلت و بے خبری کے پردوں کو چاک کرنا، اور عظیم روحی و معنوی انقلاب لانا عباداتِ اسلامی کے اہم ترین فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔ یہاں پر مسلمانوں اور عیسائیوں

---

[1] اطلاعات ہفتگی شمار ۱۰۸۹۰

کے عبادت کا ایک معتدل فیصلہ خود ایک عیسائی دانشمند (STAHWOODCO) سے سنئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ مجھے موقع ملا کہ مسجد ایا صوفیہ میں مذہبی مراسم و نماز کے طریقے کو دیکھوں، اس عبادت کا اہم ترین حصّہ رکوع و سجود تھا۔ نماز پڑھتے وقت نمازیوں کو کئی مرتبہ رکوع کے لئے جھکنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد سجدہ کرنا ہوتا ہے۔ اور اس منظم عمل کو انجام دینے کی حالت میں کچھ مقدس کلمات کا ـــــ جو خدا کی تعریف پر مشتمل ہوں ـــــ زبان پر جاری کرنا بھی ضروری ہے۔

نمازیوں کی اس پُرشکوہ خضوع و خشوع کی عظمت سے میں بہت متاثر ہوا۔ سچّی بات یہ ہے کہ میں نے کسی بھی مسیحی کلیسا کے اندر کبھی بھی ایسی بے ریا تعریف، سپردگی کی گہرائی، ذاتِ خدا کی بہ نسبت عبادت میں اتنا خلوص نہیں دیکھا! اس کے بعد چند لوگوں کے ساتھ میں نے چاہا کہ بالکنی سے احیاء شبِ قدر کا منظر بھی دیکھوں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اسی رات کو آسمان سے قرآن نبیؐ اسلام پر اُترا تھا۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ایا صوفیہ کی مسجد پانچ ہزار نمازیوں سے چھلک رہی تھی اور ان کا رکوع، سجود ایک طرح اور ایک انداز سے منظّم طور سے ادا ہو رہا تھا۔ ان کا رکوع میں جھکنا، سجدے میں جاتے وقت ہتھیلیوں کا زمین پر رکھنا اور پھر منظّم طریقے سے اُٹھنا اور باہم تکبیر کہنا اور خفیف سی بہت ہی پرعمق حرکت سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی پرندہ اپنے پروں کو کھول رہا ہو اور سمیٹ رہا ہو۔

یہ منظر بے نظیر و پُرشکوہ ہونے کے ساتھ دلوں میں ایک خوف بھی پیدا کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی عبادت میں یہ چیزیں گہری تعریفِ خدا، خضوع و خشوع کے علاوہ تھیں، اسی طرح اس میں آزاد منشی کی رُوح، ڈیموکراسی، مساوات، نسلی و قومی امتیازات کا نہ ہونا بھی بہت ہی واضح تھا۔

میں نے خود دیکھا دن بھر سڑکوں پر مارا مارا پھرنے والا مزدور اپنی خستہ حالی کے

باوجود بیش قیمت اور صاف وشفاف قالینوں پر، قیمتی لباس والے بادشاہ کے شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ اور کامل اطمینان اور بلا خوف وہراس کے اُس کے ساتھ رکوع وسجود ادا کر رہا تھا۔

میں نے موٹے تازے بدہیئت کالوں کو دیکھا کہ بہترین قیمتی لباس پہنے ہوئے ترکوں کے ساتھ مذہبی مراسم ادا کرنے میں مشغول تھے۔

اسلام اپنے آغاز ہی سے ایک پُر اثر برادری کا قائل تھا اور اس کی یہ خصوصیت آج بھی موجود ہے۔[۱]

مغربی دنیا میں دین ومذہب کے سلسلے میں سب سے بڑا اشتباہ یہ ہوا ہے کہ وہ لوگ مذہب کو ایک باطنی وشخصی چیز خیال کرتے ہیں کہ جس کا زندگی کی واقعیت سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ عقیدے کے اسی انحراف نے ان کی تمام زندگی پر اپنا منحوس سایہ ڈال رکھا ہے۔ اور ان کے کردار ورفتار کو آلودہ بنا رکھا ہے۔ جس سرزمین پر ایسا عقیدتی بحران ہوگا اس کی زندگی میں بھی انحرافات کا ہونا ضروری ہے اور حقیقت کا خواہشاتِ نفسانی کے خرافات میں گم ہونا حتمی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ فساد وتباہی کا دور دورہ ہے۔

اس کے علاوہ ایسا طرزِ فکر انسان کے ذہن میں معنوی ارزشوں سے دست وگریباں ہوتا ہے یعنی انسان کو چاہیئے کہ دین کی منطق اور رُوحانی پروگرام کے پیشِ نظر ایسے موضوع سے قطع نظر کرلے اور اُسی کو اپنی عملی زندگی کا لازمی جزو بنالے۔

عقیدے کی شعاع ہر کردار وپندار پر اپنا ایک اثر ڈالتی ہے اور اصولی طور پر زندگی عقیدے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ دین یا عقیدے کو خارجی دنیا سے الگ کرنا ایک ایسی غلطی ہے جو قابلِ معافی نہیں ہے۔ ڈیمپیری (DAMPIERRE) اپنی کتاب "نزع بین دین ودانش" میں لکھتا ہے اور اس اشتباہ کو حل کرتا ہے "قسطنطین ہی ایسا شخص ہے جس

---

[۱] خداوند دو کعبہ۔ صفحہ ۲۲۷۔

نے دینِ مسیحیت کو اپنے دورِ حکومت میں حتمی و لازمی قرار دیا تھا اور بُت پرستوں کو عیسائی مذہب میں داخل کرنے کی غرض سے بہت سی بُت پرستوں کی رسموں کو مذہب کا جزو قرار دے دیا تھا۔

تنہا وہ چیز جس کی یاد دہانی یہاں پر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یورُپ میں ہر مسیحی کے ذہن میں ــــ خواہ وہ قرونِ وسطیٰ کا ہو یا اس جدید دَور کا جو منکرِ خدا ہے ــــ یہ بات تھی کہ دین صرف خدا اور شخص کے درمیان کا مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ زندگی میں دین کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ دوسری لفظوں میں یُوں واضح کیا جائے کہ عقیدہ جو بھی ہے اس کا تعلّق آدمی کے دل کی گہرائیوں سے ہوتا ہے لیکن زندگی پُوری کی پُوری عقیدے سے علیحدہ چیز ہے۔

الکحل کے نقصانات

شراب و نشہ آور چیزوں کا روز افزوں بکثرت استعمال رُوحِ معاشرے کو تباہ اور برباد کر رہا ہے۔ اور اسی لئے منحوس و ناہنجار قسم کی مسلسل خرابیاں جو از رُوئے اخلاق دین، رُوح، مذہب، افراد و معاشرے کو نقصان پہنچا رہی ہیں ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی عقلمند اِن بُرائیوں کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ کوئی ایسا سال نہیں گزرتا جس میں الکحل کے رَسیا ہزاروں کی تعداد میں اسپتال نہ پہنچتے ہوں، اور ہزاروں افراد قتل، خودکشی خیانت، چوری، رُسوائی جیسے عظیم جُرم کا ارتکاب نہ کرتے ہوں۔

بہت سے افراد کا نظریہ ہے کہ شراب پینے سے رنج و غم سے چھٹکارا حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لوگ اِس طرح زندگی کی مشقتوں اور سختیوں کے مقابلے میں اعترافِ شکست و ناتوانی کرتے ہیں اور زندگی کی نامناسب سختیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ جب بھی نامناسب و مشکلاتِ زندگی کی وحشت انگیز صدا ان کے کانوں سے ٹکراتی ہے یہ بادہ نوشی کی پناہ لینے لگتے ہیں تاکہ زندگی کے ان غموں سے عالمِ خیال میں ہی سہی کچھ دیر کے لئے سکون تو مل جائے۔

یہ بہانے جن کی بنا پر انسان میگساری کی طرف مائل ہوتا ہے ان سے شراب خواری کا جواز نہیں ثابت ہو سکتا۔ جام و شراب کا وجود ہی معاشرے کی بیمار ہونے کی دلیل ہے اور یہ ایسی ہستی سوز بیماری ہے جس کا علاج ترتیب روحی و فکری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ عقل مند انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بادۂ علم و دانش سے سرمست ہو، نہ یہ کہ جام و مینا سے سر ٹکرائے۔

جس کا نتیجہ دیوانگی اور انسان کو درجۂ بہائم میں پہنچانا ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ مجھے ہمبرگ میں یہودیوں کی ایک بہت خوب صورت عبادت گاہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہلکی پھلکی پرشکوہ عمارت ہر دیکھنے والے کی توجّہ اپنی طرف مبذول کر لیتی تھی۔ سرپرست عبادت گاہ کے ذریعہ اس کے مختلف حصّوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جس چیز نے مجھے متحیّر کر دیا وہ یہ تھی کہ شراب نوشی کے لئے ایک مخصوص ہال بنایا گیا تھا۔ میں نے بہت ہی تاثر کے ساتھ پوچھا کیا عبادت خانوں میں بھی شراب نوشی کی جاتی ہے؟ اس نے جواب میں کہا! ہاں لیکن یہ عام لوگوں کے لئے نہیں ہے بلکہ مخصوص افراد جب یہاں آتے ہیں تو اُن کے لئے سہولت مُہیّا کی جاتی ہے۔

شراب نوشی کی کثرت نے معاشرے کے رہبروں اور دانش مندوں کو وحشت زدہ کر دیا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بہت سی انجمنیں بنائی گئی ہیں مثلاً "سازمان مبارزہ باالکل" لیکن ایسی موذی بیماریوں کا علاج اس قسم کے انجمنوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کے اقدامات مزید اس خانماں برباد مرض میں زیادتی کا سبب بنتے ہیں اور اب تو اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں متحرک طبقہ اور نسل جوان، طبقہ شراب خواراں میں نہ بدل جائے۔ ذیل کے اعداد و شمار بدبختی کی روشن مثالوں میں سے ایک ہیں۔ بین الملی چوبیسویں کانفرنس کے اطبار کے تحقیقات کے مطابق فرانس میں شراب نے مندرجہ ذیل افراد کے عقل و رُوح کو مُتاثر کیا۔

اسپتالوں میں داخل ہونے والی عورتوں میں ۲۰ فیصد، اور مردوں میں ۶۰ فیصد الکحل کے عادی تھے۔ ۷۰ فیصد دیوانوں اور ۴۰ فیصد بیماروں میں الکحل کی آمیزش تھی۔

انگلستان کی تحقیقاتی کمیٹی کے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ۹۵ فی صد دیوانے الکحل کے عادی ہوتے ہیں[1]۔ فرانس کے وزیر صحت نے وہاں کے الکحل سے مرنے

---

[1] مجلہ تندرست۔

والوں کی تعداد جب نشر کی ہے تو اخباروں نے کہا یہ تعداد جھنجھوڑ دینے والی ہے۔ اس نشریہ میں بتایا گیا ہے کہ الکحل کے کثرتِ استعمال سے ۱۹۵۶ء میں مرنے والوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ شراب کے سلسلے میں بین المللی کمیٹی کے چیرمین نے بتایا: فرانس میں ۲۵ فیصد کار سے ہونے والے حادثات اور ۵۷ فیصد موٹروں کے حادثات الکحل کی کثرت استعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں[1]۔

پائن کارے (PAIN CARE) فرانس کے رئیس جمہوریہ نے جو الکحل کے تحقیقاتی کمیٹی کے صدر بھی ہیں، بین المللی جنگ کے موقع پر ایک اعلان اس طرح کیا: اے فرانس کے بیٹو! تمھارا سب سے بڑا دشمن الکحل کا استعمال ہے۔ جرمنی سے جنگ کرنے سے پہلے تم کو ان نشہ آور چیزوں سے جنگ کرنی چاہئے۔ ۱۸۷۰ء میں شراب خواری کے نتیجے میں جو جانی و مالی نقصان ہوا تھا وہ اس جنگ سے ہونے والے نقصان سے کہیں زیادہ تھا۔ تمھارے نزدیک جو شراب لذیذ ہے وہی تمھارے لئے زہر قاتل ہے۔ یہ تم کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دے گی۔ تمھاری آدھی عمر کو برباد کر دے گی۔ تمھارے بدن پر کمزوریوں اور بیماریوں کے مسلسل حملے ہونے لگیں گے۔

فرانس کے اسپتالوں میں ۴۰ فیصد بیماریوں کو الکحل کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ نرسنگ ہوموں کے ۵۰ فیصد دیوانے نشہ آور چیزوں کے استعمال سے دیوانے ہوئے ہیں۔ فرانس کے بچوں کے اسپتالوں میں بھی ۵۰ فیصد بچوں کی بیماری ان کے ماں باپ کے الکحل کے عادی ہونے کی وجہ سے ہے۔

فرانس کی عدالتوں کا ۶۰ فیصد خرچ الکحل سے متعلق ہوتا ہے۔ حکومت فرانس کے خزانوں پر ہر سال اسپتالوں، نرسنگ ہوموں، بینکوں کی وجہ سے ۳۲۵ ملیارد کا بار الکحل کے استعمال کی وجہ سے پڑتا ہے۔

الکحل انسانی اموات کی کثرت کا سبب بنتا ہے۔ مردوں میں ۵۵ فیصد، عورتوں

---

[1] مجلہ تندرست شمارہ ۱۲۔ سال ۵۔

ہیں ۳۰ فیصد موتیں الکحل کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ۹۵ فیصد بچوں کے قاتل الکحل کے عادی ہوتے ہیں۔ ۶۰ فیصد ناکارہ و بدکار جوان الکحل کے عادی والدین سے پیدا ہوتے ہیں[1]۔

جرمنی کی عدالت میں ایک سال کے اندر ایک لاکھ پچاس ہزار مجرم محض نشہ آور چیزوں کے استعمال کے بدولت پہنچے۔ اسی طرح ۱۸۷۸ء میں گناہ گار عورتوں کے بارے میں ـــ جن کے گناہ کی وجہ الکحل کا استعمال تھا ـــ جرمنی کی عدالت سے ۵۴۳۴۸ قطعی حکم لگایا گیا جبکہ یہی تعداد ۱۹۱۴ء میں ساٹھ ہزار اکتیس تک پہنچ گئی۔

اٹازونی کے ایک وزیر نے اپنی تقریر میں کہا: امریکہ نے دس سال کی مدت میں ۱۸ ہزار ملیون مشروبات پر خرچ کیا، جس کے نتیجے میں تین ہزار جوانوں کو دارالمساکین، ڈیڑھ لاکھ کو قید خانہ، ڈیڑھ ہزار کو قتل، دو ہزار کو خودکشی، دو لاکھ عورتوں کو بیوہ، اور ایک ملیون بچوں کو یتیم ہونا پڑا۔

مختلف ملکوں کے مخصوص نمایندگان کی تحقیقاتی کمیٹی نے اعلان کیا: اقتصادی لحاظ سے بھی الکحل کے نتائج خطرناک ہیں تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ (شخصی نقصانات کے علاوہ) ۱۲۸ ملیارد کا خرچ حکومت پر پڑتا ہے۔ اس طرح کہ اسپتالوں پر دس ملیارد، تعاون پر ۴۰ ملیارد، عدالتوں و قید خانوں پر ۶۰ ملیار، پولیس پر ۱۷ ملیارد، اس کے علاوہ بھی حکومت کے خزانے پر ۱۱ ملیارد کا خرچ آتا ہے جو خام انگور کے مصرف سے کم ہو جاتا ہے۔ اور الکحل کے فروخت سے صرف ۵۳ ملیون فرانک کی آمدنی فرانس کو ہوتی ہے۔ آپ خود سوچیے، حکومت کو اقتصادی لحاظ سے کتنا نقصان ہوتا ہے[2]۔

چند روز قبل روس میں شراب خواری کی روک تھام کے لئے شدید اقدامات کرنے کا اعلان کیا گیا۔ یہ اقدام روس میں بڑھتی ہوئی شراب خواری کے اثرات کو دور کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

دو ہفتے قبل روس کے نائب وزیر اعظم نے اعلان کیا: روس میں شراب خواری کو روکنے

---

[1] خواندنیہا شمارہ ۷، سال ۲۶ [2] مجلہ تندرست۔ سال ۵۔ شمارہ ۱۲۔

کے لئے بہت جلد اقدام کیا جائے گا۔

رُوس کا اخبار "پراودا" لکھتا ہے: الکحل کے کثرتِ استعمال نے روس میں جرائم ڈیوٹی پر نہ پہنچنے، کارخانوں کے نظم وضبط کی خرابیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ شراب خواری کے خلاف آئندہ اس سے زیادہ سخت اقدامات کئے جائیں گے[1]

حسبِ تحقیق فضائی حادثے زیادہ تر خلابازوں، پائیلٹوں کی مستی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کلیمنٹ کارن گولڈ (Dr CIEMENT KORNGOLD) نے تحقیق کر کے ایک اعداد وشمار جمع کیا ہے جو ہوائی حادثوں کے بارے میں نشان دہی کرتا ہے۔ ڈاکٹر گولڈ کہتے ہیں امریکہ میں ہونے والے فضائی حادثے خصوصی ہوائی جہازوں، ہیلی کاپٹروں میں بھی بکثرت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر گولڈ تحقیقی مطالعہ، فنی ماہرین کی رائیں، تجارتی و مسافر بردار جہازوں کے گرنے کے اسباب وعلل کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ: ہوائی حادثے زیادہ تر ناگہانی فنی نقص، یا پائیلٹوں کی مستی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ امریکی پائیلٹوں پر ساری دُنیا کے پائیلٹوں کے بہ نسبت زیادہ صادق آتا ہے۔ کیونکہ اب تک جتنے بھی جہاز گرے ہیں اُن کے پائیلٹ زیادہ تر امریکی تھے۔ گرنے والے جہازوں کے پائیلٹوں کے باقی ماندہ جسم کے تجزیئے سے پتہ چلا ہے کہ اکثر الکحل کے عادی تھے۔

جب سے ہوائی حادثوں میں اضافے ہونے شروع ہوئے ہیں ذمہ داروں نے اس کی اصل وجہ معلوم کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ آخر کار اس راز سے پردہ اٹھا کہ آخری سالوں میں جو جہاز گرے ہیں ان کی اصلی وجہ پائیلٹ کی مستی یا عشق بازی تھی۔ اس لحاظ سے آخری سالوں میں ہوائی حادثے الکحل کے استعمال اور عورتوں کی فریب کاری کی وجہ سے زیادہ ہوئے ہیں۔ الکحل کے نقصانات زمین ہی پر کیا کم تھے کہ اب اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ بیچارے بھی جنھوں نے زندگی میں کبھی بھی الکحل کا استعمال نہیں کیا، شکار ہو رہے ہیں[2]

---

[1] اطلاعات شمارہ - ۱۳۱۰۸ [2] خواندنیہا۔ شمارہ ۳۷۔ سال ۲۶ -

آج کی دُنیا میں

زندگی کے تناقضات

تمام چیزوں میں خصوصاً مادی زندگی میں روز افزوں سرمایہ داری اور صنعتی انقلاب کی وسعت نے ایک عمیق شگاف پیدا کر دیا ہے۔ صنعتی ٹیکنیکل ترقی نے بڑے بڑے سرمایوں کو کمپنیوں اور ٹرسٹوں کی صورت میں ایجاد کیا ہے جس کے نتیجے میں کچھ افراد جن کی زندگی افسانوی اور خوبصورت ہے ـــــ تو دنیا کی ہر لذّت سے بہرہ اندوز ہیں - اور نہ صرف یہی کہ خود لذت اندوز ہیں بلکہ انھوں نے اپنے کتّوں، بلّیوں کے لئے بھی زندگی کی تمام سہولتیں مُہیّا کر رکھی ہیں اور اس کے مقابل کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنا پیٹ بھی نہیں بھر پاتے، زندگی کی پہلی ضرورتوں (روٹی، مکان، کپڑا) تک سے محروم ہیں۔

اس عظیم ظلم و ستم نے ـــــ جو آج کی اجتماعی دنیا کا پیدا کیا ہوا ہے ـــــ بیدار مغز مفکّرین کو حد درجے متاثر کیا ہے۔

ماضی میں جو بدبختیاں ایک مختصر سے دائرے میں محدود تھیں آج وہ وسیع تر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئی ہیں۔ آج کتنے ہی افراط و تفرط کے مسائل، تناقض امور نفرت انگیز صورت میں ہمارے سامنے جلوہ نما ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک کی اقتصادی ترقی کے لئے کوشش کرنا نہ صرف یہ کہ تمام انسانوں کے لئے نفع بخش نہیں ہے بلکہ چونکہ یہ ممالک صرف اپنی ترقی کے فکر میں ہیں اسی لئے اس کا نتیجہ بہت سے ملکوں، قوموں کے انحطاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور روز بروز طبقاتی شگاف وسیع سے وسیع تر

ہوتا چلا جا رہا ہے۔

آج دنیا کے بیشتر حصّے میں فقر و فاقہ نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں نشر شدہ اعداد و شمار کے مطابق دنیا کا غذائی مسئلہ دو صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ غیر ترقی یافتہ ممالک کے ۲½ ہزار ملیون انسانوں میں سے پانچ سو ملیوُن انسان کافی غذا نہ ہونے کی وجہ سے زحمتوں میں مبتلا ہیں۔

۲۔ ایک ہزار پانچ سو ملیون کامل غذا نہیں کھا سکتے۔ ان کی غذاؤں میں نقص ہے۔ ڈائریکیٹ یا اِن ڈائریکیٹ سالانہ ۸ ملیون آدمی بھوک، فقر و فاقے سے مر جاتا ہے۔ صرف برازیل میں ناکافی غذا کی وجہ سے سالانہ ۲½ لاکھ بچّے مر جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اِس کی تعداد اور زیادہ ہے۔ امریکہ کے ایک معمولی گھرانے کی بچی ہوئی غذا ہندوستان کے ایک گھرانے کے لئے چار دن تک کافی ہو سکتی ہے[1]

ایسی صورتِ حال میں کچھ ناہنجار قسم کے لوگ قیمتوں پر کنٹرول باقی رکھنے کے لئے مصنوعی قِلّت پیدا کر کے نہایت سنگ دلی اور بے رحمی سے ملیونوں مَن غلّہ جلا دیتے ہیں یا دریا بُرد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اسی برباد کئے جانے والے غلّے سے ملیونوں فقر و فاقہ کے مارے لوگوں کو موت کے چنگل سے بچایا جا سکتا تھا۔ اگر اس قسم کی فضول خرچی اور غیر انسانی افعال کی رُوک تھام کی جائے تو دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے۔ میرے اس دعوے کی دلیل وہ اعداد و شمار ہیں جو اخباروں میں شائع کئے گئے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں امریکہ کے اندر ایک سو پچیس ٹن روٹی برباد کی گئی صرف یہی خوراک پانچسو ملیون ہندیوں کو سال بھر تک کے لئے کافی تھی اور ان کو زندہ رکھ سکتی تھی۔ امریکہ ہر سال لاکھوں ٹن غلہ صرف اس لئے برباد کر دیتا ہے تاکہ اپنا اثر و اقتدار اور لوگوں کی اس کی طرف احتیاج باقی رہے۔ آخری سالوں میں مغربی سرمایہ داری نے دنیا میں گرسنگی کا اضافہ ہی

---

[1] مجلّہ فردوسی مؤرّخ ۲۸، ۷، ۴۸

کیا ہے کمی نہیں کی۔

جب امریکہ غذائی محفوظ ذخیرے کو برباد کرتا ہے تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا کہ گرسنگی کو بڑھاوا دیا جارہا ہے بلکہ دوسرے ملکوں کو اس بات پر مجبور کرنا ہوتا ہے کہ اس کی من مانی قیمت پر غذا کی خرید و فروخت جاری رہے۔ اور اس راہ سے ان ملکوں کے اقتصادیات کو بھی متاثر کرنا چاہتا ہے۔ یہ برباد شدہ ثروت درحقیقت کچھ خود پسند لوگوں کا ہتھیار ہے جس سے وہ ملیوں بے گناہ انسان کو قتل کرنا چاہتے ہیں[1]۔

مشہور فلسفی برٹرانڈ رسل (BERTRAND RUSSELL) لکھتا ہے۔ ۴۰ سال پہلے امریکہ نے اپنے کسانوں سے فاضل گیہوں خریدنے کے لیئے چار ملیارڈ ڈالر منظور کیا تھا۔ امریکہ کے ذخیروں میں ملیونوں ٹن گیہوں، جوار، پنیر، مسکہ برباد کر دیا جاتا ہے تاکہ عالمی منڈی میں قیمتیں گرنے نہ پائیں۔ اب پنیر و مسکہ کے بڑے بڑے پہاڑ زنگ کر غیر قابل استعمال بنا دیئے جاتے ہیں تاکہ لبنیات کی قیمت گرنے نہ پائے۔

اگر یہی صورت حال رہی تو آئندہ یہ دھماکہ بھی بن سکتی ہے البتہ اگر زندگی کے فارمولے ہی بدل جائیں تو بات اور ہے۔ اس شیطانی ننگ فعل کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ فقر و فاقہ عام ہو جائے اور اخلاق و ایمان کا خاتمہ ہو جائے۔

مشہور فلسفی اے سوروکین (A: SOROKIN) لکھتا ہے: فنی، صنعتی، ٹکنیکی ترقی کے باوجود ہم پہلے زمانوں کے لحاظ سے کہیں زیادہ اخلاقی و انسانی فقر کا احساس کر رہے ہیں صنعتی ترقی والے ممالک کا معاشرہ تنگدست و عقب ماندہ معاشرے سے اخلاقی برتری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آج کا تمدن تناقض و تضاد سے بھرا ہے۔ گفتار میں تناقض، کردار میں تناقض پندار میں تناقض، احساس و اندیشے میں تناقض، غرض ہر جگہ تناقض ہی تناقض ہے۔

یوں تو یہ لوگ اپنے بلند بانگ دعوے میں تمام انسانوں کی برابری کا دعویٰ کرتے

---

[1] روشن فکر ش۔ ۷۱۹

ہیں۔لیکن عملاً ہر قسم کا امتیاز برتتے ہیں۔ اخلاقی، فکری، مذہبی، اقتصادی، سیاسی، رُوحانی اجتماعی، خاندانی نابرابری پر زور و شور سے عمل کرتے ہیں۔ دعویٰ تو یہ ہے کہ انسان پر انسان کی حکومت انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ہے۔ اور اسی دعوے کو اپنا سیاسی حربہ بنالیا ہے لیکن عملی طور پر شخصی حکومت اور ڈکٹیٹری کرتے ہیں۔ زبانی ہر شخص کی کامیابی و خوش بختی کے خواہاں ہیں۔ لیکن عملاً ناکامی شکستگی، بدبختی کے احساس کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ مادی تمدن خود پرستی، خود خواہی پر لعنت کرتا ہے اور دیگر خواہی اور معاشرے کی فلاح کے لئے دوسروں کو آمادہ کرتا ہے۔ حالانکہ خود فریبی، دوسروں سے بے اعتنائی، فردی و اجتماعی قسموں میں ظلم و جور، تاجرانہ ذہنیت ہمجنسوں پر تفوق پسندی ہر زمانے کے بہ نسبت آج کل کہیں زیادہ ہے[1]۔

ترقی یافتہ ممالک ۲۵ فیصد ہو کر بھی دنیا کے ۸۰ فیصد سرمائے پر قابض ہیں اور پسماندہ ممالک ۷۵ فیصد ہوتے ہوئے بھی صرف ۱۵ فیصد عالمی سرمائے پر قانع ہیں۔ یہ فاصلہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی جائے گا۔ انہیں دولت مند ملکوں کے محدود افراد کے ہاتھ میں بڑی بڑی سرمایہ کاری ہے۔ امریکہ کی پارلیمانی تحقیقاتی کمیٹی نے ۱۹۴۶ء بتایا تھا: صرف امریکہ کی پانچ فیصد بڑی کمپنیاں کلی سرمایہ کے ۸۰ فیصد سے زیادہ پر قابض ہیں اور ۶۰ فیصد سے زیادہ صنعتی کاریگر ان کے پاس ہیں اور تمام کارخانوں کے خالص ۸۸ فیصد سود پر ان کا قبضہ ہے[2]۔

اقوام متحدہ کے زراعت و خوراک کے صدر کہتے ہیں: ابھی دنیا کی ۲/۳ آبادی برابر گرسنگی کا شکار ہے۔ اور تقریباً ۱½ ملیارد انسان اس وحشت ناک اجتماعی بلا سے چھٹکارا پانے کے لئے معقول وسیلہ نہیں رکھتے[3]۔

جوزڈی کاسٹرو (JOSE DE CASTRO) نے دنیا کے ملیونوں انسانوں کی گرسنگی کی علت بیان کرتے ہوئے کہا: میں نے ایک مرتبہ سابق رئیس جمہوریہ ٹرومین (TRUEMEN) سے گفتگو کی اور میں نے ان سے کہا امریکہ کا غذائی و زراعتی مسئلہ ایک بین المللی

---

[1] خداوند دو کعبہ صفحہ ۱۴۵-۱۴۶ [2] مشہور ماہر سیمنیل کویگ (SAMNELKOEUIG KOEUIG) صفحہ ۱۵۷
[3] انسان گرسنہ ژوزو تبہ دو کاستروش ۸ صفحہ ۲۶

مرکز کے ہاتھ میں دے دیا جائے جو دنیا کے فاقہ زدہ افراد میں ضرورت کے مطابق اشیائے خوردنی کو تقسیم کر سکیں۔ انھوں نے کہا: میں رئیس جمہوریہ امریکہ ہوتے ہوئے اس پیشکش کی تائید نہیں کر سکتا، کیونکہ سیاسی اغراض سے بالا ہو کر کسی کی مدد نہیں کی جا سکتی

—:(☆):—

موجودہ تمدّن کی وحشت گری

اگرچہ کچھ ماہرینِ معاشرہ کی رائے یہی ہے کہ انسان کی زندگی سے جنگ کی جُدائی ناممکن ہے۔ انسانی زندگی کا ہمیشہ سے تصادم و خونریزی سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے لیکن محققین نے اس رائے کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جنگ کا انسانی زندگی سے الگ ہونا ناممکن نہیں ہے بلکہ یہ تو اخلاقی بے راہ روی اور اجتماعی و اقتصادی بدحالی سے پیدا ہونے والی چیز ہے۔ اس لئے فطرتِ بشری سے الگ ہو کر جنگ کے علل و اسباب کی تلاش ضروری ہے۔ صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کو انسانی زندگی سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ اور معاشرۂ انسانی کو جنگ سے ہونے والے ناقابل تلافی نقصانات سے بچایا جا سکتا ہے علاوہ اس کے ہمارے اس قرن کو جو علم و دانش کی درخشندگی کا نصیب ملا ہے وہ کچھ لوگوں کی تو سعی طلبی، مادی مطامع، میلانِ نفسانی کی سیری کی خاطر تاریخ بشر کی غیر انسانی ترین جنگ کا نمونہ بن گیا ہے۔ بیسویں صدی کی گذری ہوئی تین چوتھائی صدی پر اگر ہم ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ زمانہ جنگوں اور حوادثات کے سیاہ کارناموں سے بھرا ہوا ہے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اس مدّت میں ہونے والے جنایات تاریخ بشر میں ہونے والے جنایات سے زیادہ ہیں۔

مغربی دنیا جس کے یہاں صنعتی وسائل کی بھرمار ہے اور جو ایٹمی ہتھیار سے مسلّح ہے وہ اپنی دانش کے زور پر انسان کو خاک و خون کی طرف کھینچ رہی ہے۔ روئے زمین کے آباد حصّوں کو ویرانہ بنائے دے رہی ہے۔ مغرب کی اس بداخلاقی اور کج فکری

کی وجہ سے مظلوموں کے نالے آسمان تک بلند ہیں۔

اِستعماری حکومتوں کے مفاد کے ٹکراؤ سے ہونے والی دو عالمی عظیم جنگوں نے بشریت کے لئے نہایت تکلیف دَہ اور منحوس نتائج پیدا کئے ہیں۔ ان جنگوں کی جنایت قساوت، بیرحمی کے داغ کو اس منور صَدی کے دامن سے کسی طرح نہیں دھویا جاسکتا ان جنگوں کے خوفناک اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے۔

پہلی عالمی جنگ ۱۵۶۵ دن تک ہوتی رہی۔ اس جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۹ ملیون سے زیادہ، ناقِص از کار رفتہ ہونے والوں کی تعداد تقریباً ۲۲ ملیون، مفقود الاثر ہوجانے والوں کی تعداد ۲۵ ملیون بتائی جاتی ہے۔ یہ اعداد و شمار تو میدانِ جنگ کے ہیں لیکن شہروں میں مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد میدانِ جنگ سے کہیں زیادہ ہے۔

اس جنگ کا خرچ ۴ لاکھ ملیون ڈالر ہوا ہے۔ اس خرچ ہونے والی رقم سے انگلستان، آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ، بلجیک بلجیم، روس، امریکہ، جرمنی، کناڈا، آسٹریلیا کے ایک ایک عزّت مند گھرانے کے لئے اپنی تمام لوازمات کے ساتھ ایک ایک مکان بنایا جاسکتا تھا۔[1]

پہلی عالمی جنگ اپنے نقصانات و خساروں کے ساتھ تمام ہوگئی لیکن واپس ہونے والوں اور باقی رہ جانے والوں کے نالے ابھی ختم نہیں ہوئے۔ ابھی ویرانے آباد بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بادل سروں پر منڈلانے لگے۔ اور تھوڑی ہی مدّت میں اُس نے دُنیا والوں پر آگ و خون کی بارش شروع کردی۔

دوسری عالمگیر جنگ میں ۳۵ ملیون قتل ہوئے، ۲۰ ملیون ہاتھ پاؤں سے معذور ہوگئے۔ ۱۷ ملیون لیٹر خون زمین پر بہایا گیا۔ ۱۲ ملیون حمل ساقط ہوئے۔ اِس

---

[1] جہان در قرن بیستم۔

جنگ میں ۱۳ ہزار پرائمری و متوسطہ، ۶ ہزار یونیورسٹیاں، ۸ ہزار لیبارٹریاں ویران و برباد ہوگئیں۔ ۳۰ لاکھ نوے ہزار گولے فضا میں پھٹے۔

امریکہ و جاپان کی جنگ میں ۱۹۴۵ء میں امریکہ کی طرف سے دو چھوٹے ایٹم بم پھینکے گئے۔ ایک بم "ہیروشیما" پر اور تین دن کے بعد دوسرا بم "ناگاساکی" پر پھینکا گیا۔ ہیروشیما میں ۷۰ ہزار انسان یکدم سے ختم ہوگئے اتنے ہی زخمی ہوئے اور "ناگاساکی" میں ۴۰ ہزار افراد مقتول ہوئے اتنے ہی زخمی ہوئے۔ مکانات برباد ہوئے۔ بچے اور حیوانات تک اس جنگ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔ پانچ دن کے بعد جاپانی بلا کسی شرط کے امریکہ والوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔ دوسری جنگِ عظیم کی خبر آخری وقت میں اخباروں میں اس طرح چھپی تھی۔

روس نے امریکہ کے کارخانوں سے یہ خواہش کی ہے کہ ۴ ملیون پیر بنا دے جو جنگ میں لنگڑے لولے ہو جانے والے فوجیوں کے لگائے جائیں گے۔ اس خبر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جنگ میں کتنے اعضاء برباد ہوئے ہوں گے۔!

یہ بات ملحوظ رہے کہ روس نے اپنے کارخانوں میں پیر کا آرڈر دینے کے علاوہ امریکہ سے اس تعداد کو طلب کیا ہے۔ کیونکہ روس کے کارخانے مطلوبہ تعداد میں پیر بنانے سے عاجز تھے اس لئے امریکہ سے مدد بھی چاہی گئی۔ اس مانگ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنے نفوس ہلاک ہوئے ہوں گے اور کتنے اعضاء ناقابلِ اصلاح ہوگئے ہوں گے۔ روس کے علاوہ دیگر یورپی ممالک کے کتنے افراد قتل ہوئے ہوں گے۔ یہ ساری مصیبتیں جنگ کی دین ہیں۔

اگست ۱۹۵۴ء میں ہیروشیما و ناگاساکی پر جو بم گرا تھا وہ ۲۳۵ واحد یورونیم اور ۲۳۹ واحد پلاٹینم اور ۳۳۵ ہزار پھٹنے والے مادوں کا مجموعہ تھا۔ ایک عام ایٹم بم ہیروشیما پر گرنے والے بم سے پانچ ہزار گنا زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور ایک ہیڈروجن بم ایٹم بم سے

پانچ ملیون گنا زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ نیویارک، پیرس، لندن، ماسکو، کو خاک میں ملانے کے لئے ایک بم کافی ہے۔ بموں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ پائیلٹ ہوائی جہاز کے ذریعے گرائے، بلکہ خود کار راکٹ دو ہزار میل تک جہاں چاہیں بم پھینک سکتے ہیں۔ ہر ایٹمی تجربہ تقریباً سات ہزار میل کو متاثر کر دیتا ہے۔

شیمی واں ڈاکٹر لینس پولینگ (DR. LINUS PAULING) کی تحقیق کیمطابق امریکہ کے اس ڈاکٹر نے نوبل پرائز حاصل کیا ہے۔ میگاٹنی بموں کا خطرہ ایسا ہے کہ دس ہزار میگاٹن بم سے جنگ کے ایک گھنٹے کے اندر کثیر آبادی والے ۷۵ ایلیون شہروں کے باشندوں کو تباہ و برباد کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فعلاً امریکہ کے پاس ۲۴۰ ہزار، روس کے پاس ۸۰ ہزار، انگلستان کے پاس ۱۵ ہزار میگاٹنی بم ہیں۔

امریکی فوج کا افسر نیومن (NEUMANN) آئندہ ہونے والی جنگ کے بارے میں لکھتا ہے: آئندہ ہونے والی جنگ کی تباہیاں صرف فوجیوں تک محدود نہیں رہیں گی بلکہ تمام دنیا کے خاتمے پر اس کا خاتمہ ہوگا۔ عورتیں اور بچے بھی اس جنگ کے اثرات سے محفوظ نہ رہیں گے۔ کیونکہ علم فیزیا کے ماہرین نے انسانی سپاہیوں کے بجائے جنگی وظائف، بے شعور اسلحوں کے تصرّف میں کر دیا ہے اور یہ جنگی اسلحے جنگجو اور غیر جنگجو سپاہیوں میں کوئی فرق نہیں جانتے۔

آج دشمن کو میدانِ جنگ یا قلعے میں گھس کر قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ دشمن کو برباد کرنے کے لئے شہروں اور دیہاتوں پر حملے کئے جاتے ہیں کیونکہ آج کے نظریہ کے مطابق دشمن کی اصلی قوّت فوج نہیں ہے بلکہ پُر رونق تجارتی منڈیاں، بھرے پُرے آباد شہر، کارخانے، ان میں قوّت چھپی ہے۔ اس لئے اگر جنگ ہوئی تو پہلے ان مقامات پر بم مارے جائیں گے۔ ایسے ایسے بم پھینکے جائیں گے جن سے پھٹنے والے مادّے، زہریلے گاز، بیماری پیدا کرنے والے میکروبات ظاہر ہوں گے۔

یہ دونوں عالمی جنگیں جنھوں نے اپنی بدبختی کا منحوس سایہ لوگوں کے سروں پر پھیلایا اور دنیا کو گردابِ بلا میں ڈال دیا۔ ان کا اثر مغربی ملتوں کے افراد پر کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایسے اخلاق جو مادی دولت، اور الکحل سے مست ہو چکے ہیں ان میں کوئی تغیّر نہیں ہوا۔ اور نہ ان لوگوں نے ان دونوں جنگوں سے کوئی اثر قبول کیا۔ اِس دور میں روزانہ کہیں نہ کہیں جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ اور یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ جنگ عالمی جنگ نہ ہو جائے جس کے نتیجے میں مدنیت و انسانیت کا خاتمہ ہو جائے۔

آج کی متمدّن دنیا بہترین ذخائر فکری، قوّتِ بدنی اور وہ عظیم سرمایہ جس کو عوام کی آسائش و فلاح کے لئے خرچ کرنا چاہیئے تھا اسے ہلاکت کے خطرناک ترین وسائل میں صرف کر رہی ہے کیونکہ نت نئے ایجاد ہونے والے اسلحے جن پر معقول قومی سرمایہ خرچ ہوتا ہے یہ بازیچۂ اطفال تو نہیں ہیں۔

انگریزی مشہور فلسفی برٹرانڈ رسل (BERTRAND RUSSELL) کہتا ہے آج کی حکومتیں جو راکٹ اور مصنوعی چاند کرّہ چاند اور دیگر کرّات تک بھیجنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں ہیں اس کا نتیجہ دنیا کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اگر گذشتہ جنگیں اپنی غارت گری، آدم کشی کے باوجود معاشرے کے ضروریات میں سے تھیں تو آج کی جنگ و خونریزی معاشرے کی ترقی و پیش رفت کو ختم کرنے والی ہے، اور بہت جلد بدبختی و اضمحلال کے اسباب پیدا کر کے بشریت کو نیست و نابود کر دینے والی ہے۔ آج کی دنیا میں "تولیدات اقتصادی" کی دوڑ خود بھی معاشرے کے نابود کرنے کا ایک سبب ہے۔

رسالہ "تحقیقات اقتصادی" لکھتا ہے۔ دنیا نے بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جو چار ہزار میلیارڈ ڈالر اسلحہ سازی و جنگ پر خرچ کئے ہیں، اسی رقم سے پچاس سال تک تمام دنیا کے لوگوں کو مفت غذا کا مہیّا کرنا ممکن تھا، اور پانچ سو ملیون (یعنی دنیا

کی آبادی کا ۱/۲ حصہ) لوگوں کے لئے مکان بنایا جاسکتا تھا۔

آج جس دنیا میں ہم جی رہے ہیں اس کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف دنیا کی آبادی کا ۱/۲ حصہ گرسنگی یا قلت غذا کا شکار ہے، اور وہ ابھی تک بے سواد ہیں۔ اور دوسری طرف سالانہ ۱۲۰ میلیارد ڈالر عسکری نظام پر خرچ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر گزرنے والے دن میں ۳۵۰ ملیون ڈالر (یعنی دو ملیون آٹھ سو روپے سے کہیں زیادہ) تخریبی کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔ دنیا کے ماہر ترین اقتصادی عالم کے قول کے بموجب یہ دنیاوی حکومتوں کو حاصل ہونے والے منافع کا ۱/۲ حصہ ہے۔ یہ رقم دنیا کے مال تجارت سے حاصل ہونے والے سالانہ منافع کے برابر ہے۔ یہ رقم دنیا میں ہر سال جمع ہونے والے سرمایہ کا نصف ہے۔

ساری دنیا کے مزدوروں کی طرف سے حاصل ہونے والی اطلاع کے مطابق ۷۰ فیصد لوگ کسی نہ کسی طرح جنگی کاموں کے لئے کام کرتے ہیں۔

آج کی دنیا میں تخریبی اسلحوں کی تعداد حیرت ناک ہے۔ یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو کامیابی کا مفہوم تشنہ وجود رہ جائے گا کیونکہ اس جنگ میں غالب و مغلوب کا وجود ہی نہ ہوگا اور بہت ہی مختصر مدت میں انسانیت پر فاتحہ پڑھا جاسکتا ہے۔

مشہور روسی فلسفی پیٹریم اے سوروکین (PET RIM-A-SOROKIN) کہتا ہے:
آج کی دنیا میں بنیادی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ سرمایہ داری بہتر ہے یا کمیونزم، نیشنلزم (NATIONALISM) بہتر ہے یا انٹرنیشنلزم (INTER-NATIONALISM) بلکہ بنیادی مسئلہ فرہنگ مادی کی جگہ پر کون سا نظام آنے والا ہے جیسا کہ میں متعدد بار کہہ چکا ہوں کہ ہمارا زمانہ، زمانہ برزخ ہے یہ انتقال وتحول سے بچ نہیں سکتا۔

پہلی دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں بار ہا سنا گیا کہ ہر گروہ اس بات کا

مُدعی تھا کہ اگر دُوسرا گروہ درمیان سے ہٹ جائے تو آرام وسکون مل جائے گا۔ پہلی عالمگیر جنگ میں بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اگر جرمنی کا بادشاہ قیصر ولہیلم (KAISER-WILHELM) درمیان سے ہٹ جائے یا انگریز کا خاتمہ ہو جائے تو جنگ ختم ہو سکتی ہے دوسری جنگِ عظیم میں بھی یہی تصوّر تھا کہ اگر ہٹلر نہ ہوتا، یا استعفیٰ دے دیتا، یا مر گیا ہوتا یا چرچل کو سکتہ ہو جاتا، یا مسولینی پیدا نہ ہوتا، یا ہیروہیٹو (HIROHITO) جاپان کے تختِ خدائی سے اتارا جاتا، یا اسٹالین کی جگہ ٹروٹسکی رُوس کا حاکم ہوتا تو سارے کام بخیر وخوبی ہو جاتے، دِلی مُرادیں پوری ہوتیں اور جنگ کی ابتدا ہی نہ ہوتی۔ اب ذرا سوچئے کہ ان میں سے کوئی نہیں ہے سب مر چکے ہیں لیکن بحرانی کیفیت اور جنگ اسی طرح باقی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قیصر ولہیلم (KAISER WILHELM) ہٹلر، مسولینی، چرچل، اسٹالین یہ لوگ وہ نہیں ہیں کہ بیسویں صدی کے بحران کو انھوں نے پیدا کیا ہو بلکہ اس بحرانی دَور نے اِن لوگوں کو جنم دیا ہے۔ اگر یہ نہ بھی ہوتے تو دوسرے بہت سے ہٹلر، مسولینی، اسٹالین روزویلٹ، چرچل پیدا ہو جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اِن سے زیادہ سخت ہوتے۔

یہ سب تو درحقیقت اس کثیف بدن کے پھوڑے ہیں جس کا خون کثیف ہو چکا ہے۔ اس قسم کے پھوڑوں کو ختم تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی جگہ پر دوسرے پھوڑے پیدا ہو جائیں گے۔ اِن کا صحیح علاج یہ ہے کہ بدن کے کثیف خون کا علاج کیا جائے[1]

آج کی دنیا ایک طرف تو حیوانات پر ظلم وتعدّی کو روکنے کی خاطر "انجمن حمایت از حیوانات" بناتی ہے۔ بیماریوں کو دُور کرنے کے لئے مصنوعی قلب تک کا سہارا لیتی ہے اور دوسری طرف شب وروز لوگوں کے سروں پر بم پھینکتی ہے، اور جدید وگندے ہتھیاروں سے لوگوں کا گروہ در گروہ خاتمہ کر دیتی ہے۔ یورپین کی "عالمی سوسائٹی" جو اپنے کو حقوقِ بشر کی حفاظت کا ذمّہ دار، ستمگروں کا دشمن، مظلوموں کا حمایتی بتاتی ہے اس کی نظروں کے سامنے

---

[1] خداوند دو کعبہ صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱

ہزاروں انسانی جانیں قِلّت غذا یا گرسنگی کا شکار ہو رہی ہیں یا پھر متضاد سیاستوں کی پیدا کی ہوئی جنگ کے شعلوں میں جل رہی ہیں اور یہ سوسائٹی تماشہ دیکھ رہی ہے۔

کیا یہ حقوقِ انسانی کی دفاع کے نام پر بننے والی مختلف قسم کی کمیٹیاں اور ان کمیٹیوں کے بعض ممبران کا جنگ کی بُرائی کرنے کے باوجود خود یہی لوگ آتشِ جنگ کو بھڑکانے والے نہیں ہیں؟ کیا وہی لوگ جو ہر قسم کے اختلاف کو ڈپلومیسی راستے سے حل کرنے کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اور برابر دنیا کی صلح کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں۔ یہ وہی نہیں ہیں کہ جو دوسروں پر ہر قسم کے ظلم و ستم کو روا نہیں رکھتے؟ ایسے ایسے ظلم جو انصاف اور انسانیت کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔

عیسائیوں کے مذہبی پیشوا دنیا کو خوش کرنے کے لئے دین کے نام پر جو تبلیغ کرتے ہیں اور صلح خواہی اور جنگ جُوئی و خونریزی کی بُرائی کرتے رہتے ہیں اور اس حربے کا ہر وقت اور ہر جگہ چرچا کرتے رہتے ہیں۔ کیا یہ کسی اساسی بنیاد پر ایسا کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں! صلح خود بخود کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگر واقعاً جنگ و خونریزی نہیں چاہتے تو جنگ و خونریزی کے اسباب و علل کا قلع قمع کرنا چاہیئے۔

ابھی تو یورپ کے بوڑھے کلیسائی روم کی ننگین سازش اور نازی ازم (NAZIAZM) اور فاشیزم (FASCISM) کے ظلم و ستم کو بھی نہیں بھول سکے۔

نسلی امتیاز

"نسلی برتری" کی تھیوری جس کے بعض اہلِ فلسفہ یا بعض منکرین قائل ہیں۔ وہ ملتوی کی مساوات و برابری کی قائل نہیں ہے۔ نسلی برتری کے طرفدار یہ چاہتے ہیں کہ بہترین و طاقتور نسل کو دنیا میں حکومت کرنی چاہیئے اور کمزور و پست اقوام کو ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنی چاہیئے۔ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ ایسا طرزِ فکر حیاتِ بشری کے اصول سے میل نہیں کھاتا اور شخصی و اجتماعی آزادی کے اصول کے بالکل خلاف ہے۔ علمی و تاریخی نقطۂ نظر سے بہت سے معاصر اہلِ فلسفہ و محققین نسلی برتری کو امرِ موہوم و خود ساختہ و بے بنیاد سمجھتے ہیں۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ بعض محققین اس قانون کی بنا پر کہ ـــــ ابھی تک خالص نسل نہیں دیکھی گئی اور نہ کسی علمی تحقیق نے نسلی امتیاز کو مکمل واضح کیا ہے ـــــ آریائی نژاد کے قائل نہیں ہیں اور اس کو ایک افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اور نہ کسی طرح یہ بات ثابت ہو سکی ہے کہ تاریخ میں واقعاً کوئی آریائی نژاد قسم کی چیز موجود تھی۔ صرف آریائی زبان کا وجود ثابت ہے "مگر آریائی نسل نہیں ثابت ہو سکی" اور عموماً یہ بات دیکھی گئی ہے کہ بہت سی نسلیں ایک ہی زبان بولتی ہیں[1]

دوسری عالمی جنگ کے منجملہ اسباب میں ہٹلر کی جرمنی میں فلسفہ نیشنل سوشیلزم (NATIONAL SOCIALISM) کا ظہور تھا جس کی بنیاد ہی "نسلی برتری" پر رکھی گئی تھی۔ ہٹلر کا

---

[1] تاریخ ادیان۔ صفحہ ۲۱۹۔

اصلی مقصد جرمنی کی وسعت اور یورپ کے مرکز میں ایک نہایت طاقتور، مقتدر جرمنوں کی حکومت کا قیام تھا۔ اس منحوس نے اپنی جابرانہ حکومت میں نمائندگانِ ممالک کا اجتماع کر کے اور وسیع تر تبلیغ کر کے قومی طاقتوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اور اس بہانے سے جذبۂ ہوسِ ملک گیری کو سکون پہنچایا۔

ڈاکٹر گستف لی بان (Dr: GUSTAF LEBON) لکھتا ہے، ایک اہم بات جس نے معاشرے کو برباد کیا وہ یہی "نسلی برتری" کا عقیدہ تھا۔ گذشتہ حکامِ وقت اس عقیدے کے پکے حامی تھے اور ان کی سیاست کا محور یہی عقیدہ تھا۔ انجام کار خونی کشمکشوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور بے انتہا وطیرانیت پر جا کر ختم ہوا۔

اس عقیدے کو ضرورت سے زیادہ تقویت اس خیال سے پہنچی کہ غیروں کے حملوں سے محفوظ اور قوی تر وہی ملت و قوم ہو سکتی ہے جس کی زمین زیادہ ہو اور جس کی تعداد زیادہ ہو، حالانکہ ایسی قومیں غالب ہونے کے بجائے مغلوبیت سے بہت قریب ہوتی ہیں[1]

دنیا کے متمدن ترین ملکوں میں یہی طرزِ فکر ـــــ یعنی گورے کو کالے پر برتری ہے۔ اب بھی زیادہ تر ذہنوں میں راسخ ہے۔ گہوارۂ تمدن میں سیاہ رنگ جرم ہے۔ اور عملی طور سے کالے بہت سی جائز آزادی اور حقوقِ انسانی سے محروم ہیں۔ امریکہ کے بعض مقامات پر قانوناً کالا آدمی گورے سے شادی نہیں کر سکتا اور نہ مدرسہ، یونیورسٹی، اسپتال وغیرہ میں گوروں کے ساتھ رہ سکتا ہے بلکہ دونوں کے لئے الگ الگ مدرسے، الگ الگ اسپتال قائم کئے گئے ہیں۔ گوروں کے مجمع عام، مہمان خانوں، اور کھانے کے کمروں ڈائننگ ہال میں سیاہ پوستوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ عام بسوں اور کاروں میں کالے ایک برتھ پر گورے کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ انتہائی شرمناک بات یہ ہے کہ بعض گرجاؤں میں کالوں کو مذہبی مراسم ادا کرنے کا حق نہیں ہے۔

---

[1] میانی روحی تطور ملل صفحہ ۱۹۴

امریکہ کے سابق رئیس جمہوریہ نے فروری ۱۹۶۳ء میں نمائندگان ممالک کی کانفرنس میں اعلان کیا: بلا کسی تخصیص کے امریکہ میں ہر جگہ گورے بچوں کے مقابلے میں نصف کالے بچوں کو یہ حق ہے کہ وہ تعلیم حاصل کریں اور گوروں کے مقابلے میں ایک تہائی کو یہ حق ہے کہ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کریں اور اسی طرح ایک تہائی کو حق ہے کہ کسی فن میں اسپیشلسٹ بنیں اور دو تہائی کو حق یہ ہے کہ وہ بیکار رہیں۔

رسالہ "اخبار و گزارشہای جہاں" لکھتا ہے: امریکہ میں گیارہ مقامات پر کالے حق رائے دہی، حق تعمیر مکان، ریسٹورنٹ میں آزادی، دوکانوں کی آزادی سے محروم ہیں یعنی مختصراً زندگی کے ہر شعبے میں ان کو محروم رکھا گیا ہے۔ الاباما، می سی پی، اور اسی طرح جنوبی امریکہ وغیرہ کے تمام مدارس میں نمونے کے طور پر بھی ایک سیاہ پوست نہیں ملے گا۔

۱۹۵۴ء میں جب امریکی پارلیمنٹ نے رائے دی کہ سیاہ پوست بھی مدارس میں گوروں کی طرح برابر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں تو صرف چار فی صد سیاہ پوست طلاب کو گوروں کے مدارس میں قبول کیا گیا اور بہت سی جگہوں پر سیاہ پوست کے نام لکھوانے پر جنگ و جدال کی نوبت آگئی اور پولیس کو دخل دینا پڑا۔[1]

گوروں نے سیاہوں پر ایسے ایسے ظلم و ستم کو جائز قرار دے رکھا ہے جس سے قرون وسطیٰ کی تباہ کاریاں اور ظلم و ستم یاد آجاتے ہیں۔

عالمی حقوق انسانی کی حفاظت کرنے والی کمیٹی بھی اس ظلم و ستم کو ختم نہ کر سکی۔ تسخیر فضا کے اس دور میں بھی دنیا قومی تعصب اور نسلی برتری کی آگ میں جل رہی ہے اور انسانی رنگوں کے اختلافات کو سرسام آور حد تک محفوظ رکھا ہے۔

مشہور فلسفی اے سوروکین (A. SOROKIN) کہتا ہے: میں اس شعر کا شدت سے مخالف ہوں کہ: مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، یہ دونوں ایک جگہ اکٹھا ہی نہیں ہو سکتے! آخر کیوں؟

---

[1] تہران مصور شمارہ ۱۱۷۴

انسانوں میں کیا فرق ہے؟ حضرت مسیحؑ نے دو ہزار سال پہلے یہ پیغام دیا تھا: فضیلت و انسانیت کا دارومدار نیت، عملِ نیک، اور محبت پر ہے۔ اور ہم بیسویں صدی کے متمدن لوگ انسانوں کی فضیلت و برتری کو خون و رنگ میں منحصر سمجھتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں ہٹلر بہت بُرا تھا کہ نسلی برتری کا قائل تھا۔ لیکن آج ہم جدھر دیکھتے ہیں اُدھر ہی چھوٹے چھوٹے ہٹلر بھرے ہیں، اگر ان کا بس چلے تو نازیوں کے خدائے مرحوم یا ملعون کو بھی سفید کر دیں، ذرا جنوبی افریقہ کو دیکھئے، خود ہمارے امریکہ کو دیکھئے ہر جگہ نسلی برتری موجود ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ویت نام میں ہونے والی ہماری جنگ بھی "نسلی جنگ" ہے جس کا محرک مغربی گوروں کا زرد ایشیائی لوگوں پر احساسِ برتری ہے[1]

جنوبی افریقہ کی تین چوتھائی (۳/۴) آبادی کالوں پر مشتمل ہے اس کے باوجود گورے اپنی نسلی برتری کو نہایت شدّت و سختی کے ساتھ باقی رکھے ہیں۔ اس ملک میں نسلی برتری "جو اپارٹیڈ کے نام سے مشہور ہے" اسی قاعدے پر مبنی ہے جس نے کالوں اور گوروں میں کامل جسمانی جُدائی پیدا کر رکھی ہے۔

اِس قانون کی بناء پر گورے، ہندی کالے مہاجر سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے شناخت ناموں میں یہ بات تحریر کر دی جاتی ہے۔ جنوبی افریقہ کے رہنے والوں کا شناخت نامہ ان کی شخصیت کا یقین کرنے کے ساتھ ان کی قومیت کو بھی بتاتا ہے۔ مختلف نسلوں کے لوگ مختلف بسوں، ریلوں میں سفر کرتے ہیں۔ گرجاؤں میں، ہوٹلوں میں الگ الگ جاتے ہیں۔ ٹیکسی اسٹینڈ، ٹیلیفون بوتھ سے الگ الگ استفادہ کرتے ہیں۔ الگ الگ اسپتالوں میں علاج کراتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ الگ الگ قبرستان میں دفن ہوتے ہیں۔

اس ملک میں "کالے" "گورے" کی شادی ممنوع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو شدید ترین سزائیں دی جاتی ہیں۔ گوروں کے ایریا میں کالے کوئی فنی کام انجام نہیں دے سکتے۔

---

[1] خداوند دو کعبہ۔ صفحہ ۱۹۸

بلکہ بہت ہی معمولی کاموں پر بہت کم مزدوری پر کام کرتے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں نسلی طبقہ بندی بھی ایک اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس طبقہ بندی کی وجہ سے اس کی آزادی اور اختیارات کے حدود معین کئے جاتے ہیں کہ کیونکر اور کہاں زندگی بسر کرے۔ کس کے ساتھ شادی کرسکتا ہے اور کس قسم کا کام کرسکتا ہے اور کیسی تعلیم و تربیت سے فائدہ اٹھاسکتا ہے۔ کبھی کبھی اس ملک کے قید خانوں میں نیم ملیون قیدی ہوجاتے ہیں۔

کالوں کی قسمت کا فیصلہ گوروں کے رحم و کرم پر ہے کوئی قانون ان کی حمایت نہیں کرسکتا۔ ملکی اخباروں میں عدالت کا ایک فیصلہ شائع کیا گیا تھا جس کو ہم یہاں درج کررہے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے ایک شہر میں ایک سفید پوست خاندان میں کالی لڑکی پیدا ہوگئی تو جنوبی افریقہ کی عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ ایک کالے کو گوروں کے خاندان کا فرد بننے کا حق نہیں ہے۔ اس لئے اس لڑکی کو اس خاندان سے نکال دیا جائے اور کالوں کے محلہ جوہانسبرگ (JOHANS-BERG) میں رہنے پر مجبور کیا جائے۔ عدالت نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ لڑکی ملازمہ کی حیثیت سے اپنے باپ کے گھر کام کرسکتی ہے۔ لڑکی کے والدین اس فیصلے سے مبہوت ہوگئے اور اس کے باپ نے کہا: اگر میں اپنی لڑکی کا حق دلانے میں ناکامیاب ہوگیا اور جنوبی افریقہ کی ہائی عدالتوں نے بھی اس غیر انسانی فیصلے کو نہ بدلا تو بیرونِ ملک کے جو لوگ اس لڑکی کو قبول کرنے پر تیار ہوں گے میں ان کے سپرد کردوں گا۔[1]

شارپ ولے (SHARPVILLE) کا حادثہ جنوبی افریقہ کے گوروں کی کالوں پر ظلم و ستم کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ "شناخت نامہ کو ہمراہ رکھنا ضروری ہے"۔ اس حکم کے خلاف جنوبی افریقہ کے چند شہروں میں مظاہرے کئے گئے۔ کچھ افریقی بہت آرام و اطمینان سے شارپ ولے میں ایک تھانے کی طرف سے گزرے۔ پولیس نے شناخت نامہ نہ ہونے کے جرم میں گرفتار کرنے کے بجائے گولی چلادی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۹ آدمی قتل ہوگئے اور ۱۸۰ آدمی شدید زخمی ہوئے۔[2]

---

[1] کیہان۔ شمارہ ۷۰۱۳ [2] اطلاعات شمارہ ۱۳۱۴۹

آخر اس خلافِ انسانیت اور وحشیانہ رفتار کا کیا نام ہے؟ کس عاطفہ بشری سے اس کو الہام ہوتا ہے؟ اس قسم کے اعمال سے غلامی کے علاوہ کسی اور چیز کا تصور ہو سکتا ہے؟ ایک جماعت کا دوسری جماعت کو اپنی پیروی پر جبراً مجبور کرنا غلامی کے علاوہ اور بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ ان حالات کے پیشِ نظر غلامی کہاں ختم ہوئی؟ اور کس عدالت نے غلامی کے قانون کو ختم کیا؟

مشہور امریکی رائٹر ہیری ہار وڈ (HARRY-HARWOOD) اپنی کتاب (آزادی زندگیاں) میں لکھتا ہے: یہ صحیح ہے کہ قرونِ وسطیٰ والی غلامی اس دور میں ختم ہو گئی ہے لیکن طبقہ بندی کی شکل میں ہمارے نظام میں غلامی اب تک باقی ہے۔ آج بھی یہی کوشش ہے کہ کالے ذِلت کی زندگی بسر کریں۔

ظالمانہ قوانین کے ماتحت کبھی ان کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں۔ اور کبھی حکومت کی لاپروائی، اور کبھی بغیر کسی اطلاع کے معمولی بہانہ کر کے اُن کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

گھریلو زندگیوں میں افراتفری

گھریلو زندگی بھی ایک مختصر اجتماعی زندگی کا نام ہے اور اسی سے بڑے بڑے معاشروں کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس ماحول میں سب سے زیادہ مہر و محبت کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف دَور یہیں سے شروع ہو کر یہیں پر ختم ہو جاتے ہیں۔ جب گھر کا ماحول خوش بختی اور آسائش و آرام والا ہوتا ہے تو گھر والوں کی زندگی پر قلبی لگاؤ، خلوص سکون و اطمینان کا سایہ رہتا ہے۔ یعنی خاندانی افراد کے روحانی و اخلاقی اقدار جتنے محکم ہونگے سعادت و خوش بختی بھی اتنی ہی ہوگی۔ کیونکہ انسان فطرتاً پُرشور زندگی کے میدان میں آسودگی خیال اور فکر آرام کا خواہش مند ہوتا ہے۔

مغربی اقوام ——— صنعتی انقلاب سے پہلے ——— بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ اس لئے ان کا خاندانی ماحول بھی مخصوص لطف و آرام کا حامل تھا۔ مرد زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لئے گھر سے باہر چلے جاتے تھے اور عورتیں بچّوں کی پرورش و تربیت میں مشغول ہو جاتی تھیں اور گھر سے باہر کے اُمور کا اُن سے کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔

صنعتی ترقی ——— جو قہری طور پر بہت سے افراد کی محتاج ہے ——— کا پہلا ثمرہ یہ تھا کہ اس نے عورت مرد، چھوٹے بڑے، سبھوں کو صنعتی مراکز، حکومتی اداروں، تجارت خانوں کی طرف کھینچ لیا۔ اور کلی طور سے شہری زندگی کا رُخ بدل دیا، اور بہتر سے بہتر زندگی کی تلاش کی طرف سب کو رَواں دَواں کر دیا۔

اِس تفسیر و تبدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ افراد خاندان میں آپسی محبّت کم ہونے لگی، زناکاری

رواج پانے لگی، آپسی میل و محبّت کا خاتمہ ہوگیا، عورت کی توجّہ جو صرف خاندان کے ماحول تک محدود تھی اور جس کا عشق بچّوں تک مخصوص تھا وہ ناپید ہوگیا، وہ عورتیں جو اب تک چند بچّوں کی پرورش و تربیت تک اپنے کو محدود کئے ہوئے تھیں اس محدودیت کو اپنے لئے باعثِ زحمت سمجھنے لگیں اور اب خانہ داری اور تربیتِ اولاد کی توقع اُن سے فضول و لغو ہوگئی۔

اَب چونکہ زیادہ تر عورتیں خود کسبِ معاش کرنے لگیں اس لئے اپنی کوششوں کو صرف گھر تک محدود کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ اب عورتوں کے دو کام ہو گئے ہیں (۱) صنعتی مراکز و اداروں میں بطور کاریگر کام کرنا۔ (۲) بعنوان ماں، اور عورت امور خانہ داری کی دیکھ بھال کرنا۔ اس لئے عورتوں کے پاس کافی وقت امور خانہ داری کے دیکھ بھال کرنے کے لئے نہیں بچتا۔ ظاہر ہے کہ جس عورت کی فکر منتشر ہو، جس کو ٹھیک وقت پر کارخانہ پہنچنا ہو وہ اُمورِ خانہ داری میں سہل انگاری، سُستی، تھکن کی وجہ سے دلچسپی لے ہی نہیں سکتی۔

دوسری طرف آزادیٔ مطلق نے بھی اپنا منحوس سایہ معاشرے کے اوپر ڈالا عفت و پاکدامنی کا تصوّر بہت سے خاندانوں سے اس طرح ختم ہوگیا جیسے گدھے کے سَر سے سینگ، اب سوائے بدبختی و پریشانی کے یہ آزادی کوئی نتیجہ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح دینی بنیّاد پر بنائے گئے اخلاقی اصول، خاندانی و معاشرتی نظام کا بھی رفتہ رفتہ خاتمہ ہوگیا۔

آج متمدّن ملکوں میں کثرتِ طلاق معاشرے کا ایک مشکل ترین مسئلہ بن چکا ہے اور اس نے اُن لوگوں کو ایک ایسی گلی میں بند کر دیا ہے جہاں سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں ہے۔ اب یہ مسئلہ ان کے لئے عقدہ لاینحل بن چکا ہے۔ مرد و عورت کے سلیقے میں معمولی سا اختلاف جنگ و جدال کا سبب بن جاتا ہے اور دونوں کے درمیان کشمکش و اختلاف کی وسیع دیوار حائل ہوجاتی ہے۔ اور پھر تو ایک غیر متناہی اختلافی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اور یہ تو ظاہر سی بات ہے کہ ہوا و ہوس کے بادل جب ازدواجی زندگی کے افق پر نمودار ہوجاتے ہیں تو رفتہ رفتہ

یگانگی و اتحاد بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور مقدّس ترین مسائل مضحک ترین مسائل بن جاتے ہیں۔

بہت سے طلاقوں کی بنیادی وجہ وہ معمولی مسائل ہوتے ہیں جن کا حل بہت آسانی سے ممکن ہوتا ہے۔ کچھ دنوں اگر یہ طلاق نہ ہوتی تو خدا کاری کی دیوار میں پڑا ہوا شگاف بہت جلد ختم ہو جاتا اور آتشِ اختلاف بجھ جاتی۔ چشم پوشی ـــــ بشرطیکہ دونوں طرف سے ہو ـــــ پھر ازدواجی زندگی کو مضبوط و مستحکم بنا دیتی۔

میرے ایک ایرانی دوست نے بتایا: جرمنی میں جتنے دن میں رہا ـــــ حالانکہ یہ مدّت بہت مختصر تھی ـــــ اتنے دنوں میں میں نے دیکھا کہ میرا کوئی پڑوسی ایسا باقی نہیں رہا جس نے اپنی بیوی کو طلاق نہ دے دی ہو۔

ایک مدّت سے طلاق کے انسداد کے لئے بہت سے ایسے مراکز مشرقی جرمنی میں کھولے جا چکے ہیں جن کا کام صرف ازدواجی زندگی کی اصلاح ہے۔ بہت سے طبیب اور حقوق داں بھی اس بات کی طرف متوجّہ ہو چکے ہیں۔ کتابوں کے علاوہ مخصوص رضا کار دستے اس کام کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ اب بہت سے لوگ اِس بات پر متّفق ہو چکے ہیں کہ: "طلاق کی بنیادی وجہ عورتوں کا گھر سے باہر کام کرنا ہے۔"

گھریلو آمدنی کی قلّت کی وجہ سے ۷۰ فیصد شوہر دار عورتیں گھر سے باہر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ ان میں ۶۰ فیصد تو صاحبِ اولاد ہیں۔ گھر سے باہر ملازمت کرنا اور گھر کے اندر امورِ خانہ داری اور بچّوں کی پرورش کرنا عورتوں کے اعصاب کو اتنا متاثر کر دیتا ہے کہ شوہر و زوجہ کے درمیان مستقل اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے[1]

مشہور رُوسی ڈاکٹر ٹالسٹائی (TOLSTOY) کہتا ہے: کثرتِ طلاق کی علّت عورتوں کو طلاق میں ضرورت سے زیادہ اختیار دینا اور ان کی متلوّن مزاجی و زُود رنجی ہے۔ دُوسرے

---

[1] کیہان شمارہ ۶۹۲۶

اور بھی اسباب ہیں۔ مثلاً عورتوں اور مردوں کا مشین کی طرح کام کر کے خستہ ہو جانا اسی طرح عورتوں اور مردوں کا ضرورت سے زیادہ خلط ملط ہونا جو نامشروع روابط کا سبب بنتا ہے اور اسی وجہ سے طلاق کی نوبت آتی ہے۔ اور خاندانوں کے درمیان کدورت کا بھی سبب بنتا ہے۔ اسی طرح عورتوں کا گھر سے باہر جا کر ملازمت کرنا بھی ایک اہم سبب ہے۔

چند سال پہلے نیویارک کا ایک کلب جو نیویارک اور واشنگٹن کے نکاح و طلاق کی اعداد شماری کیا کرتا تھا اس کے اعداد و شمار کو دیکھ کر ذمہ داروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ ان دونوں شہروں کے ہنرمند پیشہ ور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں پچاس سال کے اندر جتنا طلاق ہوا ہے کسی اور طبقے میں نہیں ہوا۔ نیویارک اور واشنگٹن کے اعداد و شمار کو دیکھ کر کلب کے ذمہ داروں کو خیال پیدا ہوا کہ ہالی وڈ کی بھی نکاح و طلاق کی اعداد و شماری کی جائے۔ لیکن اس شہر کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ لوگ اس کے نشر نہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔[1]

انگلستان میں آخری دور میں جو تعداد شائع کی گئی اس میں یہ خبر بھی تھی کہ گزشتہ سال انگلستان میں طلاق کی کثرت نے عالمی ریکارڈ توڑ دیا۔ کچھ طلاقیں خیانت کی وجہ سے تھیں اور کچھ دیگر اسباب کی بنا پر۔[2]

ایک رائٹر امریکہ میں ہونے والی طلاق کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: امریکہ میں ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۰ء یعنی دس سال کے اندر جو طلاقیں ہوئیں ان کے مقابل میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۹ء میں دس گنا طلاقیں زیادہ ہوئیں۔ اندازے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہر چار شادی میں ایک کا انجام طلاق پر ختم ہوا۔

کیلیفورنیا میں ۱۹۵۶ء کے اندر ۸۷۴۵۲ نکاح ہوئے اور ۴۲۴۷۱ طلاق ہوئی یعنی ہر دو نکاح پر ایک طلاق ہوئی۔[3]

رسالہ واک (WAKE) مطبوعہ امریکہ لکھتا ہے: سوئیڈن میں اخیری دس سالوں کے

---

[1] طلاق و تجدد صفحہ ۹۴، ۹۵ [2] کیہان ۲۸ فروردیں ۳۹ [3] روزنامہ کیہان

اندر دس فیصد اور اخیری پچاس سال کے اندر یہ تناسب بہت بڑھ گیا ہے[1]

فرانس کی عدالتوں نے ۱۸۹۰ء میں ۹۷۸۵ طلاق کا حکم دیا جس میں ۷۰۰ طلاقوں کا مطالبہ عورتوں کی طرف سے تھا اور اب یہ نسبت کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔

عالمی جنگ اوّل اور خصوصاً دوسری عالمگیر جنگ کے بعد تعداد ازدواج میں جو کمی ہوئی ہے اس کی وجہ وہ اخلاقی فساد ہے جو جوان طبقے میں عام ہو چکا ہے، یہی اخلاقی فساد لوگوں کو لاابالی اور آزاد روی کی طرف آمادہ کرنے کے ساتھ کثرت طلاق کا بھی سبب بنا ہے جی ڈی پی آئی ایس (G.D.P.I.S) مختلف سالوں میں مطلقہ عورتوں کی تعداد کا تقابل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مطلقہ عورتوں کی تعداد ازدواج میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے مطلقہ عورتوں کی شادیاں پہلی شادی کرنے والوں کی تعداد سے زیادہ ہونے کی علت ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد کثرتِ طلاق سے مربوط ہے[2]

گزشتہ سال فرانس میں تیس ہزار طلاق ہوئی۔ اور چونکہ ہر سال اس تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اس لئے فرانس کے خاندانوں کے فیڈریشن نے متحد ہو کر حکومت سے درخواست کی ہے کہ ۱۹۴۱ء کا مخصوص قانون جو ۱۹۴۵ء میں ختم کر دیا گیا تھا اس کو پھر سے نافذ کیا جائے۔ اس مخصوص قانون کے مطابق شادی سے تین سال تک کسی بھی طرح سے طلاق دینا ممنوع ہے۔

دو استثناء کے ساتھ یہی مقررات انگلستان میں بھی معمول ہیں (۱) مرد کی طرف سے خلافِ عادت سختی اور وحشی پن کا اظہار (۲) خیانت و بے انتہا فساد کا اظہار عورت کی طرف سے ہونا[3]

امریکی عورتیں دو ماہ یا آٹھ ماہ یا (زیادہ سے زیادہ مترجم) ۲۶ ماہ میں شوہروں سے الگ ہو جاتی ہیں اور ہر سال ڈیڑھ لاکھ بچے طلاق کا فدیہ بنتے ہیں۔ ایک دوسرے حساب کے مطابق آج بھی امریکہ میں تین ملیون بچے ایسے موجود ہیں جن کے ماں باپ مختلف اسباب

---

[1] جامعہ شناسی صفحہ ۲۹۵ [2] طلاق و تجدد صفحہ ۹۲ [3] خواندنیہا سال ۲۵ شمارہ ۱۰۳

کی بنا پر ایک دوسرے سے جُدا ہو چکے ہیں[۱]

امریکہ کا مشہور مضمون نگار لیوسَون (LAWSON) امریکہ میں کثرتِ طلاق کے اعداد و شمار بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: جس میں بھی ذرّہ برابر انسانی دوستی ہوگی وہ اس وحشت ناک تعداد سے پریشان ہوگا اور اس کے علاج کی فکر میں ہوگا۔ سب سے زیادہ جو چیز قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ۸۰ فیصد طلاق کی مانگ عورتوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ افزائشِ طلاق کی علّت بھی اسی جگہ تلاش کرنی چاہیئے اور آخر کار اس سلسلے کو ختم کرنا چاہیئے۔

ہمارے لئے افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں بھی جو لوگ بے قید و بند زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں ان کے یہاں بھی کثرتِ طلاق کا وجود ہو گیا ہے۔ دس سال پہلے صرف تہران میں محض اسبابِ زیبائش کے مصارف کے بارے میں اختلاف کی وجہ سے ایک ہزار سے زیادہ طلاق ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد علاوہ ان تعداد کے ہے جو کسی اور سبب سے ہوئی ہیں۔ اخباروں میں شائع شدہ خبروں کے مطابق اعداد و شمار درج ذیل ہیں[۲]

حکومتی اعداد و شمار کے مطابق ۱۳۳۹ عیسوی تہران کے اندر پندرہ ہزار تین سو پینتیس شادیاں اور چار ہزار اسا ٹھ سو انتالیس طلاقیں ہوئیں یعنی تقریباً ہر تین شادی پر طلاق ہوئی[۳]

طلاق و شادی کے دفتر سے حاصل ہونے والی اطلاع کو جو اخباروں نے شائع کیا ہے وہ یہ ہے کہ ۶۰ فیصد طلاق کی مانگ ان عورتوں کی طرف سے ہوئی ہے جو مغربی تمدن کی دل دادہ ہیں۔ طلاق کی یہ کثرت بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی، اور یقینی طور سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان بدکاریوں کے اثرات اور خانماں سوز تمدن کی پیروی سے تمام ایران میں تعداد طلاق بڑھ جائے گی اور بہت سے خاندان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ البتہ اگر معاشرہ پھر سے اسلامی دستور کا پابند ہو جائے تو یہ خرابیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

-x:(۵):x-

---

[۱] اطلاعات ہفتگی شمارہ ۔ ۱۲۰۶ [۲] اطلاعات ہفتگی [۳] روزنامہ دنیا

حیوان دوستی

بعض مغربی خاندانوں میں کتّوں سے محبّت اور ان کی حفاظت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ ایک ایرانی ـــــ جو جرمنی میں طبابت حاصل کر رہا تھا ـــــ کہتا ہے: میں نے اپنے مالک مکان کو ایک دن ـــــ جو اپنے کتے کو بہت چاہتا تھا اور اس کو برابر چومتا تھا، گود میں بٹھاتا تھا ـــــ کتّے کے کدّو دانہ[1] (HYDATID CYSTS) کی بیماری سے بہت ڈرایا مگر اُس کو میری بات کا یقین نہیں آیا، تو مجبوراً میں نے اُس کو طب کی کتاب دی اس کو پڑھ کر بہت متعجّب ہوا اور خوش بھی ہُوا، کہنے لگا اگر کتّا پالنا اتنی خطرناک بات ہے تو بڑے بڑے اطبار یونیورسٹیوں کے اساتذہ آخر کیوں کتّے پالتے ہیں اور کتّوں کو اتنا چاہتے ہیں اور اپنے گھر میں رکھتے ہیں؟ میں نے جواب دیا بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی خطرناکی کا بار بار اعلان کیا گیا ہے مگر اطبار اپنے عقل و علم و دانش کی طرف متوجہ نہ ہو کر خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتے ہوئے دائرہ احتیاط سے باہر قدم رکھتے ہیں۔

"انجمن ملّی حمایت از حیوانات ایران" کے ارکان ایک امریکی رسالے سے نقل کرتے ہیں کہ اس رسالے نے اپنے تمام پڑھنے والے کتّا دوست ـــــ جن میں زیادہ تر عورتیں ہیں ـــــ سے تقاضا کیا تھا کہ نیچے دئے ہُوئے سوالات کا سچّا جواب دیں۔

۱- آپ اپنے کتّے کو زیادہ چاہتے ہیں یا بیوی کو؟

۲- اگر آپ کے پاس تھوڑی سی غذا ہو اور آپ اور آپ کا کتّا دونوں بھوکے ہوں تو وہ غذا

---

[1] ایک کیڑا ہوتا ہے جو سُور کا گوشت کھانے سے آنتوں میں جا کر چپک جاتا ہے۔

خود کھائیں گے یا کُتّوں کو دیں گے؟

۳۔ کیا آپ کا کُتّا آپ کے کمرے میں سُوتا ہے؟

۴۔ اگر آپ کا کُتّا مرجائے تو کیا واقعی آپ اس پر گریہ کریں گے؟

۵۔ کیا آپ کا کُتّا آپ کی نظر میں شخصیت "فوقِ حیوانی" رکھتا ہے؟

۶۔ اگر آپ کا کُتّا آپ کے چھوٹے بچّے کے پاؤں میں کاٹ لے اور بچّہ اس کو ڈھیلا مار دے اب ایک تو رو رہا ہو، اور ایک چیخ رہا ہو تو آپ کی فوری توجہ کس طرف ہوگی، کتّے کی طرف یا بچّے کی طرف؟

۷۔ اگر آپ کا کُتّا اور شوہر دونوں بیمار ہوجائیں تو پہلے کس کے لئے ڈاکٹر لائیے گا؟

۸۔ کیا آپ کو ہر وقت اپنے کتّے کی فکر ستاتی رہتی ہے؟

اُوپر دئے ہوئے سوالات کے جواب میں ۷۵ ہزار خطوط کے جوابات اس طرح تھے۔

۱۔ دو تہائی لوگوں کا جواب یہ تھا کہ بیوی کو اس وقت چاہتے ہیں جب وہ کُتّے کو چاہتی ہو۔ اور کچھ لوگوں نے لکھا تھا ہمارے لئے ہمارا کُتّا ہی سَب کچھ ہے۔

۲۔ ساٹھ ہزار لوگوں کا جواب تھا ہم غذا اپنے کُتّے کو دے دیں گے کیونکہ اگر ہم بھوک سے مرگئے تو کیا ہوا۔ کُتّے کا مرنا اس سے زیادہ اہم ہے۔

۳۔ انچاس ہزار پڑھنے والوں ـــــ جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں ـــــ نے لکھا تھا، یقیناً ہم اپنے کُتّے کو اپنے کمرے میں سُلاتے ہیں۔ جو بھی ہو کُتّا دوسروں سے بہتر ہے۔

۴۔ دو تہائی پڑھنے والوں کا جواب تھا ہاں کُتّے کے مرنے پر ہم گریہ کریں گے اور اس کے لئے نذر بھی کریں گے۔

۵۔ تقریباً تمام پڑھنے والوں کا جواب تھا ہم کُتّے کے لئے "فوقِ حیوانیت" اہمیت کے قائل ہیں اور اس کو معنوی شخصیت مانتے ہیں۔

۶۔ ہم کوشش کریں گے دونوں کو آرام پہنچائیں۔

۷۔ اس کا جواب دیا تھا ہم پہلے کُتّے کے ڈاکٹر کو خبر کریں گے اس کے بعد ڈاکٹر کو مطلع

کریں گے۔

۸۔ سبھوں نے جواب دیا تھا۔ ہم ہر جگہ اس کی فکر میں رہتے ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ لوگ کتّے کے لئے مقام معنوی کے قائل ہوں اس کے مرنے پر گریہ وزاری کریں۔ لیکن ہزاروں انسان آزادی کے لئے جب قیام کرتے ہیں تو بہت ہی بے رحمی کے ساتھ ان پر بم پھینکے جاتے ہیں۔ کیا یہ برتاؤ متمدن انسان کے دل کو زخمی نہیں کرتا؟ کتّا کمرۂ خاص میں سو سکتا ہے مگر کالے انسان عام جگہوں پر بھی نہیں جا سکتے۔ کتّا بیمار ہو جائے تو کتّے کے ڈاکٹر کو فوراً اطلاع کریں گے اس کا معالجہ کریں گے۔ لیکن فقر و فاقہ سے گروہ در گروہ مرنے والے انسانوں کی کوئی فکر نہیں ہے اور نہ ان سے دل متاثر ہوتے ہیں۔

امریکہ میں کتّوں کے لئے مخصوص دوکانیں کھولی گئی ہیں، اس میں دس قسم کے (EAU-DE COLOGNE) کتّوں کے لئے مخصوص ہیں۔

حد یہ ہے کہ کتّوں کے دانتوں کے لئے منجن بھی بیچے جاتے ہیں۔ جو لوگ خواہشمند ہوں وہ اُن دوکانوں سے اپنے کتّوں کے لئے آسائش کا سامان بھی خرید سکتے ہیں۔ رسالہ "ٹائم" نے بڑے بڑے شہروں میں جو کتّوں کی تعداد لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کتنی شدّت کے ساتھ اس جانور کو دوست رکھتے ہیں۔

دنیا کے کچھ شہروں میں کتّا مکان والی کی زندگی کا واقعی نصف بہتر بن گیا ہے خصوصاً لندن، ٹوکیو، میکسیکو سٹی وغیرہ میں کتّے اتنے زیادہ ہیں جن سے زندگی دُوبھر ہو گئی ہے۔

سگ گزیدہ بچّوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بڑے شہر جو یوں ہی ہمہ وقت شور و غل سے پُر ہوتے ہیں، کتّوں کی آوازوں نے ان کو مزید شور و غل والا بنا دیا ہے۔ ٹوکیو میں دو لاکھ اسّی ہزار، لاس اینجلس میں تین لاکھ، نیویارک میں پانچ لاکھ، لندن میں سات لاکھ، میکسیکو سٹی میں ایک ملیون سے زیادہ کتّوں کی تعداد ہے اور بطور کلی کتّے دنیا کو زیر و زبر کئے دے رہے ہیں۔[1]

---

[1] اطلاعات۔ شمارہ ۱۳۲۴۱

رسالہ ایمل (ANIMAL) مطبوعہ فرانس لکھتا ہے: امریکہ میں کتّوں کے مالک اپنے کتّوں کی زیبائش پر سالانہ ۳۰ لاکھ ملیون ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ نیویارک، سان فرانسسکو، شیکاگو، لاس اینجلس میں بڑے بڑے ہال محض کتّوں کی آرائش کے لئے بنوائے گئے ہیں۔ ان بڑے ہالوں کی تعداد ان شہروں میں بہت زیادہ ہے، اور ان میں ہر وقت شور وغل مچا رہتا ہے۔ کتّوں کی آرائش کرنے والوں کو مدارس میں چھ ماہ سے لے کر سال بھر تک کی ٹریننگ لینا پڑتی ہے تب ان کو اس کا ڈپلومہ ملتا ہے۔ امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں ایک سے لے کر تین چار تک کتّوں کے لئے قبرستان بھی ہے۔ ہر سال کتّوں کے کفن دفن اور دیگر مراسم کی ادائیگی پر کافی خرچ آتا ہے اور یہ آمدنی کا بہترین ذریعہ ہے۔

اسی امریکہ میں جہاں اربوں ڈالر کتّوں کی آرائش پر خرچ کئے جاتے ہیں ـــــ پانچ ملیون آدمی بیکار ہیں اور رنج وغم میں مبتلا ہیں حالانکہ وہ کسی کام کے کرنے سے پیچھے نہیں ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حیوانات کی حمایت ان کو تکالیف سے بچانا ایک انسانی اقدام ہے لیکن کیا بیکس و بے پناہ لوگوں کو متمدن انسانوں کی عطوفت و مہربانی کی ضرورت نہیں ہے؟

ان حالات سے انسان متحیر ہے۔ ہماری دنیا میں ہزاروں انسان روزآنہ بھوک سے مرجاتے ہیں لیکن سیکڑوں ملیون ڈالر کتّوں کی آرائش پر خرچ کیا جاتا ہے۔ انہیں تناقضات اور غیر انسانی افعال کو دیکھ کر بیسویں صدی کے دانشمندوں مثلاً ڈاکٹر اے کیرل (Dr A. CARREL) جیسے لوگوں میں ہیجان ہوتا ہے اور وہ اعلان کرتے ہیں کہ انسانی بنیاد کو پھر سے بنانا چاہئے تو غلط نہیں کہتے کیونکہ آج کا متمدّن انسانوں کو انسانی خصوصیات سے عالوی بنا چکا ہے۔

مہر و محبّت کی کمی

عورت اپنے بدن کے لحاظ سے اور بیالوجی وظائف کے ماتحت خاص وضع کی حامل ہوتی ہے۔ صنّاع ازل نے اس کو مخصوص مصالح سے آراستہ پیراستہ کیا ہے۔ اور اس میں یہ قوّت ودیعت کی گئی ہے کہ اپنے فرائض باقاعدگی کے ساتھ انجام دے سکے۔ عورت کی جسمانی قابلیت اور مادری خصوصیت نے اس میں ایک خاص قسم کی فکری و عاطفی کیفیت پیدا کردی ہے جس کی بنا پر اس میں اپنا اہم فریضہ — بچّے کی پرورش و نگہداشت — بجالانے کی خوبی موجود ہے۔ بچّوں کی خواہشات، فطری تقاضے عورت کے دامن میں آکر محفوظ ہوجاتے ہیں۔ کوئی دوسری چیز عورت کی جگہ پر نہیں کرسکتی۔ نرسنگ ہوم اور بورڈنگ ہاؤس چاہے کتنے ہی فطری لحاظ سے بنائے گئے ہوں بچّوں کے احساس و عواطف کی تکمیل نہیں کرسکتے۔ جو بچّے ماں کے سایۂ عاطفت و محبّت سے محروم رہتے ہیں اور ماں کی مخصوص شفقتوں سے دُور رہتے ہیں۔ وہ بہت سے رُوحی و ذہنی الجھنوں کے شکار ہوجاتے ہیں۔ لیکن مغرب کی عورت گھر سے باہر کام کرنے کی وجہ سے اپنے فطری حدود سے باہر قدم رکھتی ہے اور اپنی فطری اور عظیم طاقت سے محروم ہوکر فطرت و طبیعت کے اصول کو توڑ دیتی ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ نہ کمیونزم اور نہ ہی مادی مغربی تمدّن فطرتِ بشری کو بدل سکتے ہیں ان لوگوں نے تو عورت کو اس کے اصلی مقام سے علیحدہ کردیا ہے۔ اور یہی چیز بے شمار اخلاقی و اجتماعی و رُوحی مفاسد کا سبب بنی ہے۔ مہرِ مادری سے محروم بچّوں میں جو ذہنی گرہیں پڑجاتی ہیں ان کی اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے: جن لوگوں نے بچوں کی پرورش کو ذریعۂ معاش بنایا ہے اور ان کو تربیتِ اطفال کا کوئی ذوق وشوق نہیں ہے وہ بچوں کو دشمن کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے بس سے باہر کی بات ہے کہ وہ بچوں کے عواطف وہیجانات کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔[۱]

ڈاکٹر الیکسس کارل (Dr.A. LEXIS CARREL) مشہور دانشمند یورپی خاندانوں کی غلطی واشتباہ کو ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے: آج کے معاشرے کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ بچپنے ہی سے نرسنگ ہوم اور بورڈنگ ہاؤس کو ماں کی گود کا قائم مقام کردیا ہے۔ یہ چیز درحقیقت عورتوں سے خیانت کے مرادف ہے۔ جو مائیں اپنے بچوں کو بورڈنگ ہاؤس کے سپرد اس لئے کرتی ہیں کہ تاکہ ملازمت، ادبی وہنری مشغولیت باقی رکھ سکیں یا برج وسینما بینی پر اپنا وقت صرف کرسکیں، ان کا یہ اقدام بچوں کو گھریلو ماحول سے بہت کچھ سیکھنے سے محروم کردیتا ہے۔ اور گھر کی چہل پہل ختم ہوجاتی ہے۔ گھریلو ماحول میں پلنے والے بچوں کا رشد وفکر شب وروز مدارس کے بچوں میں رہنے والے بچوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ بچے بنیادی طور اپنے آس پاس کے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں جسمانی، عاطفی، روحانی خصائص بھی اپنے ماحول ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے اپنے سے کمسن بچوں کے مقابلے میں کم یاد کرتے ہیں اور جب فیل ہوجاتے ہیں تو اس کا صحیح احساس نہیں کرپاتے۔ ہر فرد کی صحیح پرورش گھریلو ماحول کی توجہ پر موقوف ہوا کرتی ہے مستقبل کی بنیاد یہی ماحول ہوا کرتا ہے۔[۲]

متمدن معاشرے کے عورتوں کی رنجیدگی اور خاندانی بے سروسامانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اصلی فرائض کو چھوڑ کر، خارجی کاموں میں مشغول ہوجاتی ہیں۔ امریکہ کے اندر عدالتی طلاق لینے والی عورتوں میں ۷۵ فیصد ایسی عورتیں ہیں جو روحی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ ہر سال ڈیڑھ لاکھ بچے والدین کے آپسی اختلاف کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

آج امریکی عورت خستہ ہوکر گھر پلٹتی ہے۔ یہ بات تجربہ شدہ ہے کہ شہری معاشرے میں

۱۔ روان شناسی کودک صفحہ ۲۹۷ ۲۔ انسان موجود ناشناختہ صفحہ ۲۶۰

اس کی تلاش وجستجو سوائے روحانی بیماری کے کوئی نتیجہ نہیں دے سکتی۔ لیکن واقعی چیز یہ ہے کہ امریکہ کی عورت گھر کے اندر بھی رنجیدہ ہے۔ ملیونوں آدمی گھر بیٹھے کھاتے ہیں اور پھر روحانی ماہرین کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ سب خستہ ہیں۔ اور یہ خستگی معاشرے کی شدید فعالیت کی پیداوار ہے۔ یعنی ایسے معاشرے کی جو صرف مشینی بن گیا ہے اور چوبیس گھنٹے ہیا ہو شور وغل میں گرفتار ہے۔

ڈاکٹر جارج مالی (Dr GEORGE MALLY) کہتا ہے: جوانوں کی بہت سی بیماریاں بچپنے کی پیداوار ہیں اور اس کی ذمہ داری ان کے ماؤں پر آتی ہے۔ جھوٹ بولنا، بے گناہ جانوروں کو مار ڈالنا، معاشرے کے اصول کی خلاف ورزی کرنا، یہ ساری باتیں صرف اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ بچپنے میں ماؤں نے ان باتوں سے روکا نہیں! امریکی عورتوں کا یہ مختصر سا تجزیہ ہے[1]

والدین اور بچوں کے آپسی روابط بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ بچے والدین کی ناکافی محبت ملنے کی وجہ سے اپنے میں والدین کے لئے کسی قسم کا احساس نہیں رکھتے۔ اکثر اتفاق ہوتا ہے کہ افراد خاندان سالہا سال ایک دوسرے سے ملاقات نہیں کر پاتے، والدین کا طور وطریقہ بڑے بچوں کے ساتھ خصوصاً جو اٹھارہ سال کے ہو گئے ہیں نہایت نامعقول ہے۔ اکثر وبیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ بچے جہاں بلوغ کی منزل میں پہنچے والدین ان کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اگر کسی کے ماں باپ بچوں کو ساتھ رکھنے پر تیار بھی ہوئے تو ان سے روزانہ کا خرچ وصول کر لیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اگر کبھی کسی بچے سے کوئی برتن ٹوٹ جائے تو والدین اس کو مجبور کرتے ہیں کہ بازار سے دوسرا خرید کر لائے اور اس کی جگہ پر رکھے۔ اس قسم کا برتاؤ بالخصوص لڑکیوں پر بہت برا اثر ڈالتا ہے۔ اور وہ لڑکیاں عموماً تنہائی میں رہنے کو ماں باپ کے گھر رہنے پر ترجیح دیتی ہیں۔ اور اسی تنہائی اور خاندان سے دوری اور مربی کے نہ ہونے کی وجہ سے

---

[1] اطلاعات ہفتگی شمارہ ۱۲۰۶ نقل از منابع فارجی۔

نوجوانوں سے غلط قسم کے تعلّقات پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

لوگوں کے دوستانہ روابط بہت ہی سرد اور گہرے و بنیادی عواطف سے خالی ہیں قلبی محبّت ـــــ جو ایک رابطہ عاطفی اور روشنی بخش ہے ـــــ وہ مشینوں کے پہیّوں میں گم ہو چکی ہے۔ ایثار، درگزر، ہمدردی نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ اور شاید دوستوں کی تعداد انگلیوں پر شمار کرنے کے قابل ہے۔

متمدّن دُنیا نے اپنی نئی تشکیلات اور منظّم معاشرے کی خاطر انسانیت کے سوتوں کو لوگوں کے دلوں سے خشک کر دیا ہے اور یہ سوتے خشک و بے جان قالبوں میں پہونچ گئے ہیں۔ لوگوں کا تعاون قانونی ہے۔ قلبی لگاؤ کی بناء پر نہیں ہے۔ اگر کوئی کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو دوسرے اس کی گرہ کشائی کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس کے لئے معمولی سا مادی نقصان بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور نہ اپنے کو کسی کی خاطر کسی مشکل میں ڈالنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں اگر قانون سے مجبور ہوں مثلاً پولیس کا خطرہ ہو تب تو تعاون کریں گے۔ لیکن کسی کی مدد اخلاقی فریضہ کے عنوان پر کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ایک مرتبہ میں (مُصنّف کتاب) اسپتال میں بطور مریض تھا۔ حالانکہ میرے ملاقاتی بہت کم تھے لیکن اس کے باوجود ان تمام جرمنی بیماروں سے کہیں زیادہ تھے جو میرے وارڈ میں تھے۔ اور اس بات سے اسپتال والوں کو بہت تعجب تھا۔ کیونکہ جرمنی میں تو لوگ اپنے خاندان والوں کی عیادت کو بھی اسپتال نہیں جاتے۔ یہاں میں ایک دلچسپ واقعہ زندہ شاہد کے عنوان پر آپ کے لئے نقل کرنا چاہتا ہوں، تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ متمدن لوگوں میں کتنی محبّت ہوتی ہے۔ چند سال پہلے جرمن یونیورسٹی کا ایک استاد ہمبرگ کے جمعیت اسلامی کے سرپرست کے سامنے مشرف باسلام ہوا۔ کچھ مدّت کے بعد وہ نومسلم کسی بیماری کی بناء پر ایک اسپتال میں داخل ہوا۔ جمعیّتِ اسلامی کے سرپرست نے اس کی

عیادت اسپتال جاکر کی، لیکن بالکل ہی خلاف توقع نومسلم کا چہرہ بہت افسردہ وغمگین تھا۔ سرپرست جمعیّت نے پوچھا کہ آپ اتنے پژمردہ کیوں ہیں؟ اور اب تک وہ نومسلم پروفیسر بالکل خاموش تھا۔ سرپرست کے سوال پر اس نے اپنی زبان کھولی اور اپنا افسوس ناک واقعہ سنانا شروع کیا۔ اس نے کہا آج میرے بیوی بچّے میری عیادت کو آئے تھے۔ ان کو اسپتال میں اطلاع مل چکی تھی کہ میں سرطان میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ جب وہ مجھ سے رخصت ہو کر جانے لگے تو کہنے لگے: آپ سرطان کی بیماری میں مبتلا ہو کر موت کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں اب آپ چند دن سے زیادہ کے مہمان نہیں ہیں، ہم آخری بار آپ سے رخصت ہو رہے ہیں اب اس کے بعد آپ کی عیادت کو نہیں آسکتے! آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ پروفیسر نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا: میری پژمردگی اور رنجیدگی اس لئے نہیں ہے کہ امید کے دروازے میرے لئے بند ہو چکے ہیں اور میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں بلکہ زن وفرزند کے اس غیر انسانی رویّہ سے مجھے شدید ذہنی تکلیف پہنچی ہے۔

سرپرست ـــــ جو اس واقعہ سے خود بھی بہت متاثر ہو چکے تھے ـــــ نے کہا چونکہ اسلام میں بیمار کی عیادت کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اس لئے مجھے جب بھی فرصت ملے گی آپ کی عیادت کے لئے حاضر ہوں گا، اور اپنے دینی فریضہ کو پورا کروں گا۔

بیچارے مریض کی حالت رفتہ رفتہ خراب ہوتی گئی اور چند دن کے بعد اس نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اس کے دفن وکفن کی خاطر کچھ مسلمان اسپتال گئے اور اس کی میّت قبرستان لے آئے۔ مگر قصّہ یہاں پر ختم نہیں ہوتا (ذرا آگے پڑھئے) وہ لوگ میّت کو دفن کرنے جا ہی رہے تھے کہ ناگہان ایک نوجوان غصّے میں بھرا ہوا جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا قبرستان آیا اور آتے ہی پوچھنے لگا! پروفیسر کا جنازہ کہاں ہے؟ لوگوں نے پوچھا آپ کی مرنے والے سے کوئی رشتہ داری ہے؟ جوان نے کہا ارے رشتہ داری! بھائی میں مرحوم کا بیٹا ہوں۔ پروفیسر کے مرنے سے چند دن قبل میں نے ان کی باڈی ۶۰ روپے

میں اسپتال والوں کے ہاتھ بیچ دی تھی تاکہ اسپتال میں اُن کا بدن چیرا پھاڑا جا سکے۔ نوجوان نے بہت زور لگایا مگر مسلمانوں نے میت اس کے حوالے نہیں کی مجبوراً وہ خاموش ہو گیا۔ باتوں باتوں میں اس سے پوچھا گیا تم کیا کام کرتے ہو۔ اس نے کہا، صبح تو ایک کارخانے میں کام کرتا ہوں اور سہ پہر کو کتّوں کی سجاوٹ کا کام انجام دیتا ہوں !!!

یہ ایک تلخ حقیقت ہے اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ متمدّن دنیا میں مہر و محبّت کی کتنی کمی ہے۔!

اس زمانے میں اخلاقی فضائل کی کمی اور معاشرتی مفاسد کو دیکھتے ہوئے اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بشریت پیچھے پاؤں پھر حجری دَور کی طرف پلٹ رہی ہے۔ بڑے بڑے مفکرین اس تلخ حقیقت کے معترف ہیں اور اس کی چارہ جوئی کی فکر میں ہیں اور ان حالات سے بہت رنجیدہ ہیں۔ انھوں نے درد کو پہچان لیا ہے اور وہ یہ چاہنے لگے ہیں کہ اس خود سری، بے راہ روی کا خاتمہ کیا جائے اور ایمان و فضیلت کی بنیاد پر ایک نئی دنیا ایجاد کی جائے۔

جو لوگ اس قسم کی زندگی میں ڈوب گئے ہیں اب ان کو بھی احساس ہونے لگا ہے کہ یہ تو ایک بالکل خالی خولی اور کھوکھلی زندگی ہے۔ یہ کبھی بشریت کو شاہراہ سعادت تک پہنچا ہی نہیں سکتی۔ اب ذرا اس حقیقت کا اعتراف موجودہ امریکہ کے رئیس جمہوریہ کی زبانی سنئیے جو قسم کھا کے کہتے ہیں: ہم اپنے کو مادی لحاظ سے بہت مال دار پاتے ہیں لیکن روحانیت کے لحاظ سے صفر ہیں۔ ہم چاند پر پہنچ گئے لیکن زمین میں پراگندگی کے شکار ہیں۔ ہم جنگ میں گرفتار ہیں اب صلح چاہتے ہیں، نفاق ختم کر کے اتفاق چاہتے ہیں اپنے گرد و پیش کو کھوکھلی زندگی دیکھ رہے ہیں اب بھرپور زندگی کے خواہش مند ہیں۔ معنوی بحران ـــــ جس میں ہم آج اسیر ہو چکے ہیں ـــــ کا معنوی جواب چاہتے ہیں اور اس کا جواب پانے کے لئے ہم کو خود اپنے کو دیکھنا ہوگا۔ اگر ہم اپنے وجدان کی آواز کو کان دھر کے سُنیں گے تو معلوم ہوگا کہ اب سادہ

اور اساسی چیزوں کی ضرورت ہے اب عفّت عشق و مہربانی کی اہمیت کا اعتراف کرنا ہوگا۔

فرانس کے مشہور دانش مند ڈاکٹر الکسس کیرل (Dr. A.LEXIS CARREL) لکھتے ہیں ہم ایسی دنیا چاہتے ہیں جس میں ہر شخص اپنی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اقدار مادی و معنوی آپس میں جدا نہ ہوں۔ اب ہم کو سمجھنا پڑے گا کہ کسی قسم کی زندگی کی ضرورت ہے کیونکہ ہم اس بات کو بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ زندگی کا راستہ قطب نما اور ہادی و رہبر کے بغیر بہت خطرناک ہے۔ تعجّب تو اس بات پر ہے کہ اس خطرے نے بھی ہم کو عقلائی زندگی کی تشکیل کے اسباب و وسائل کے جستجو پر آمادہ نہیں کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس خطرے کی اہمیت کو سمجھنے والے ابھی بہت کم ہیں۔

آج کے لوگوں کی زیادہ تر تعداد اپنی خواہشات کی پیروی کرتی ہے۔ اور ٹیکنالوجی نے جو مادی آسانیاں پیدا کر دی ہیں انھیں میں مگن ہے۔ جدید تمدّن نے جو سہولتیں فراہم کر دی ہیں ان سے آج کی دنیا نہ تو چشم پوشی کرنے پر تیار ہے اور نہ ان آسانیوں سے ہاتھ اٹھانے پر تیار ہے جس طرح پانی دریاؤں، سمندروں میں رواں دواں ہے۔ اسی طرح ہماری زندگی بھی خواہشات کے نشیب میں بہتی جا رہی ہے اور ہر قسم کے فساد و پستی کی طرف بہہ نکلتی ہے جیسا کہ تکمیل خواہشات و تفریحات اور نفع اندوزی کی طرف مائل ہے۔

ہم اپنی تشکیلات کو بلند کرنے کے بجائے اس کو نئے نئے آئیڈیوں کے قالب میں ڈال دیتے ہیں۔ اس لئے ایک ایسی دنیا پیدا ہو چکی ہے جو ہماری حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ آج کا متمدّن انسان مادّے کی اولویت کا قائل ہو چکا ہے اور معنوی اولویت کو اقتصادیات پر بھینٹ چڑھا چکا ہے۔

ہم آج کی دنیا میں جسم و جان کی اصلی ضرورتوں کی طرف توجّہ کئے بغیر ٹیکنالوجی ترقیوں کی طرف پیش رفت کر رہے ہیں ہم تو مادی دنیا میں غوطہ لگانے والے ہیں لیکن ہم نے اپنے کو مستقل سمجھ لیا ہے۔ ہم یہ سوچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ زندگی کی بقاء کے لئے ہوا و ہوس کی پیروی کرنے کے بجائے ہم کو چیزوں اور اپنی فطرت کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔ مدّت ہو گئی کہ

متمدّن بشریت اِس گرداب میں پھسلتی جارہی ہے اور ڈوبتی ہی چلی جارہی ہے۔

انسان مارکسیزم اور لبرالیزم (آزاد منشی) کا مشینی مخلوق ہوگیا ہے انسان کو صرف ایجادات و اختراعات کے لئے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ آغاز آفرینش سے جمال مذہبی کے عشق اور وقتِ فکر، فداکاری کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر انسان کو صرف اقتصادیات کی تکمیل کے لئے منحصر کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے بزرگ حِصّے کو اس سے کاٹ دیا گیا ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ مارکسیزم اور لبرالیزم یہ دونوں چیزیں فطری میلانات کو تباہ و برباد کرنے والی ہیں [1]

اگر آج کی دُنیا اس انحطاط و مفاسد کی جڑوں کو کھودنا چاہتی ہے تو پھر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ انبیاء خدا کے آسمانی تعلیمات پر عمل کرنے لگے۔ جی ہاں جب تک فضلے عقل بشر کو شہوتوں کا طوفان تاریک بنائے رہے گا۔ اور اس کی گندگیاں انسانی پیروں کی بیڑیاں بنی رہیں گی اس وقت تک بشریت کے نجات کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ اب تو صرف یہی طریقہ ہے کہ خفتگان وادیٔ ضلالت کے افکار میں ایک انقلاب پیدا کیا جائے۔ مختصر یہ ہے کہ جب تک معنوی ارزش، واقعی انسانیت کی طرف باقاعدہ توجہ مبذول نہ کی جائے گی۔ بشر کی افقِ زندگی پر واقعی سعادت کا قیافہ نمودار نہیں ہوسکے گا۔

---

[1] راہ و رسم زندگی صفحہ ۱۵ و ۳۴

حصّہ دُوم

دُنیاوی مشکلات کا حل

اسلام کے پاس ہے

آیئے ذرا اسلام کو تلاش کریں

گذشتہ مباحث میں مغربی تمدّن کا تجزیہ کیا جاچکا ہے، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلامی تمدّن کے تجزیہ وتحلیل کی طرف توجّہ دی جائے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ دونوں کا مقابلہ کرکے یہ معلوم کیا جاسکے کہ بشریت کے تمام تقاضوں کو اسلام نے کس طرح حل کیا ہے۔ خداوند کریم سے مدد چاہتے ہوئے اس بات کی اُمید کرتا ہوں کہ یہ بحث متلاشیان حقیقتِ اسلام کے لئے مفید وسبق آموز ہو۔

اگرچہ منتخب شدہ عنادین کی ہر بحث بہت وسیع اور شرح وبسط کی محتاج ہے۔ لیکن محض اس لئے کہ قاری ان مباحث سے خستگی نہ محسوس کرنے لگے اس کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے تاکہ کسی حد تک متلاشی حق کے لئے سببِ سکون ہو سکے۔

زندگی کے تمام شعبوں اور روحانیت کے مکمّل جلبوں کی بے نظیر گہرائی اور جامعیت کے لحاظ سے اسلام نے جو نظام بشریت کے ہاتھوں میں دیا ہے وہ کسی اور نظام نے نہیں

دیا۔کیونکہ اسلام کے اندر تمام خیر وسعادت کے راستے موجود ہیں۔ اسلام اپنے حکیمانہ نظام سے تمام بشریت کے دردوں کا درماں کرنے والا ہے۔عقلِ انسانی کی رسائی جن حدوں تک ممکن ہوسکتی ہے معاشرے کے ان تمام شعبہ ہائے حیات میں احکامِ اسلام کی متانت واضح وروشن ہے۔چونکہ قوانینِ اسلام کا بنیادی مقصد انسان کے تمام شعبہ ہائے زندگی کی تربیت کرنا ہے اور عالمِ تربیت میں کسی بھی واقعیت کو آنکھ بند کرکے قبول نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اسلام تمام ان واقعیتوں کی طرف متوجّہ ہے جو وجودِ انسانی سے متعلق ہیں۔

ماہیتِ انسان کے سمجھنے میں اسلام نے نہ تو آج کے انسان کی طرح سے اشتباہ کیا ہے اور نہ آج کے فاسد نظام سے آلودہ ہوا ہے۔ آج کے نظام نے انسان کے سمجھنے میں غلطی کی ہے کیونکہ کبھی تو انسان کو مقامِ الوہیت سے بھی اوپر اٹھا دیا جس کے نتیجے میں انسان بیجا غرور اور خود پسندی میں مبتلا ہوگیا۔ اور کبھی انسان کو پست ترین منزل یعنی غلامی میں پہنچا دیا۔اس سے اس کا ہر قسم کا ارادہ واختیار چھین لیا اور مادی وطبعی زیادتیوں کے مقابلے میں اس کو مجبور وبیکس بنا دیا۔ بلکہ اسلام نے انسان کو اس کا صحیح مقام دیا ہے اور بہترین ومناسب ترین صورت سے اس کی معرفی کی ہے۔ اور اس کی اہمیت وعظمت کو تمام موجودات کے مقابلے میں متعیّن کیا ہے۔

اسلام کے آئینے میں انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو عظیم ترین مقام کی حامل ہے۔ اور تمام مخلوقات میں اس کو ایک خاص منزلت حاصل ہے۔ اسلام نے بتایا کہ انسانی زندگی کا خاتمہ موت سے نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی زندگی ایک زندگیٔ جاوید ہے اس میں دنیاوی اور اخروی پہلو ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جاسکتے۔روح وبدن میں اتنا مکمّل اتصال و اتحاد قرار دیا ہے کہ عنصر روح وعنصر بدن میں کبھی شگاف نہیں پڑ سکتا اور اسی لئے اسلام نے دونوں جہان کے روشن ترین پروگرام کو پیش کیا ہے اور اسلام انسان کی ابدی تربیت کرنا چاہتا ہے۔

اگرچہ نوامیس عمومی اور دنیاوی تغیّر کے باوجود اسلام کے عقائد، اخلاق، احکام تمام چیزوں پر ابدیت کا سایہ ہے مگر پھر بھی مسائل امروزہ، معاشرے کے ضروری موضوعات پر آزادیٔ فکر وخیال واجتہاد کے دروازے کلّی طور پر کھول رکھے ہیں تاکہ مُتغیّر زندگی کے حالات کو نا مُتغیّر قانونِ شریعت کے سانچے میں ڈھالا جا سکے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان ایسی خواہشوں کا مالک ہے جو سراسر مادیت سے مربوط ہیں اور اسی کے ساتھ اس میں ایسی تمنائیں و جذبات بھی موجود ہیں جو مادیّت کی قیدو بند کو توڑ دینا چاہتے ہیں اور ارتقاء کی طرف مائل ہونا چاہتے ہیں چونکہ انسانی جسم و روح وعقل ہر ایک کے الگ الگ تقاضے ہیں۔ لہٰذا نہایت توجّہ اور غور و فکر کے ساتھ ایک مصلحت کو دوسری مصلحت پر مقدّم کئے بغیر ان کی طرف ملتفت رہنا چاہئے۔

اسلام انسان کی ہمہ جانب سعادت اور تمام مادی و معنوی تقاضوں کا لحاظ رکھتا ہے انسان کے فطری تقاضوں کی سرکوبی کئے بغیر اور مادی رشتوں کو قطع کئے بغیر امکانی حد تک آدمی کی طہارت و پاکیزگیِ طبیعت کا خیال رکھتا ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دو متضاد قطب کے درمیان ایک معتدل راستہ ہے۔ نہ تو ان عقائد و نظاموں کا قائل ہے جن کا مطلب رہبانیت اور فطری تقاضوں کی سرکوبی ہے۔ اور نہ حیوانیت کی حد تک آزادی و بے راہ روی جس کا ایک گروہ فرویڈین (FREUDIAN) وغیرہ قائل ہیں —— کی اجازت دیتا ہے۔

عالمِ تصورات میں ایک خیالی تھیوری کا نام اسلام نہیں ہے۔ اسلام انسانی روش زندگی کی تصحیح کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود ایک پُر معنی زندگی کا موجد بن کر آیا ہے۔ یہ ایسا نظام ہے جو جامع ہونے کے ساتھ متحرک وساز زندگی لئے ہوئے ہے۔ اسلام تنہا وہ زندہ سسٹم ہے جو زندگی کے بارے میں جامع طرز فکر رکھتا ہے۔ اسلام تمام مسلک و مکتب ہائے فکر کے درمیان جامع تر اور قوی تر آئیڈیالوجی پیدا کر سکتا ہے جو اپنے افق کی گہرائیوں کے لحاظ سے ان سب پر تفوق و برتری رکھتا ہو۔

اسلام نے خالص مادی طرزِ فکر کو رَد کر دیا ہے۔ اور مادے و اقتصادیات کی اولویت، اور اصل لذّت کو خوش بختی و سعادت کی بنیاد نہیں مانتا۔ اصولی طور پر آج کی موجودہ دنیا میں ان موجودہ نظام کا ـــــ جن کے پاس زندگی کا کوئی ہدف نہیں ہے اور جن کے پاس مادیات کے ماورا، کچھ بھی نہیں ہے۔ بنیادی اور کلّی طور سے مخالف ہے۔

اسلام انسان کو مادیت کی چہار دیواری میں قید نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی دعوت کی بنیاد اس سے کہیں زیادہ بلند اور وسیع ہے بلکہ مختلف لحاظ سے زندگی کے ہدفِ عالی سے غافل نہیں ہے۔ اسلام کی بنیاد ایسے معنوی، رُوحی، اخلاقی اصول پر رکھی گئی ہے جو عام و خاص ہر انسان کے مقتضیات کے مطابق ہے۔ اور اسلام نے اجتماعی تعاون و ہمکاری کے ساتھ ساتھ معیارِ زندگی کو بہت اُونچا کیا ہے۔ فرد و اجتماع کو محدود دائرے سے نکال کر زندگی کے اعلیٰ اقدار کی تلاش و جستجو پر آمادہ کرتا ہے اور انسانی قوّتوں کو تکامل و ترقی کی طرف کھینچتا ہے۔

اسلامی تربیت کی بنیاد اس طرح رکھی گئی ہے کہ انسانی عواطف کا تصفیہ و تہذیب کر کے اُن کو صحیح راستے پر ڈال دے اور اس مقصد کے حصُول کے لئے مکمّل بصیرت کے ساتھ قدم آگے بڑھاتا ہے۔

آدمی کے مزاج و طبیعت کے اندر جو محرک عوامل موجود ہیں ان کو فطری تقاضوں اور اصلی ضرورتوں کے مطابق ایک مخصوص و منظم طریقے پر لاتا ہے۔ اور ہر ایک عامل کا اس کے لحاظ سے اہتمام کرتا ہے۔ تند و تیز میلانات پر مختلف وسائل کے ذریعے کنٹرول کرتا ہے۔ تاکہ یہ خواہشاتِ عقل کو اسیر و محبوس کر کے آدمی کے سرنوشتِ وجود کو اپنے تابع کر لیں۔ اور اس طرح سے انسان کو ہولناک ہلاکت میں گرانے سے بچاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ہر فرد کی معقول کامیابی کو جائز سمجھتا ہے۔

اس طرح انسان بنائے زندگی اور پیش رفت حیاتی میں مسلسل اپنی کچھ قوّت کو زندگی کی

برقراری کے لئے صرف کرسکتا ہے۔ اور کچھ قوّت کو روحی میلانات اور معنوی تقاضوں میں استعمال کرسکتا ہے۔

جب افراد کی طبیعت و فطرت کے اندر یہ ہم آہنگی پیدا ہوجائے گی تو فرد و اجتماع دونوں منظم ہوجائیں گے اور دونوں کی رفتار معتدل ہوجائے گی اور انسان کی پوری زندگی معیاری ہوجائے گی۔

اور چونکہ اس تربیت کی بنیاد عقلی بنیادوں پر ہے اس لئے عقائد کے پاک اور اوہام سے خالی سلسلے کی طرف دینی تبلیغ ہوتی ہے اور ایسے عملی قوانین و اخلاقی فضائل کی طرف دینی تبلیغ ہوتی ہے جس کی صحت کا ہر انسان خداداد عقلی قوّت سے ادراک کرسکتا ہے۔

اسلام کی ساری تعلیم اور ساری تکلیف ہر فرد کی طاقت و قوت کے اندر ہی اندر ہے۔ احکام کے نافذ کرتے وقت بشری طاقت و قوّت کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اسلام کسی بھی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ قیامت کے دن ہر شخص سے اس کے ارادے و توانائی کے لحاظ سے دئے گئے فرائض کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

آج کے دور میں حقوق کا دارومدار رائے عامہ کے اُوپر ہے۔ ڈیموکراسی نظامِ قانون کی بنیاد رائے عامہ (یعنی ۵۱ فیصد) پر ہے۔ معاشرے کی قسمت کا فیصلہ رائے عامہ کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں کیا جاتا۔ اس دور میں اقلیت (۴۹ فیصد) کی رائے ناقابلِ اعتنار سمجھی جاتی ہے چاہے اقلیت کی نظر کتنی ہی دقیع اور واقعیت رکھتی ہو۔ مختصراً یہ ہے کہ آج کی متمدن دنیا رائے عامہ ہی کو معاشرے کا مقدّس ترین ذریعہ سمجھتی ہے بقول علاّمہ اقبالؒ جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ تمام ارزش ہائے مادی و معنوی کی برگشت آخر کار پبلک کی رائے ہوا کرتی ہے۔ لیکن تشریع اور وضع قانون

کا حق اسلامی نقطۂ نظر سے خدا اور صرف خداوند قدوس کو حاصل ہے۔ یہاں بے بند و بار جمہوریت کے خواہشات پر کوئی قانون وضع نہیں کیا جاتا۔

اسلامی نظریہ میں قانون گزاری مقامِ الوہیت سے الگ کی ہی نہیں جاسکتی۔ الوہیت کے سلسلے میں اسلامی تصوّر کی شعاعیں ساری دنیا میں آدمی کے تمام شعبہ جات حیات پر منعکس ہوتی ہیں جس طرح پرستش و عبادت صرف خدا کے لئے ہے اسی طرح حکومتِ مطلقہ، وضع قوانین، قہر و بندگان میں امر و نہی کا انفاذ بھی صرف خدا کی ذات سے مخصوص ہے کسی بھی فرد کو —— خواہ وہ کتنا ہی اہم ہو —— وضع قانون یا انفاذ اوامر کا حق نہیں دیا گیا۔ اور یہ بات کتنی غیر دانش مندانہ ہے کہ لائقِ عبادت تو خدا کو سمجھا جائے اور نظامِ زندگی کا دستور از خود بنایا جائے اور ہر جگہ خدا کے دستور کی اتباع کی جائے۔؟

اس سے معلوم ہو گیا کہ حاکمیت کے موضوع میں (بھی) خدا کا کوئی شریک نہیں ہے اور کسی کو یہ حق بھی نہیں ہے کہ خدا کے مقابلے میں خود قوانین وضع کرلے۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے کے تمام شعبوں میں حق کا بول بالا رہے، حق کی حکومت رہے، کیونکہ حق کسی بھی اجتماعی، سیاسی، اقتصادی حالت کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ یہ قیمتی لباس صرف قامت انسانی کے لئے سِلا گیا ہے۔

یہ یاد رکھئے کہ قامتِ انسانی جتنی پیچیدہ و پُر اسرار ہے اتنی ہی آدمی کے زندگی سے مربوط قوانین بھی پیچیدہ و پُر اسرار ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ وجودِ انسانی کے تمام پر پیچ اسرار اور معاشرے کے رُوحی و جسمانی روابط سے پیدا ہونے والے پیچ در پیچ کیفیات سے پورا پورا واقف و مطلع ہے۔ اسی طرح کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ لغزشِ گناہ یا گناہ سے محفوظ ہے اور انسان کی تمام سعادت و نیک بختی سے کماحقہٗ آگاہی رکھتا ہے۔

چونکہ انسانی علم و دانش محدود ہے اس لئے انسانی وجود کا معمہ جوں کا توں ہی باقی ہے حالانکہ دانشمندوں کی طرف سے وجودِ انسان کے راز کو منکشف کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ تلاش و جستجو کی گئی۔

مشہور و معروف ڈاکٹر الکسس کیرل (Dr. ALEXISCARREL) لکھتا ہے کہ انسان نے اپنے پہچاننے میں ضرورت سے زیادہ توجہ دی اور کوشش کی، لیکن اس سلسلے میں دانش مندوں، فلاسفہ، بزرگوں، شعراء کی طرف سے جو معلومات مہیا کی ہیں اُن سے ہم اپنے اندرونی عالم کے بعض معین جہات کو تو پہچان سکے ہیں لیکن اپنے سراپا کو اب تک نہیں پہچان پائے۔ ہماری نظر میں انسان ایک ایسا مرکب موجود ہے جو ہمارے ہی بنائے ہوئے وسائل و آلات کے ذریعے سے مشخص تو ہو گیا ہے لیکن اس مرکب کے اجزاء کے گرد و پیش اتنے ہالے پڑے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان سے ہم حقائق کو نہیں درک کر پائے اور یہی مجہولیت ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ مزید تلاش جاری رکھیں۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری بے بسی اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے کیونکہ بہت سے سوالات کو تو خود اہلِ فن ـــــ یعنی جو لوگ نوعِ بشر کے مطالعے میں مشغول ہیں ـــــ ابھی تک نہیں حل کر پائے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے باطنی دنیا کے بہت سے میدان ابھی ایسے باقی ہیں جو تسخیر نہیں کئے جا سکے۔

اور یہ بات بھی بدیہی ہے کہ دانش مندوں نے انسان کا مطالعہ کر کے جو کچھ بھی سمجھا ہے وہ کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ گویا ہم ابھی "خود شناسی" کے بالکل ابتدائی مراحل میں ہیں[1]

جب ہم انسان کے کامل اسرار کو اب تک نہیں پہچان پائے تو پھر ہمارے لئے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم ایسے قوانین بنا سکیں جو صد در صد نوعِ انسانی کے مفاد میں ہوں۔

---

[1] اسلام موجود ناشناختہ

اور جو مشکلات بشری کے انبوہ کو عادلانہ طریقے سے حل کر سکیں۔ سب سے زیادہ واضح دلیل دانش مندوں کی وہ حیرت و پریشانی ہے جو اُن کے لئے نت نئے دن نو بہ نو مشکلات کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور مُرتّب شدہ قوانین کو تغیّر و تبدّل پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسی ناگزیر باتیں درمیان میں ہیں جن کی وجہ سے ہم قانون ایجاد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مثلاً انسان میلانات طبعی و خواہشاتِ نفسانی، مالی منفعت حبِّ جاہ، معاشرے میں رہنے سہنے کی وجہ سے مخصوص افکار سے مُبرّا نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے قوانین وضع کرتے وقت اپنے نظریات، خواہشاتِ نفس کو دخل دے کر رہے گا۔ اور دانستہ یا نادانستہ وہ ایسے قوانین بنائے گا جس میں ان کے مفادات کی جھلک ہو گی۔

دنیا میں کوئی ایسا قانون بنانے والا نہیں ہے جس کے نظریات کی چھاپ قانون پر نہ پڑی ہو۔ اور نہ ایسا کوئی قانون اب تک بنایا جا سکا ہے جس میں قانون بنانے والے کے نظریات جذبات محبّت و نفرت کی چھوٹ نہ پڑی ہو۔ ہر قانون بنانے والا ــــ چونکہ مخصوص عواطف و نظریات کا حامل ہوتا ہے اس لئے ــــ قانون بناتے وقت اپنے نظریات کو ٹھونسنا چاہتا ہے۔ ارسطو نے قانون بناتے وقت کبھی تو اپنے نفرت و کینہ کا اظہار "جو اس کو افلاطون سے تھا" کیا ہے اور کبھی سکندر سے اپنی محبّت و رجحان کا اظہار کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ افلاطون چونکہ آتھینز (ATHENES) قوم کے استبداد سے متنفّر تھا اس لئے اس کے قوانین میں اس نفرت کا احساس بھی موجود ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قانون میں قانون بنانے والے کے نظریات داخل ہو جاتے ہیں اور کبھی تو صرف پورے کا پورا قانون قانون بنانے والوں کے نظریات کا تابع ہو جایا کرتا ہے[1]

آج کی دنیا میں آزادی، برابری جیسے خالی نعرے تو ضرور لگائے جاتے ہیں لیکن حقیقت کو کسی قیمت پر نہیں چھپایا جا سکتا۔ چنانچہ عصرِ جدید میں وضعِ قوانین کے سلسلے میں

---

[1] رُوح القوانین۔ صفحہ ۵۹۳

رائے عامہ ہی ظاہری و خیالی سیاست کا چہرہ ہے۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت رائے عامہ نہیں ہے بلکہ حکمران طبقے کی رائے ہے جس نے عوامی رنگ اختیار کیا ہے۔

ہنری فورڈ اپنے ملک کے لئے ـــــ درحقیقت دنیا میں ڈیموکریسی کی ابتداء یہیں سے سمجھی جاتی ہے ـــــ کہتا ہے کہ مارچ ۱۹۲۶ء میں انگلستان کے اندر جب رائے عامہ شدّت اختیار کر گئی اور حکومت نے اپنی پوری کوشش اس کے ختم کرنے میں صَرف کر دی اور ناکام رہی، تو ایک مرتبہ اس قانون کا سہارا لیا گیا جس کو دولت مندوں نے بنایا تھا اور اعلان کیا گیا کہ یہ بات اصول مملکت کے خلاف ہے بس پھر کیا تھا پولیس اور فوج بندوق لے کر میدان میں آگئی اور لوگوں کو بھوننا شروع کر دیا۔ اور اسی کے ساتھ ریڈیو، اخبار سب ہی نے آواز پر آواز ملانا شروع کر دیا اور کہنے لگے، یہ وہ حکومت ہے جو مزدوروں کی خدمت گزار ہے اور اس کے بعد مزدور لیڈروں کو قید، اور ضبطی مال کی دھمکی دی گئی۔

روسی کمیونسٹوں کی مرکزی پارٹی کی بائیسویں کانفرنس میں خروشچیف نے مزدوروں کے نظامِ حکومت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ماضی میں جب شخصیت پرستی تھی (اس سے اسٹالین کا دور مُراد ہے) تو حزب دولتی کی لیڈرشپ اور اقتصادی شعبوں میں بہت سے مفاسد پیدا ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس وقت آمرانہ حکم نافذ کیا جاتا تھا حقیقت کو پامال کیا جاتا تھا۔ کام بہت احتیاط سے کیا جاتا تھا۔ مستقبل کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ اور اسی لئے اس وقت چاپلوسوں، خاکساروں غلط گو، جھوٹ بولنے والوں کی کثرت ہو گئی تھی۔

مشرق و مغرب میں ان حکومتوں کا یہی عام طریقہ ہے۔ لیکن اس حقیقت پر رائے عامہ، پارلیمنٹ، قومی کمیٹی کا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو دھوکا دیا جا سکے۔

ان نظاموں کے سارے کے سارے قوانین ـــــ چاہے وہ کمیونسٹوں کی حکومت ہو، یا سرمایہ داروں کی ـــــ چونکہ آسمانی دستور کے مطابق نہیں بنائے گئے ہیں اس لئے

خواہ مخواہ اور ناگزیر طور پر اس میں حکمراں طبقے کے مفاد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

جین جیکس روسیو (JEAN JACQUES ROUSSEAU) لکھتا ہے۔ ایسے قوانین جو تمام ملتوں کے لئے مفید ہوں ان کے بنانے والے کو عقلِ کل ہونا ضروری ہے۔ جو انسانی شہوتوں کو دیکھتا تو ہو لیکن خود اس سے متاثر نہ ہو۔ فطرت سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھتا ہو مگر نبّاض فطرتِ انسانی ہونا چاہیئے۔ انسانی سعادت و نیک بختی میں وہ ہمارا محتاج نہ ہو۔ ہم اس کے محتاج ہوں[1]

مندرجہ بالا باتوں کے پیشِ نظر بہترین قانون کا وضع کرنے والا، صرف ذات پروردگار عالم ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ کیونکہ وہی انسان کے اسرارِ وجود سے بخوبی واقف ہے۔ اس کو معاشرۂ انسانی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا وہ تمام انسانوں سے بے نیاز ہے اور تمام انسان اس کے محتاج ہیں، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ معاشرے کے صحیح قوانین کو صرف ایسے شخص سے حاصل کیا جا سکتا ہے جس پر خدائی الہام ہو اور جس کی ساری تعلیم سرچشمۂ وحی کے تابع ہو۔ اور جس کا تکیہ خدائے قدوس کے غیر محدود علم پر ہو۔

خدائی قانون اور بشری قانون میں ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ بشری قوانین کی بنیاد معاشرہ ہے۔ انسانی قوانین معاشرے کی حد سے باہر نہیں ہو سکتے کیونکہ اس سے ماوراء کا تصور نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسے تمام مسائل جن کا تعلق معاشرے سے نہ ہو انسان اُن کے لئے کیونکر قوانین وضع کر سکتا ہے؟ اور باطنی اصلاح کیونکر قانون کے ذریعے کر سکتا ہے کیونکہ انسان کو باطن کا علم ہی نہیں ہے۔ باطن کی خرابیاں جب عمل کی منزل میں آئیں اور اس سے معاشرہ متاثر ہونے لگے تب قانون بن سکتا ہے مگر اس سے پہلے ممکن نہیں ہے۔ اب اگر ایک فرد تمام روحی و اخلاقی مفاسد میں گرفتار ہے اور اس کا باطن مختلف قسم کے نقائص کا مرکز

---

[1] قرارداد اجتماعی صفحہ ۳۳۶

ہے تو قانون کی زبان وہاں پر خاموش رہے گی۔ مغربی دنیا کی حکومت کے جتنے بھی قوانین ہیں ان سب کا دارومدار انسانوں کے اعمال ہیں۔ لوگوں کی طہارتِ قلب، پاکیزگیٔ نفس سے اُن کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ برخلاف اس کے اسلامی دستور کی شعاعیں اتنی وسیع ہیں کہ جن کے حدُود سے کوئی چیز باہر نہیں جاسکتی۔

اسلام معاشرے کے اصلاح کے ساتھ کل آنے والی زندگی کی تربیت واصلاح کی طرف متوجّہ ہے۔ اور کل کی معنوی شخصیت کو اصل مان کر اس کے لئے بھرپور توجّہ کرتا ہے۔

اسلام کا مطمحِ نظریہ ہے کہ معاشرہ منظّم ہو، اخلاق پاک ہوں، فکر و عمل صحیح ہو، روح کامل ہو، اسی لئے ہر چیز کے لئے اسی نے حکم دیا، اور اپنے وسیع ترمعنی کے لحاظ سے ہر جگہ حکومت بھی کرتا ہے۔ اسلام جس طرح دست گاہ آفرینش کے چھوٹے بڑے پیدا ہونے والے حالات میں نظم وسکون رکھنا چاہتا ہے اسی طرح مادی، معنوی زندگی، فرد و معاشرہ، نتائج میں بھی نظم وسکون برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ انسان ان اصولوں سے ــــ جو نظامِ آفرینش پر منطبق ہیں ــــ رتّی برابر علیحدگی نہ اختیار کرے کیونکہ ان اصولوں کی مخالفت تمام شعبہ ہائے انسانی کو درہم وبرہم کرکے رکھ دے گی۔

بشری قوانین میں انتظامیہ اجرائے قانون کرتی ہے۔ لیکن اسلام کے اندر اجرائے قانون کا ذمّہ دار مضبُوط و گہرا ایمان ہے۔ ان مقامات پر جہاں خدا کے علاوہ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے سچّا مسُلمان اپنی ایمانی طاقت اور دینی ذمّہ داری کی بنا پر اپنے فرائض کو باحسُن وجوہ انجام دیتا ہے۔ صرف چند محدُود جگہوں پر ان افراد کے لئے جو سُست عقیدہ یا مُنافق ہیں وہاں اسلام انتظامیہ کا سہارا لیتا ہے۔ خلاصہ یوں سمجھئے اسلام پاکیزگیٔ قلب اور نیکیٔ عمل دونوں کی ضرورت کا احساس رکھتا ہے۔ اور پاک اعمال کی اچھی جزا دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خلوص پر مبنی ہوں اور ان میں ایمان کے سرچشمے سے استفادہ کیا گیا ہو۔

کتاب حقوق در اسلام کے مقدّمے میں تحریر ہے، امریکی قانون صرف محدُود حد تک

وظائف اخلاقی کا اجراء کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی باشندہ مطیعِ قانون ہونے کے باوجود اخلاقی لحاظ سے ایک پست فطرت و کمینہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی قوانین کا سرچشمہ ارادۂ الٰہی ہے، وہ ارادہ جس کا اظہار اس نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر کر دیا۔ یہ قانون اور یہ ارادۂ الٰہی تمام مومنین کو ایک معاشرہ سمجھتا ہے چاہے وہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے ہوں اور چاہے وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی دور واقع ہوں۔ ان سب کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے والی چیز مذہب ہے جغرافیائی حدود اس کی علت نہیں ہیں۔ یہاں خود حکومت قرآن کی تابع و فرماں بردار ہوتی ہے (افراد اور معاشرے کا کیا سوال؟) یہاں کسی دوسرے قوانین کے وضع کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ تنقید و نفاق و شقاق تو بہت بڑی بات ہے۔ مومن کی نظر میں یہ دنیا اس سے بہتر دوسری دنیا کی دہلیز ہے۔ اور قرآن باہمی رفتار معاشرے و افراد کے فیما بین تعلقات کی حد معین کرتا ہے۔ تاکہ اس عمل کو دوسری دنیا کے لئے ذخیرہ کیا جا سکے۔

عام مغربی مفکرین کا نظریہ اسلام کے بارے میں ناقص کیا انتہائی ظالمانہ ہے یہ لوگ کبھی کبھی تو مقصد برآری کے لئے واقعات کو توڑ مروڑ دیتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بعض ایسے بھی مفکرین ہیں کہ جنھوں نے اسلامی تعلیمات کی گہرائی اور حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔ اور پھر وہ بانیٔ اسلام اور اُن کی پُرارزش تعلیمات کو سراہا بھی ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ایک مسلمان کا قوانین و اسلامی نظام کی تعریف کرنا پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی علمی شخصیت جو مسلمان نہ ہو بلکہ مذہبی تعصبات کا شکار ہو وہ عظمتِ اسلام اور بانیٔ اسلام کا اقرار کرے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔

اسلامی مقدس و محترم قوانین کے سامنے جس چیز نے ان لوگوں کو سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا ہے وہ صرف حیرت انگیز و مترقی نظام ہے جس کو دنیائے انسانیت کی بزرگ ترین شخصیت اور عالمِ اسلام کے عالی قدر رہبر نے جہاں بشریت کے سامنے پیش فرمایا ہے۔

مغربی مفکّرین کے اقوال کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنے مذہب کے افتخارات کو غیروں کی زبان سے سُننا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس نقل کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو ئندگان حقیقت کے دلوں میں کسی قسم کا تردّد و شک باقی نہ رہ جائے۔

اٹلی کے مشہور پروفیسر اور ناپل یونیورسٹی کا استاد ڈاکٹر لورا ویکیا ویگلیری (DR. LAORAVACCEA VAGLIERI) قرآن مقدس کے لئے لکھتا ہے: میں عقل وفہم کے وہ ذخیرے اور خزانے اس کتاب میں دیکھتا ہوں جو ذہین سے ذہین شخص، بڑے سے بڑا فلسفی، قوی سے قوی سیاسی شخص کے استعداد و صلاحیت سے بہت ہی اونچے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں اس کو ایک پڑھا لکھا شخص نہیں بیان کر سکتا، چہ جائیکہ ایسا شخص جس کی پوری زندگی ایسے غیر مہذب لوگوں میں گزری ہو جن کو دین و دانش سے دُور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ اور وہ شخص بھی اپنے کو تمام افراد کی طرح ایک فرد سمجھتا رہا ہو۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ خدائے قادر کے مدد بغیر وہ ایسا معجزہ نہیں پیش کر سکتا۔ قرآن کا ماخذ و مصدر خدا سے ماخوذ ہے جس کا علم سارے زمین و آسمان پر محیط ہے۔

برنارڈ شاؤ (BERNARD SHAW) اپنی مشہور کتاب محمدؐ اپوسٹلے آف اللہ (MOHAMMAD-A-POSTIF OF ALLAH) میں تحریر کرتا ہے۔ میں ہمیشہ اسلام کی عزّت و احترام کا قائل رہا ہوں۔ میری نظر میں صرف اسلام ہی تنہا وہ مذہب ہے جو زندگی کی بدلتی ہوئی تصویروں کا ساتھ دے سکتا ہے اور جو مختلف قرون میں گوناگوں حالات کے مقابلے کی استعداد رکھتا ہے۔ میں آج ہی سے پیشین گوئی کر رہا ہوں کہ ابھی سے اس بات کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کل کا مغرب کُل کا کُل مسلمان ہوگا ـــــ قرونِ وسطیٰ کے علماء یا تو بر بنائے تاریکی یا بر بنائے جہالت دینِ محمدؐ کے لئے نامناسب باتیں کہا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں اسلام عیسائیت کا ضد تھا لیکن

میں نے جب مافوق العادۃ شخص کا مطالعہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ ان کا دین تو عیسائیت کے مخالف نہیں ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے بشریت کا نجات دہندہ صرف اور صرف یہی دین ہو سکتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر آج کی جدید دُنیا کی قیادت محمدؐ جیسے شخص کے ہاتھ میں ہو تو اُس کی مشکلات حل ہو جائیں گی اور انسان کی ازلی خواہش "صلح و سعادت" عملی اور محفوظ ہو جائے گی۔

والیٹرے (VOLTARE) جو شروع میں اسلام کا شدید ترین مخالف تھا اور رسولِ اکرم کے بارے میں بہت غلط عقیدہ رکھتا تھا، چالیس سالہ مطالعے کے بعد اصل حقیقت تک پہنچا اور اس کے بعد اس نے صراحتاً اعلان کیا: محمدؐ کا دین یقیناً عیسائیت سے بہتر ہے اسلام ہرگز عیسائیوں کے جنون کفر انگیز سے دوچار نہیں ہوا، وہ ایک کو تین اور تین خدا کو ایک نہیں کہتا۔ اسلام کا بنیادی مسئلہ خدا کی وحدانیت ہے۔ اسلام بانیٔ اسلام کی جوانمردی اور اخلاق سے پھیلا ہے، برخلاف عیسائیت کے کہ اس کی ترویج تلوار کے زور سے کی گئی ہے۔ کاش تمام مغربی اقوام خدا کو اسلام کے نظریہ کے ماتحت ماننے لگیں[1]۔

والٹیرے (VOLTARE) نہایت ہی محترم و بزرگ شخص مارٹین لوتھر (MARTIN-LUTHER) کے بارے میں ——— کہتا ہے: لوتھر اس لائق بھی نہیں ہے کہ محمدؐ کے جوتوں کا تسمہ کھول سکے۔ محمدؐ بلاشک بہت بزرگ شخص تھے اور بڑے بڑے شخصوں کی پرورش بھی کی ہے۔ معقول دین، انصاف پسند مذہب کے لانے والے پرہیزگار ترین شخص محمدؐ تھے جو روئے زمین پر سب سے بڑا انقلاب لائے[2]۔

مشہور روسی فلسفی ٹالسٹائی کہتا ہے: محمدؐ کے فخر کے لئے یہی بات کافی ہے کہ پست و جنگجو، خونریز قوم کو بری عادتوں سے نکال کر ترقی کے راستے اُن کے لئے کھول دے۔ عقل و حکمت کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے محمدؐ کا دین عالمگیر ہو جائے گا[3]۔

---

[1] اسلام از نظر والیٹرے صفحہ ۹۹ [2] کتاب والیٹر جلد ۲۴ صفحہ ۵۵۵ [3] کتاب قہرمانان

کم نظری

دُنیا کے دانش مندوں پر اسرارِ جہاں کو اتنا کشف کرنے اور اتنی زیادہ علمی ترقیوں کے باوجود اب تک نہ جانے کتنے مسائل ہیں جو اب تک ان کے لئے مجہول ہیں مجہولات کی دَریا میں انسانی معلومات کی حیثیت ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہے۔ دنیا کے مفکرین ابھی تو اقتصادی، اجتماعی، سیاسی مسائل کی زندگی الف سے با کی تشخیص میں حیران و پریشان ہیں۔ دانش مندوں کے عقائد و نظریات مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے عقلا دو حصّوں میں بَٹ چکے ہیں۔ ہر فریق نے اپنے خیال کی درستگی اور دوسرے کے نظریات کی تردید کے لئے ہزاروں کتابیں اور رسالے لکھ ڈالے ہیں اور ہر فریق کا نظریہ یہ ہے کہ دوسرے کے عقائد موجبِ بدبختی و شقاوت ہیں اور ہمارا ہی نظریہ خوش بختی اور سَعادت کا اصلی ضامن ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ سارے کے سارے متضاد نظریات صحیح تو ہو نہیں سکتے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ناقابل انکار ہے کہ علمی و صنعتی ترقی کے میدان میں دونوں نے قابلِ غبطہ حد تک ترقی کی ہے۔

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مغربی ممالک نے جس قدر بہترین قسم کی ترقی علم کی بَدولت کی ہے اسی قدر انسانی زندگی میں بھی شایانِ شان ترقی کی ہے وہ نہایت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ ایک معاشرے کی کسی بھی شعبے میں علمی ترقی و پیش رفت کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ اس نے زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کرلی ہے۔ مثلاً ایک فیزیا جاننے والے یا ایک ماہر و تجربہ کار حکیم کے لئے بہت ممکن ہے کہ وہ فنِ تعمیر سے کوئی اطلاع ہی

نہ رکھتا ہو۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ صنعتی اور فنّی لحاظ سے پیش رفت کرنے والا معاشرہ انسانی فضائل و اخلاق، اجتماعی آداب میں بھی پیش رفت رکھتا ہو۔ قسم قسم کے مفاسد، بے سروسامانی، مختلف نقائص کو دیکھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ مغربی ممالک بہت سے عناصر تمدّن مثلاً فکر، دانش، مذہب، حکومت، اخلاق وغیرہ میں بہت پیچھے ہیں ان شعبوں میں ترقی نہیں کر سکے۔

ڈاکٹر اے کیرل (Dr. A. CARREL) آج کی ناقص زندگی کا تجزیہ اپنے ان لفظوں سے کرتا ہے: آج کا تمدّن سخت قسم کی دشواریوں میں پڑ گیا ہے۔ کیونکہ وہ ہماری طبیعت و فطرت کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ اس تمدّن کا وجود ہماری حقیقت شناسی پر نہیں ہوا ہے موجودہ تمدّنِ علمی اکتشافات، جنسی خواہشات، کا دین ہے۔ یہ تمدّن اگرچہ ہماری ہی کوششوں سے بار آور ہوا ہے لیکن ہمارے اوضاع و حالات کے لئے قطعاً مناسب نہیں ہے۔ اہلِ نظر ایجاد تمدّن بخاطر نفع بشر کرتے ہیں لیکن یہ انسان کے لئے سازگار نہیں ہو پاتے۔

اس سلسلے میں ہر چیز کا معیار انسان کو قرار دینا چاہئے۔ اور ہوتا یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے بالکل برخلاف عمل کرتے ہیں۔ انسان خود ہی خود اپنی دنیا بنانے پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ تنہا کسی بھی چیز کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔

غیر زندگانی علوم کا زندگانی علوم پر عظیم برتری بھی بشریت پر جنایت کاری ہے۔ ہم درحقیقت بدبخت ہیں کیونکہ علم و اخلاق سے گرے ہوئے ہیں۔ آج اگر ان قوموں، اور معاشروں پر نظر ڈالی جائے جو غیر زندگانی علوم میں اوجِ ترقی پر پہنچے ہوئے ہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ اتنے سُست و کمزور ہو چکے ہیں کہ بہت جلد اپنی پہلی والی وحشی زندگی کی طرف پلٹ جائیں گے[1]

---

[1] انسان موجود ناشناختہ

مختلف شعبوں میں آدمی کی تکمیل ایک ایسے صحیح اور جامع سلسلۂ تعلیم کی محتاج ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر بھروسہ رکھتا ہو اور ہر قسم کی غلطی و اشتباہ سے بری ہو۔ اور یہ سلسلۂ تعلیم انبیاء کی پیروی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جن کا خلّاقِ کائنات سے رابطہ ہوتا ہے۔ جو بھی اخلاق ایک مافوق فطرت طاقت کا سہارا لئے ہو اور ماورا، مادیات سے الہام نہ حاصل کرتا ہو اور صرف تربیت کی بنیاد پر اس کو قائم کیا گیا ہو، نہ وہ دائمی ہوتا ہے اور نہ اس میں پیش رفت کی صلاحیت ہوتی ہے۔

انسان نے جب سے جہانِ ہست و بود میں قدم رکھا ہے اور انسانی تمدّن کی بنیاد پڑی ہے اسی وقت سے اس کے وجود کی گہرائیوں سے ایک بلند دین کا مطالبہ ہوتا رہا ہے اور یہی چیز ہمیشہ نظمِ اخلاقی کی حفاظت کی ذمّہ دار رہی ہے۔

آج کی دُنیا میں خلافِ انسانیت افعال" مثلاً حق کشی، ظلم و ستم، استعمار، خونریزی، جنگ اس بات کے گواہ ہیں کہ آج کی حکومتیں اور آج کے قوانین میں اس بات کی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ بشری احساسات و عواطف و ایمان کی جگہ لے سکیں۔ اور ایک مبنی بر انصاف اجتماعی نظام قائم کر سکیں جس کا مقصد صلح و صفائی کی ایجاد و ترقی ہو۔ علم و دانش اپنی تمام ترقیوں کے باوجود دین سے بیگانہ ہو کر صحیح معاشرتی نظام کے قیام اور اخلاقی انحرافات و مشکلات زندگی کے حل پر قادر نہیں ہے۔

مشہور امریکی فلسفہ ویل ڈورانٹ (WILL DURANT) لکھتا ہے: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت کے پاس اتنی طاقت، اقتصادی و اخلاقی مضبوطی ہے کہ جو کسی بھی قوم کے تمام علمی، اخلاقی، فنی میراث کو ـــــ جو اس قوم کا اصلی سرمایہ ہوتا ہے ـــــ محفوظ کر سکے اور اس میں کچھ اضافہ کر سکے اور آئندہ قوم کے لئے منتقل کر سکے۔؟

آخر امریکہ کے بڑے بڑے شہروں پر چھوٹے چھوٹے لوگ کیوں حکومت کر رہے ہیں، اور کیوں تشکیلات ادارے اس قسم کے ہیں کہ جن میں نہ تو حسنِ سیاست ہے نہ وطن پرستی۔؟

آخر آج کیوں انتخابات میں فساد، اموالِ عمومی میں میل و انحراف اتنا زیادہ ہو چکا ہے کہ اس کے ظاہر ہو جانے سے نہ تو لوگوں کو غصہ آتا ہے نہ اور کسی قسم کا ردعمل ہوتا ہے۔ آخر آج حکومت کا بنیادی مقصد جرائم کا روکنا ہی کیوں ہو گیا ہے؟ آج حکومتوں کو معاہدات صلح میں کیوں جنگ کے آثار دکھائی دیتے ہیں[1]؟

مغربی معاشرہ اپنی قوتوں کے محدود ہونے کی وجہ سے اخلاقی برائیوں کو ایک حد تک تو برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی ہمیشگی بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی تمدن اسی وقت تک اپنی بنیادوں پر قائم رہ سکتا ہے جب تک اسباب و مقصد اور قدرت و اوصاف میں ہم آہنگی باقی رہے۔ لیکن جب یہ ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے اور تباہ کاری اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے، تو پھر ایسی صورت میں کسی بھی نیکی و اچھائی کا ظہور ناممکن ہو جاتا ہے اور اس انحطاط اور ناہم آہنگی کا نتیجہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں آپ کو کوئی ایسی قوم و ملت نہیں ملے گی جو اپنی شہوت پرستی، اخلاقی زبوں حالی کے باوجود مضبوط و پائدار رہی ہو۔!

عظیم رومی شہنشائیت کے ختم ہونے کا سبب یہی بات ہے۔ آج یونان کی عظمت و بزرگی کیوں خاک میں مل گئی؟ فرانس کی عیاش قوم نے نازیوں کے پہلے ہی حملے میں کیوں گھٹنے ٹیک دیئے؟ فرانس کا ایک مشہور جنرل اپنی یادداشت میں لکھتا ہے: فرانس کی قدیم و عظیم سلطنت کے ختم ہونے کا سب سے بڑا سبب ہموطنوں کی عیاشی اور شہوت پرستی تھی۔

اسپنگلر (SPENGLER) کا عقیدہ ہے کہ مغربی تمدن ایک دن زوال پذیر ہو جائے گا۔ وہ صریحاً اعلان کرتا ہے: دوسری زمینیں تمدن و تہذیب کا گہوارہ بنیں گی اور یہ تو کسی کو نہیں معلوم کہ دوبارہ سرزمینِ مشرق پھر گہوارۂ تمدن نہ بنے گی! لیکن گمراہ تمدن کے محلوں کا سرنگوں ہونا خود بخود ایک عادل نظامِ زندگی بخشنے کا ذمہ دار ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ لوگوں کے لئے ایک فرصت ہے کہ الٰہی نظام کی طرف میلان پیدا کریں اور اس حقیقت کو مان لیں اور اپنی زندگی کی بنیاد نیکیوں پر رکھیں۔ یہی وہ حساس

---

[1] لذات فلسفہ صفحہ ۳۲۶، ۳۲۷

موقع ہوتا ہے کہ اگر اس وقت الٰہی نظام کا استقبال نہ کیا گیا اور لوگوں کو صحیح راستہ نہ دکھایا گیا تو ایک گمراہی سے بچ کر دوسری گمراہی میں مبتلا ہو جانا قہری بات ہے۔

مغرب کی صنعتی ترقی کے مقابل میں آج ہم احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ مشرقی اقوام کے دَر و دیوار سے احساسِ کمتری نمایاں ہے۔ بہت سے مسلمان مغربی تمدن کے اتنے دلدادہ ہیں کہ ہر چیز کو مغربی عینک سے دیکھتے ہیں۔ مغربی افکار ان کے اندر اتنے راسخ ہو چکے ہیں کہ اب ان کا عقیدہ ہی یہ ہو گیا ہے کہ ترقی و پیش رفت کے لئے قدم بقدم اصول ہوں یا فروع، اخلاق ہوں یا آداب یا قوانین، غرض دنیا کی ہر چیز میں مغرب کی تقلید واجب و لازم سمجھتے ہیں۔ مغرب سے آئی ہوئی ہر بات ان کے لئے حدیث و قرآن ہے۔ ہر مغربی نظریہ کو قبول کر لینا حیاتِ ابدی سمجھتے ہیں۔ مغربی علمی تمکن ان کے ذہنوں پر اتنا چھا گیا ہے کہ بہت ہی آسانی کے ساتھ وہ اپنے ارادے، مادی و معنوی سرمایہ، مذہبی و ملی سنن و آداب کو اس کے قدموں پر نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔ مغرب کی پیروی ہی کو متمدّن معاشرے کی بنیاد مانتے ہیں۔ مسلمانوں کی مادی و معنوی قوت کی مفلوجی اور ان کی ذلت و بدبختی کی سب سے بڑی وجہ یہی ذہنی تقلید ہے۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ مغرب کے پاس صرف ان مسائل کا حل ہے جو فکر و قیاس میں آتے ہیں لیکن جو مسائل مغرب کے فکر و قیاس میں نہیں آتے ان کا حل ان کے پاس بالکل نہیں ہے۔ اور آج کا انسان جن اہم ترین مسائل سے دوچار ہے ان کا حل لیبوٹریوں میں نہیں ہے۔ ان کا حل صرف اسلام میں ہے مگر یہ کوتاہ اندیش کبھی اسلامی طرزِ فکر پر غور کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ اور نہ حوادثاتِ عالم کو اسلامی نگاہ سے دیکھنے کی زحمت کرتے ہیں۔ حالانکہ مسلم معاشرے سے ربط و ضبط رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ دین نام کی چیز جانتے ہی نہیں اور اسلامی تمدّن سے بالکل ہی بیگانہ ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین و احکام کو اور مسلمانوں کے آداب و رسوم کو مغربی نظریئے سے حل کریں۔ اس لئے وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

ایک اسلامی مفکّر کہتا ہے۔ ہم کیوں نہ ایسے نظام کو قبول کر لیں جو ہم کو نہ تو کمیونسٹوں میں

گھسیٹتا ہو اور نہ سرمایہ داروں میں اس کے برخلاف کامل اجتماعی عدالت کا حامل ہو اور ہم کو ایک بین المللی شخصیت بناتا ہو۔ ایسا نظام جو دنیاوی حکومتوں میں ہمارا کھویا ہوا وقار واپس کرتا ہو، ہم کو اور بشریت کو جنگوں سے بچاتا ہو۔ جب اس دین میں خود ہی ایسے قوانین ہوں جو ہمارے داخلی مشکلات کو حل کرتے ہوں تو پھر اس دین کو قبول نہ کرنے میں ہمارے پاس کیا عذر ہے؟ ان باتوں کے علاوہ اس دین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ سفرۂ انسانیت پر ہم کو ذلیل فقیروں کی جگہ نہیں بٹھاتا بلکہ دستگاہِ تمدن میں ہم کو شریک بناتا ہے، ایسا شریک جو اس دستگاہ کی مدد کرتا ہو اور اس دین کے پاس بھی اتنا سرمایہ ہی جو کم و ناچیز ہرگز نہیں ہے!

مجھے تعجب ہے کہ انسان کس طرح اپنے کو میدانِ شرافت سے ہٹا کر ذلّت و رسوائی کے غار میں گرا دیتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے کے لئے اُٹھے! میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی انسان حکومت چھوڑ کر رعیّت بن جانے پر تیار ہو سکتا ہے ـــــ اس نظریئے کی بناء پر اسلام کو چھوڑ کر دوسرا دین کوئی کیونکر اختیار کر سکتا ہے ـــــ

یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ ہمارے پاس ـــــ یعنی اسلام ـــــ خود ایسا سرمایہ ہے جو بشری تمدن کو عطا کیا جا سکتا ہے۔ ہماری یہ حیثیت نہیں ہے کہ مشرق و مغرب ہم کو تلقین کرے یا ہم کو بے چارہ سمجھے، البتّہ یہ لوگ ضرور یہ چاہتے ہیں کہ ہماری فکروں کا طریقہ بدل جائے اور ہماری امید ناامیدی و مایوسی میں بدل جائے تاکہ حواس باختہ شکار کی طرح کبھی ہم اس کے جال میں پھنس جائیں، کبھی اس کے دام میں گرفتار ہو جائیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہوں کہ ہم نے اتنا تجربہ کیا ہے کہ اب تجربے سے سیر ہو چکے ہیں۔ یہ پُر بہار آراستہ و پیراستہ تمدّن جس کو ہم نے گداگروں کی طرح سے یہاں وہاں سے جمع کیا ہے۔ اور اپنے تمام قانونی و اجتماعی و فکری زندگی میں اور حیات کے تمام شعبوں میں جس پر عمل درآمد کرتے ہیں اس نے ہماری وضع کو مضحکہ خیز بنا دیا ہے، ہمارا اندازِ فکر، ہماری غذا، ہمارا لباس سب ہی مضحکہ خیز ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہم یہاں پر اُن قوانین کی یاد دہانی ـــــ بطور نمونہ ـــــ کرا کے اپنے مطلب کی تائید کریں گے جن کو ابتدا میں فرانس یا دیگر یورپی ممالک سے لیا گیا اور پھر اس کے بعد جیسی ضرورت پڑتی گئی اسی طرح کے قوانین اپنی زندگی کے لئے وضع کرتے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ممالک سے لئے گئے قوانین اور اس ملّت میں دائمی تضاد پیدا ہو گیا۔ اُن قوانین کی رُوح اور اس ملّت کی رُوح میں کسی بھی قسم کا اتحاد باقی نہ رہ سکا۔ ملّت اور اُن قوانین کے تضاد کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی اس قانون کی مخالفت کرے تو ملّت اس کو بہادر کا خطاب دیتی ہے اس کی تعریف کرتی ہے اور ہر قسم کا تعاون دیتی ہے آخر ایسا کیوں ہے؟ مغرب پرست کہتے ہیں: چونکہ لوگ جاہل ہیں اس لئے ایسا کرتے ہیں حالانکہ واقعی علّت یہ نہیں ہے بلکہ پڑھے لکھے لوگ بھی قانون کی مخالفت کرتے ہیں۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ مانگے ہوئے قانون اور روحِ ملّت میں تنافر ہے۔ کیونکہ ان قوانین کو اجتماعی تقاضوں، تاریخی سوابق، ملّی شعور، لوگوں کے اعتقادات سے کوئی مدد نہیں ملی بلکہ یہ قوانین ایسی جگہ سے آتے ہیں جن کا رُوحِ ملّت سے کسی قسم کا تعلّق ہی نہیں ہے۔ ان قوانین کو ایسی جماعت نے وضع کیا ہے جن کی تاریخ، جن کا دین، جن کی ضرورتیں ایک خاص قسم کی ہیں۔ کوئی بھی قانون جب تک ملّت کی ضرورت اور اس کی رُوح کے مطابق نہ ہو گا نہ تو ملّت اُس کو قبول کرے گی اور نہ اُس کی اطاعت کرے گی اور نہ اُس سے خلوص پیدا کرے گی۔[1]

کتاب "رُوحِ سیاست جہانی" کا مصنّف لکھتا ہے: اسلامی ممالک کی ترقی ہرگز اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ وہ مغرب کی تقلید کریں اور اپنی زندگی کے لئے اسی کو نمونہ بنائیں۔ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کیا اسلام میں ایسی قوّت موجود ہے جو جدید افکار و نظریات کو ایجاد کر سکے اور بشریت کے لئے ایک جامع و کامل دستور مہیّا کر سکے جو جدید زندگی کی ضرورتوں سے ہر طرح ہم آہنگ ہو۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں نہ صرف یہ کہ ترقی و تکامل کی ہر قسم کی استعداد و صلاحیت موجود ہے بلکہ اسلامی نظام دوسرے نظاموں سے اس سلسلے میں کافی

---

[1] اسلام و دیگراں۔ صفحہ ۴۱، ۴۲، ۴۸، ۴۹

آگے بھی ہے۔ اسلامی ممالک کی مشکلات یہ نہیں ہیں کہ اسلام میں ترقی کی راہیں مفقود ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں اسلام سے استفادہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ میں نے بہت گہری نظر سے دیکھا ہے کہ شریعتِ اسلامی کے اندر ترقی و تکامل کے تمام مبادی و اصول باقاعدہ موجود ہیں۔

اسلامی دستور پر عمل کر کے صرف ایک دن دینی محرکات سے پرہیز کرنے پر کیا نتائج مرتّب ہوتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو ذیل کی خبر سے ہو سکے گا۔

حضرت علیؑ کی شہادت پر جو رنج و غم منایا جاتا ہے اس کا اثر تہران پر کیا ہوا، اخباروں سے پوچھئے۔ اخباروں نے لکھا: کل تہران میں اتنا سکون و آرام تھا جس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ کل اتنے بڑے شہر میں کوئی حادثہ نہیں ہوا، قانونی طبیب بیکار بیٹھے رہے۔ شہری چوکیاں خالی تھیں، نہ کوئی شکایت کرنے والا دکھائی دیا نہ کوئی ملزم۔ کل کا دن "سال کا آرام دہ ترین" دن تھا۔ کل کوئی حادثہ نہیں ہوا، اسپتالوں میں ایک شخص بھی معائنہ کرانے نہیں آیا۔ کل چوبیس گھنٹوں میں ایسا کوئی نہیں ہوا جس سے کسی کی جان بچ جاتی۔ تھانہ چوکی والوں کا بیان ہے کل تمام مرد اپنے اپنے گھروں میں رہے، اگر میاں بیوی میں کوئی اختلاف بھی ہوا تو حضرت علیؑ کی شہادت کی وجہ سے اس سے چشم پوشی برتی گئی۔ کل کا روزنامچہ بالکل خالی رہا۔[1]

اسپتالوں کے اعداد و شمار کی بنا پر سال میں ۲۵۲۵ لاشوں کی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ بطور متوسط روزانہ ۶ سے ۸ لاشوں کی چیر پھاڑ کرنے کے بعد دفن کا حکم دیا جاتا ہے۔ البتہ "مذہبی سوگواریوں" کے دن یہ تعداد ضرورت سے زیادہ گھٹ جاتی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ ہفتے "۱۳ دیماہ ۴۵" مولائے متقیان کی شہادت کے دن ایک لاش بھی نہیں لائی گئی۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مذہبی عقائد ابھی تک قوی اور پُر اثر ہیں۔ اگر ان دنوں میں فسق و فجور کے مراکز کھلے ہوں، شراب خانے بند نہ ہوں تو اتنے بڑے شہر میں کسی واقعے کا نہ ہونا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔[2]

---

[1] کیہان۔ ۱۴ دیماہ۔ ۱۳۴۵ [2] خواندنیہا۔ شمارہ ۳۷۔ سال ۲۷

اب ذرا سوچئے کونسی طاقت ہے جس نے اِس معاشرے میں فوق العادۃ مکون بخشا؛ یہ واقعی سچ ہے کہ اگر معاشرے میں اسلامی دستور نافذ ہو تو کتنا صحت مند معاشرہ وجُود میں آسکتا ہے، اور لوگوں کی زندگی میں کِتنا سکون و آرام نصیب ہوگا اِس کا تصوّر بھی اس دَور میں مشکل ہے۔ کیا مغربی حکومتیں اپنی ساری قوّتوں اور روپیوں کے زور سے ایک گھنٹہ بھی ایسا سکون دے سکتی ہیں؟ مغربی دنیا میں چاہے وہ بڑا شہر ہو یا چھوٹا، ایک گھنٹہ بھی زندگی کا ایسا نہیں گزر سکتا جس میں قتل، غارت گری، چوری نہ ہوتی ہو! پھر تہران جیسا بھرا پُرا شہر مولائے کائنات کی شہادت پر جتنا پُرسکون ہوتا ہے اس کی مثال کیا ممکن ہو سکتی ہے؟

اِسی لئے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے:

سالہا سال دل طلب جام جم از ما می کرد
آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنّا می کرد!

(سالہا سال سے دل جامِ جم کی ہم سے طلب کرتا تھا۔ جو چیز خود اس کے پاس تھی اس کو دوسروں سے مانگ رہا تھا)

اسلام اور اقتصادی مشکلات

اقتصاد اور مواہب فطرت سے بہرہ اندوزی کا مسئلہ اُن اہم ترین مسائل میں سے ہے جو ہمیشہ حیاتِ بشر کے ساتھ رہے ہیں۔ بشر کی ابتدائی ضرورتیں بھی زندگی بشر کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوتا رہا ہے کہ زمانے کے تغیر کے ساتھ ان میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ قدیم زمانوں میں کسبِ معاش اور فطرت سے استفادہ بہت ہی سادہ اور ابتدائی طریقے سے ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں کی ملی جلی زندگی، اور ملتوں کی ترقی کی وجہ سے مخصوص طریقے پر ہونے لگا۔ تقریباً چار سو سال پہلے یعنی سرمایہ داری کے ابتدائی زمانے سے حیات اقتصادی کی تحلیل و تجزیئے کے عنوان پر علم اقتصاد کی بنیاد پڑی۔

آخری صدی میں تمدن کی حیرت انگیز ترقی، ٹیکنالوجی و صنعتی ترقی کے انقلاب، وسائل ارتباط کے ترقی و تکامل، ملتوں کی بالغ نظری کی وجہ سے علم اقتصاد معاشرے کا اہم ترین مسئلہ بن گیا، اور اسی وجہ سے مشرق و مغرب کے دو بلاک بن گئے اور سرمایہ داری و کمیونزم کے دو الگ الگ نظریئے قائم ہو گئے۔ مشرق و مغرب کی ساری کشمکش کے پہیئے اسی محور پر گھوم رہے ہیں کہ آخر بشری اقتصاد کا معمہ کس طرح حل ہوگا؟ اور ایسا کونسا اقتصادی سسٹم ہو سکتا ہے جو آج کے مشینی دور کے اقتصاد کی گرہ کشائی کر سکے؟ اور کونسا طریقہ ہو سکتا ہے جس سے عوامل تولید کے درمیان ثروت کی عادلانہ تقسیم ہو سکے۔؟

دنیا کے مفکرین نے طبقاتی نظام کے عظیم شگاف کو پُر کرنے کے لئے جو اہم طریقہ سوچا ہے وہ ایک تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ختم کر دیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ

کم سے کم عمومی معیشت کی ذمہ داری ہو سکے۔ مارکسیزم کا نظریہ بالکل ہی انقلابی ہے۔ انقلابِ اکتوبر کے بعد سے رُوس میں اِس نظریئے پر عمل شروع کیا گیا۔ اور دوسرا طریقہ مختلف عُنوان سے یورپی ممالک کے اکثر ملکوں میں لاگو کیا جا رہا ہے۔

کمیونزم کا دعویٰ ہے کہ وہ استعمار کے ظلم و ستم کو ختم کر سکتا ہے اور دنیا کی مُشکلات کا حل پیش کر سکتا ہے۔ کمیونزم کے نزدیک فردی ملکیت کو ختم کر کے حکومت کو کُلّی اقتدار سونپ دینا ہی اقتصادی مشکلات کا حل ہے۔ کمیونزم کا عقیدہ ہے کہ تاریخ کے تمام ادوار میں شخصی ملکیت کا ظلم و ستم سے ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اِس لئے سرمایہ داری کو ختم کر کے تمام وسائلِ تولید کو قومیا لینے اور ثروت کی عادلانہ تقسیم کرنے سے اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور سرمایہ داری کو ختم کر کے ظلم و ستم کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر ایک ایسے معاشرے کا وجود یقینی ہو سکتا ہے جس میں صرف ایک ہی طبقہ ہو، اور تمام لوگ تمام اُمور میں ہم آہنگ ہوں۔

یہاں پر ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک طبقہ ہونے کے لئے کیا صرف ایک عامل کا یکساں کر دینا کافی ہو جائے گا حالانکہ طبقاتی نظام کے وجود کی علتیں مختلف ہُوا کرتی ہیں تو پھر ایک علت میں یکسانیت سے یہ بات کیونکر ممکن ہے؟ ——— کیونکہ یہ طبقے کبھی تو عسکری، کبھی مذہبی، کبھی سیاسی اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں لہٰذا ایک طبقہ بنانے کے لئے تمام مختلف عوامل میں یکسانیت پیدا کرنی ہوگی۔ اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ سوشلزم میں اگرچہ سرمایہ دار طبقہ کا وجود نہیں ہے مگر مختلف نام سے مختلف طبقے بہر حال موجود ہیں۔ مثلاً کاریگر، کسان، مزدور قسم کے طبقوں کا وجود ہے اور اُن میں سے ہر ایک کی سطحِ زندگی ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ کیا روس میں ایک طبیب اور ایک مزدور کے حقوق مساوی ہیں؟ کیا ایک معمولی مزدور کو وہی مزدوری ملتی ہے جو ایک انجنیر کو ملتی ہے؟ ——— نہیں اور ہرگز نہیں ——— ان چیزوں سے قطعِ نظر کرتے ہوئے اندیشہ

افکار، میلانِ طبیعت، عطوفت، بدنی طاقت میں ایک معاشرے کے افراد میں اختلاف ہوا کرتا ہے اور وراثتاً یہ اختلافات ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ ایک کمیونسٹ لیڈر کہتا ہے: مطلق مساوات کی ایجاد عملاً ناممکن ہے۔ کیونکہ مدرس، مفکر، سیاسی، موجد سب ہی کو ایک درجے میں نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ اگر ایسا کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فکری جمود اور عقلی و فنی زندگی کے تعطل کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔[۱]

سرمایہ داری کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں صرف کاپٹالیزم ہی ایسا مذہب ہے جس نے مشینی سرگردانی کی گرہ کشائی کی جاسکتی ہے۔ اسی لئے اس نظام —— سرمایہ داری —— نے شخصی ملکیت کو ختم نہیں کیا بلکہ کام و مزدوری کے توازن کو برقرار رکھنے اور طبقاتی فاصلے کو محدود کرنے کے لئے کم از کم معیشت کو ضعیف طبقات کے لئے مخصوص کر دیا۔[۲]

لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کیا ان اصلاحی اقدامات نے طبقاتی فاصلوں کو ختم کر دیا؟ کیا یہ طبقاتی اختلاف پسماندہ افراد کے دلوں میں سرمایہ داروں سے نفرت کا قوی

---

[۱] اقتصادنا جلد ۲ صفحہ ۲۱۶ —— [۲] ہم اس دعویٰ کو صد در صد قبول بھی کرلیں تو ان رپورٹوں کو کیا کہیے گا جو امریکہ کے بارے میں شائع ہوئی ہیں۔ مثلاً غذائی مسئلے کی تحقیقاتی کمیٹی نے مسلسل نو مہینے مطالعہ و تحقیق کر کے رپورٹ پیش کی، کہ امریکہ میں دس ملیون آدمی بھوک کی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ اس کمیٹی کے چیرمین نے امریکہ کے صدر جمہوریہ سے خواہش ظاہر کی کہ مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر آپ اس کا اعلان کریں اور امریکہ کے ۲۰ حکومتوں کے ۲۵۶ شہروں میں —— ان شہروں میں اکثر شہر خطرے میں ہیں —— فوراً مدد بھیجیں۔ ۲۵ آدمیوں پر مشتمل کمیٹی —— جس کے بیانات نے امریکہ کی محفلوں میں شدید ہیجان پیدا کر دیا تھا —— نے ۱۰ جولائی سے اپنے مشن کا آغاز کر دیا۔ اس کمیٹی نے —— جو والٹر ویٹر صدر فوجی کمیٹی کی حسبِ ہدایت امریکی لوگوں کی بھوک کا سدِّ باب کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ والٹر دیٹر یہ وہی شخص ہے جو امریکہ کے موٹر سازی کے مزدوروں کی یونین کا صدر بھی ہے اور یہی وہ شخص ہے جس نے کمیٹی کے تمام مصارف کی ذمہ داری قبول کی —— دس ملیون امریکیوں کی گرسنگی کی علت جنگ اور دیگر مناقشات اجتماعی و سیاسی کو قرار دیا۔ اس کمیٹی نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ جنگ کی وجہ سے یہ لوگ اب اس قابل نہیں ہیں کہ کھانے پینے کی ضروری چیزوں کو اپنے لئے بازار سے خرید سکیں۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں مزید سفارش کی، کہ حکومتِ امریکہ کو چاہیے کہ ان دس ملیون آدمیوں کی غذائی کفالت کی ذمہ داری قبول کرے۔

یونائیٹڈ پریس انٹرنیشنل - ۲۲ فروری سنہ ۷۰ء

نوٹ:- اگر سرمایہ داری اقتصادی مسائل کا حل ہوتی تو امریکہ میں اتنے لوگ فاقہ کش نہ ہوتے۔ (مترجم)

سبَب نہ ہوگا ؟ کیا یہ بیچارے عوام ہمیشہ اسی طرح زندگی بسر کرتے رہیں گے ؟ کیا اس عظیم فاصلے کے بعد بھی ـــــ جو روز بروز گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا ہے ـــــ سرمایہ داری معاشرے کے مشکلات کا حل بن سکتی ہے۔؟

سوشلزم ہو یا کاپٹالیزم، دونوں ہی نے مادی مقیاس کو انسانی زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یہ دونوں انسان کے اخلاقیات و معنویات کی طرف توجّہ دئے بغیر صرف اقتصادی و اجتماعی مشکلات پر ریسرچ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نظر میں دولت و ثروت کی زیادتی ہی اصلی ہدف اور اساسی چیز ہے۔ اس کے ماورا کسی حقیقت کے قائل نہیں ہیں۔

لیکن اسلام نے انسان کو تمام جہات سے موردِ توجّہ قرار دیا ہے۔ مادی زندگی کی اصلاح اور درستگی، ترقی و عروج کے ساتھ ساتھ اپنے تمام احکام و قوانین میں اخلاقی فضائل اور رُوحانی کمال کی طرف بھی خصوصی توجّہ دی ہے۔ اسلام دولت و ثروت کو اپنے فطری مقاصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اسلام کے اقتصادی مکتب کی خصوصیت یہ ہے کہ فکرِ انسانی کو ترقی دینے کے ساتھ مادی دُنیا سے ماورا ایک اور دنیا کی طرف متوجّہ کرتا ہے۔

مغربی دُنیا کا قانون سرمایہ دارانہ نظام کی پشت پناہی کرتا ہے۔ کاریگروں کے مقابلے میں سرمایہ داروں کے منافع کا لحاظ رکھتا ہے۔ اور روس میں ـــــ خود روسیوں کے قول کے مطابق ـــــ قانون مالک و سرمایہ داروں کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتا ہے اور سرمایہ داروں کے مقابلے میں کاری گروں کا لحاظ کرتا ہے ـــــ لیکن نظامِ اسلام اور اسلامی اصُول چونکہ وحیٔ الٰہی سے ماخوذ ہیں اور انسانی قانون بنانے والوں کے افکار و خیالات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی لئے اسلام میں ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر ترجیح نہیں دی گئی اور نہ ایک گروہ کے مفاد کو مقدم کر کے دوسرے گروہ کے اُوپر ظلم کیا گیا ہے ـــــ اسلام ایسے قوانین کے مجموعے کا نام ہے جو کسی خاص گروہ کے مصلحت کی خاطر نہیں آیا۔ اور نہ کسی مخصوص طبقے کے ہَوا و ہوس کا پابند ہے۔ اسلام ایسے قوانین کا نام ہے جس کو خدائے بزرگ نے سَب کے لئے بنایا ہے۔ اِسی لئے کسی

مخصوص طبقے کی حاکمیت و فرماں روائی کا تصور نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عدالت سے انحراف کے اسباب بطور کلی اس میں نہیں ہیں۔ اسلام کا حاکم کسی خاص گروہ یا طبقے کا کنڈیڈیٹ نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود بھی ملّت کی ایک فرد ہے۔ اس کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی مخصوص گروہ کو فائدہ پہنچائے یا کسی خاص طبقے کو نقصان پہنچائے۔ اسلامی حاکم کے پاس جو اقتدار ہوتا ہے اس کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ قانونِ الٰہی کو نافذ کر سکے۔ یعنی خدائی قانون کے نافذ کرنے کے علاوہ اس کے پاس کسی قسم کی طاقت و قدرت نہیں ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ تسلط و اقتدار سے پیدا ہونے والے تکبّر و غرور سے اسلامی حاکم محرُوم ہوتا ہے کیونکہ وہ خود سمجھتا ہے کہ میرا تعلق صرف اتنا ہے کہ خداوند عالم نے میرے اور تمام دنیا کے لئے جو مساوی قانون بنایا ہے اس کو نافذ کر سکوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں لوگوں کو استقلالِ واقعی اور کامل آزادی نصیب ہوگی اور معاشرے کے افراد عدالتِ مطلقہ کی بنا پر سکون و اطمینان حاصل کریں گے۔

چونکہ تمام مکاتیبِ فکر میں ضرورت سے زیادہ نقائص موجود ہیں اس لئے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ اسلام کے قوانین کو اپنایا جائے مثلاً کاپٹالیزم جو شخصی ملکیت کا بے قید و بند قائل ہے اور آزادیٔ مطلق و غیر محدُود شخصی ملکیت کا پرچار کرتا ہے اور معاشرے کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ فرد کی بیجا تعدّی کی روک تھام کر سکے۔ اسلام اس کا مخالف ہے بلکہ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کے برخلاف فرد کو لائقِ احترام تو ضرور سمجھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اقتصادی نظام میں معاشرے کی شخصیت بھی وسیع مفہوم کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ معاشرے کے لئے بھی اساسی قدر و قیمت کا قائل ہے لیکن اسی کے ساتھ شخصی ملکیت کے قانون کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور شخصی آزادی کا قائل ہے۔ اسی طرح کمیونزم ـــــ جو رزقِ مردم کی کلید کو حکومت کے سپرد کرد۔ ینے کا قائل ہے اور فرد کی قدر و قیمت اور احترام کا سرے سے انکار کرتا ہے ـــــ کی بھی مخالفت کرتا ہے اسلام یہ کبھی نہیں چاہتا کہ لوگ حکومت کے مقابلے میں صرف ایک شکم سیر غلام کے مانند رہیں۔ کمیونسٹوں کا عقیدہ ہے کہ شخصی ملکیت

فطری چیز نہیں ہے۔ یہ لوگ بغیر کسی دلیل کے کہتے ہیں: ابتدائی دَور میں شخصی ملکیت کا تصوّر نہیں تھا۔ اس وقت لوگ باہمی تعاون و محبّت و برادری کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس وقت حکومت کمیونزم کے ہاتھ تھی۔ آج جو شخصی ملکیت کا وجود ہے یہ سب بعد کی پیداوار ہے۔

مگر سچّی بات یہ ہے کہ شخصی ملکیت اکتساب و تربیت کی محتاج نہیں ہے بلکہ آدمی کی پیدائش کے ساتھ ساتھ اس کا بھی وجود ہوا۔ اور براہ راست آدمی کی فطرت سے اس کا تعلق ہے۔ دیگر فطری خواہشات کی طرح یہ بھی ایک پیدائشی چیز ہے۔

فیلسین شالہ لکھتا ہے: اگر قلمرو مالکیت میں ایسی وسعت پیدا ہو جائے تو پھر اس کے لئے کوئی حدِ معیّن نہیں کی جا سکتی۔ ملکیت کا دائرہ طول تاریخ میں مختلف طریقوں سے بڑھتا رہا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فطرت و طبیعتِ انسان اور جذبۂ مالکیت کے درمیان بہت قریبی رشتہ ہے۔ انسان فطرتاً یہ چاہتا ہے کہ اپنی ضروریات کو اپنے اختیار میں رکھے کیونکہ جب تک ایسا نہ ہوگا وہ اپنے کو آزاد نہیں سمجھ سکتا۔ شخصی ملکیت کی تیسری دلیل اخلاق ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسان اپنی سعی و کوشش سے جن چیزوں کو حاصل کرے وہ اس کی ملکیت میں ہونا چاہیے اور اسی شخص کی طرح اس چیز کا بھی احترام ضروری ہونا چاہیے۔ شالہ اقتصادی ترقی اور اجتماعی سرمایہ کی پیداوار کی اہم ترین علت شخصی ملکیت کو سمجھتا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے، سب سے بڑی دلیلِ مالکیت خود معاشرے کا نفع ہے۔ معاشرہ فرد کی محنت کا محتاج ہوتا ہے۔ کسی بھی کام کے کرنے کے لئے ایک محرک ہونا چاہیے اور مالکیت سے بڑا کوئی محرّک نہیں ہو سکتا۔ معاشرے کا فائدہ اسی میں ہو سکتا ہے کہ لوگ کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہیں یعنی اجتماعی سرمائے کے اضافے میں مدد کرتے رہیں لہٰذا معاشرے پر لازم ہے کہ لوگوں کو پس انداز کرنے کا حق دے اور صرف مالکیت کا تصوّر ہی ایک ایسی چیز ہے جو لوگوں کو کام کرنے اور پس انداز کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے[1]

---

[1] تاریخ مالکیت۔ صفحہ ۹۴

اسلام نے اپنے قانون میں اس فطری تقاضے کا لحاظ رکھا ہے اور فطرتِ انسانی کے موافق ہی اپنے احکام نافذ کئے ہیں صحیح اور قانونی راستے سے حاصل کئے ہوئے اموال کو اسلام شخصی مال سمجھتا ہے۔ اسلام اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ شخصی ملکیت فطرتاً اور ذاتی لحاظ سے ظلم و ستم کا منبع ہوتی ہے۔ درحقیقت اس طرزِ فکر کی علت یہ ہے کہ یورپی ممالک میں شخصی ملکیت اور ظلم و ستم لازم و ملزوم سے رہے ہیں۔ ان ممالک میں وضع قانون کا حق ہمیشہ سرمایہ دار طبقے کو رہا ہے اسی لئے وہاں کے سارے قوانین مصالح سرمایہ داری کے محور پر گھومتے ہیں۔ لیکن ہم تو پہلے کہہ آئے ہیں اسلام میں وضع قانون کا حق صرف خدا کو ہے، لہٰذا کسی طبقے کو کسی دوسرے طبقے پر تفوق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور نہ اس میں اس کا لحاظ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص طبقے کو فائدہ پہونچے اور دوسرے مخصوص طبقے کو نقصان پہنچے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس زمانے میں اسلامی قانون کا نفاذ تھا اس وقت شخصی ملکیت کا وجود تھا مگر اس کے ساتھ ظلم و ستم کا شائبہ تک نہ تھا۔

جن لوگوں نے بہت زیادہ زحمت و مشقت برداشت کر کے کارخانے قائم کئے ہیں اسلام کی نظر میں زبردستی ان سے کارخانوں کو چھین لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ فعل امنیت اجتماعی اور احترامِ حقوقِ افراد دونوں کے مخالف ہے۔ نیز یہ فعل روحِ ایجاد کو ختم کر دینے والا بھی ہے۔ ہاں اجتماعی عدالت کے تحکیمِ مبانی کے لحاظ سے اور اقتصادی و ملی مصالح و منافع کے لحاظ سے خود حکومت بڑے بڑے صنعتی ادارے، بڑے بڑے کارخانے قائم کر سکتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام نے فرد و اجتماع دونوں کی حیثیت کو بنیادی طور سے مانا ہے۔ اور حیاتِ اقتصادی کی تنظیم اور حلِ مشکلات کے لئے عدالت اجتماعی کے اساس پر ایک آزاد قانون بنایا ہے جس میں فرد اور معاشرہ دونوں کے مصالح کا بہت ہی وقتِ نظر کے ساتھ لحاظ رکھا گیا ہے۔ معاشرے میں شخصی ملکیت کو اساسی چیز مانا ہے۔ اور فطرت کے تقاضوں پر لبیک کہا ہے تاکہ ہر شخص اپنی سعی و کوشش سے وسائل زندگی مہیا کر سکے اور نفع برداری کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرے لیکن شخصی ملکیت کو حدود و شرائط میں جکڑ دیا ہے تاکہ لوگوں پر ظلم و ستم کے دروازے نہ کھل جائیں۔ اور فرد اپنی آزادی سے غلط فائدہ نہ حاصل

کر سکے۔ اور اجتماع کے مصالح کو برباد نہ کر ڈالے۔ اور یقینی طور پر ایسی قید و بند آزادی کے لئے نقصان رساں نہیں ہے۔ کیونکہ معاشرے کی زندگی اور ایسا قانون جو ظلم و ستم سے روکے لازم و ملزوم ہیں اور اس قسم کی پابندی اجتماعی زندگی کی بقاء کی ذمہ دار ہے۔

شخصی ملکیت کے سلسلے میں اسلام نے بے لگامی کو قطعاً محدود کر دیا ہے اور اسی کے ساتھ شخصی ملکیت کو قانونی حیثیت بھی بخشی ہے بشرطیکہ وہ مشروع اور صحیح طریقے سے حاصل کی گئی ہو۔ لیکن اگر دولت و ثروت کو غیر فانی اور غیر مشروع طریقے سے حاصل کیا گیا ہے تو پھر اسلام اس پر تسلّط کو قبول نہیں کرتا۔ اسلام نے ظلم و تعدّی، احتکار، قتل و غارتگری کے ذریعے سے حصول دولت پر پابندی لگادی ہے اور اس قسم کی دولت کو خلافِ شرع سمجھتا ہے۔

اسلام میں شخصی ملکیت کی بنیاد کسی بھی طرح سے سود، احتکار، غارت گری، غصب، تغلّب، رشوت، چوری (وغیرہ) پر نہیں رکھی گئی، اور کسی کو بھی حق نہیں ہے کہ ان ذرائع سے دولت جمع کرے۔ اسلام نے مالِ حلال کے لئے جو قید و بند لگائی ہے اس کا قہری نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں جو خرابی تھی اسلام میں نہ ہو سکے گی اور اسلامی معاشرہ سرمایہ داری کے ان برے نتائج سے جو ناقابلِ اجتناب ہیں محفوظ رہے گا۔

آج کا موجودہ سرمایہ داری نظام شخصی مالکیت کے برخلاف ہے۔ سرمایہ داری کے سارے نظام کا دار مدار سود اور احتکار پر ہے۔ کیونکہ ماہرین اقتصاد اس بات پر متفق ہیں کہ سرمایہ داری کا سسٹم شروع میں بہت سادہ اور سود مند تھا۔ لیکن تغیرات کے ہاتھوں رفتہ رفتہ داخلی قرضوں پر اعتماد کرتے ہوئے موجودہ صورت میں ظاہر ہوا ہے جس طرح چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کے دیوالیہ ہونے کی وجہ سے ایک بڑی کمپنی کے وجود کا سبب بنتا ہے اور یہ طریقہ احتکار تک پہونچ جاتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ سود اور احتکار سرمایہ داری کی پلید ترین بیماری ہے۔ اور اسی لئے اسلام نے ان دونوں چیزوں کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ یہ سود ہی تو ہے جو بے حساب دولت سرمایہ داروں کے جیب میں انڈیل دیتا ہے اور لوگوں کو محرومیت

اور بدبختی سے دوچار کرتا ہے۔

اسلام نے مختلف طبقوں میں اقتصادی توازن برقرار رکھنے کے لئے اور دولت کو ایک مرکز پر جمع ہونے سے روکنے کے لئے بہت سے طریقے ایجاد کئے ہیں۔ چند طریقوں کا ذکر کیا جارہا ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ ٹیکس کا قانون مثلاً لوگوں کو جمع شدہ مال پر خمس، زکوٰۃ وغیرہ کے ٹیکس لازم قرار دئے ہیں تاکہ ہر سال مالداروں اور سرمایہ داروں کا مال گھٹتا رہے۔

۲۔ انفال یعنی عمومی ثروت کو اسلامی حکومت کے سپرد گی میں دے دینا، مثلاً جنگلات، نے زار، چراگاہ، بنجر زمینیں، پہاڑ، پہاڑوں پر اُگے ہوئے درخت، معدنیات، موقوفات عامہ، اموال مجہول المالک، بغیر جنگ کے حاصل ہونے والی زمینیں، کفارات، لاوارث افراد کی میراث اور..... اور..... اور اس قسم کی چیزیں انفال (ثروت عمومی) کہلاتی ہیں۔ اگرچہ ان میں کی کچھ چیزیں رسولؐ یا امامؑ سے مخصوص ہیں مگر وہ حضرات ان کے منافع کو اپنے اوپر نہیں خرچ کرتے تھے بلکہ رفاہِ عام میں صرف کرتے تھے۔

۳۔ میراث کا قانون بھی ایک ایسی چیز ہے جو دولت کو متحرک رکھتی ہے اور ہر نسل پر دولت تقسیم ہوتی رہتی ہے۔

۴۔ اضطراری حالت: یعنی شخصی مالکیت کا احترام اسلام اسی وقت تک کرتا ہے جب تک اجتماع کسی خطرے سے دوچار نہ ہو، اور اضطراری حالات نہ پیدا ہوجائیں۔ لیکن اگر کبھی معاشرہ خطرے سے دوچار ہوا اور اضطراری حالت پیدا ہوگئی تو پھر عادل اسلامی حکومت مقررہ شرائط کے ساتھ اپنے اختیارات کو استعمال کر کے معاشرے کو اس خطرے سے بچائے گی۔ مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت جس وقت بھی مقتضی ہو اور اسلامی اجتماع کا فائدہ ہو تو حکومت شخصی مالکیت میں حسب ضرورت کتر بیونت کر دے گی۔ اسلامی حکومت کو یہ حق اسی لئے دیا گیا ہے تاکہ ضرورت کے وقت استعمال کر سکے۔ اسلامی حاکم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ انگلیوں پر گنے جانے والے

افراد کے ہاتھوں میں دولت کو جمع ہوتا ہوا دیکھے اور دوسروں کی محرومی و گرسنگی پر خاموش تماشائی بنا رہے۔ کیونکہ یہ بات اسلامی اصول کے بالکل برخلاف ہے۔ آج کی مغربی دنیا میں جس قسم کی سرمایہ داری ہے اسلام اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ قرآن میں ارشاد ہے: تقسیمِ مال کے جو طریقے ہم نے معیّن کئے ہیں وہ صرف اس لئے کہ تمہارے دولت مندوں کے ایک گروہ کے پاس دولت متمرکز نہ ہو جائے[1]

چونکہ اجتماع کا نقصان عین فرد کا نقصان ہے اس لئے اسلام نے دونوں کے حقوق میں کوئی تعارض نہیں ہونے دیا۔ اسی لئے اسلام نے شخصی ملکیت کو محترم شمار کرتے ہوئے اور انسان کی فطری خواہشات کا لحاظ رکھتے ہوئے، اور ان تمام باتوں کو باقی رکھتے ہوئے جس کو سرمایہ دار شخصی ملکیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس بات کی اجازت دی ہے کہ ضرورت کے وقت فرد کے مال سے اجتماع کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔

اگرچہ اسلام نے سرمایہ داری کے ظلم و ستم کو قانونی طور سے روک دیا ہے مگر پھر بھی صرف قانون بنا دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اور طریقوں سے بھی اس پر پابندی لگائی گئی ہے۔

۵۔ سخاوت: چونکہ سرمائے کو متحرک کرنے کے لئے لوگوں کو راہِ خدا میں انفاق و بخشش پر بہت آمادہ کیا ہے۔ اور اس اخلاقی دعوت کو قانون سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایسے مضبوط دستور بنائے ہیں جو عاطفہ انسانی کے لئے شدید محرک ہیں، ایسے محرک ہیں کہ ان کو دیکھ کر کوئی بھی شخص اپنے ہمجنس کے استیصال پر تیار ہی نہیں ہو سکتا۔

۶۔ فضول خرچی کی مذمت: اسلام نے ایک گروہ کے ہاتھ میں ثروت جمع ہو جانے کے جو نتائج ہوتے ہیں (یعنی سرمایہ داری کے نتائج) ان نتائج کی شدّت سے مخالفت کی ہے تاکہ سرمائے میں جمود نہ ہونے پائے مثلاً فضول خرچی، عیاشی، خوش گزارنی یہ چیزیں سرمایہ داری کی دین ہیں اور اسلام نے ان چیزوں سے شدّت کے ساتھ منع کیا ہے۔

۷۔ بخل کی مذمّت: اسی طرح بخل کی مذمّت کر کے مال داروں کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کی

---

[1] سورۂ حشر۔ آیت ۷۔

ترغیب وتشویق دلائی ہے تاکہ دولت وثروت چند ہاتھوں میں منجمد ہوکر نہ رہ جائے۔

۸۔ اُجرت روکنے کی ممانعت: اسی طرح اسلام نے شدّت کے ساتھ اس بات سے بھی روکا ہے کہ خبردار مزدوروں کی مزدوری نہ روکو، کیونکہ اس سے عمومی فقر کا اندیشہ ہے۔ اسلام کی یہ روحی دعوت انسان وخدا کے درمیان ارتباط کا کام دے گی، اور انسان کے ضمیر میں ایسے پاکیزہ احساسات پیدا ہوں گے جن کی وجہ سے انسان اُخروی جزا اور رضایت پروردگار عالم کا خواہش مند ہوجائے گا اور جب یہ خواہش بڑھے گی تو اس کے حصول کے لئے تمام دولت وثروت، تمام لذتیں بیکار ہوجائیں گی (اور انسان مال خرچ کرکے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جس کے نتیجے میں سرمایہ جامد نہیں رہ سکے گا۔ مترجم)

کیونکہ بدنیتی، حرص، بے عدالتی، ستم گری، یہ ساری چیزیں قیامت پر ایمان نہ ہونے، اور خالق ومخلوق کے رابطہ کے منقطع ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اور جب خالق سے رابطہ قائم ہوجائے گا تو مرضیٔ خدا کے حصول کے لئے مال بے قدر وقیمت ہوجائے گا اس کے نتیجے میں دولت میں جمود نہیں پیدا ہوگا۔

تاریخ میں کہیں نہیں ملے گا کہ جہاں کہیں بھی عبادتِ الٰہی میں انحراف ہوا ہو اس کی علّت آدمی کے افکار وپندار میں انحراف نہ ہو، اور انسانوں کے آپسی روابط میں کوتاہی نہ ہو۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا سے بہت قریب ہو اور اس کے بعد وہ ظلم وستم کا ارتکاب کرے اور دولت جمع کرنے کے لئے بندگان خدا پر ظلم وجور کرے۔

اسلام میں فرد واجتماع کے منافع کی نگرانی حکومت پر رکھی گئی ہے۔ حکومت کا فریضہ ہے کہ غلط آزادی سے روک ٹوک کرے اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اسلامی قوانین کو نافذ کرے۔ اجتماع کے اندر اخلاقی فضائل کے نشر کرنے اور نگرانی کے علاوہ بھی حکومت پر لازم ہے کہ معاشرے کو ان تمام انحرافات وپلیدگیوں سے روکے جن سے تمام افراد کا فائدہ ہو اور نتیجے میں فرد کی زندگی ایک فعال عنصر کے مثل ہوجائے۔

اسلامی نظام جہاں سرمایہ داری بلاک کے نقصانات سے پاک وصاف ہے اسی طرح کمیونزم سے بھی کہیں زیادہ بہتر اور عادل تر ہے۔ اسلام نہ تو دائیں بازو کی طرف مائل ہے اور نہ بائیں بازو کی طرف، بلکہ سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں سے کہیں بالاتر ہے۔ اس میں اس کی بھی صلاحیت ہے کہ مشرق ومغرب دونوں میں توازن برقرار رکھے۔

ایک قابل توجہ چیز یہ ہے کہ اسلام ایک بدیع نظام ہے۔ اس نے دنیا کو اجتماعی عدالت کے مفہوم سے روشناس کرایا اور اقتصادی عوامل کے وزن واعتبار کو سمجھایا۔ اسلام کی نظر میں انسان مجبوریوں کا غلام نہیں ہے بلکہ اس دنیائے رنگ وبو میں انسان ہی تنہا فعال ومثبت قوت ہے۔ جو اقتصاد کے جبری تحولات کا بندۂ بے دام ہونے کے بجائے اپنے ارادے واختیار سے اپنے اقتصاد کی بنیاد رکھتا ہے۔ دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جبری تحول کا وجود نہیں ہے۔

اس دور کے مفکرین وفلاسفر کا ایک بہت بڑا گروہ مثلاً ولیم جیمس (WILLIAM JAMES) امریکی فلسفی ہیرولڈ لاسکی (HAROLD LASKI) جان اسٹریچی (JOHN STRACHEY) برٹرانڈ راسل (BERTRAND RUSSELL) والٹر لپ مین (WALTER LIPPMANN) اور اسی قسم کے دوسرے سربرآوردہ مفکرین نے سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں پر اعتراضات کئے ہیں اور ہر ایک نے اپنی فکر ونظر کے مطابق ایک معتدل راستہ بنانا چاہا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کمیونزم افراد کی حریت، فطری آزادی، ارادہ واختیار کو سلب کرتا ہے۔ اور تمام شخصی واجتماعی امور میں حکومت کو حاکم مطلق مانتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی شخصیت اور اس کی ابتکاری صلاحیتیں زنگ آلود ہوجاتی ہیں اور فردی تکامل، رشد وترقی سے رک جاتا ہے —— اسی طرح سرمایہ داری میں یہ خرابی ہے کہ فردی آزادی افراط کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔ اجتماعی ہم آہنگی کو ضرر پہنچاتی ہے۔ سرمایہ داروں کا ایک گروہ تمام منابع ثروت، دستگاہ تولیدی پر قابض ومسلط ہوجاتا ہے اور لوگوں کو اپنے ارادے کا تابع بناتا ہے اور سیاست وحکومت پر اپنا پورا پورا اثر ورسوخ قائم کرلیتا ہے۔

اِس لئے بشریت کے لئے ایک تیسرے راستے کی ضرورت ہے جو دونوں کے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور فرد و اجتماع کے منافع کو محفوظ رکھتا ہو۔ لیکن کیا ساری دُنیا کے فلاسفہ و مفکّرین جو آج کے ناقِص سِسٹم کو باقاعدہ سمجھ چکے ہیں اسلام سے بہتر کوئی راستہ بتا سکتے ہیں؟ جس کو اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اِسلام ہی ایک ایسا معتدل مذہب ہے جو ایک طرف تو فرد کو معقول آزادی عطا کرتا ہے اور دوسری طرف سَرمایہ داری کے سرکش اونٹ کو نکیل لگاتا ہے۔ اور بالآخر انسان کو ایسے راستے پر لگا دیتا ہے جو بشریت کو سرگردانی اور بدبختی سے نجات دے سکتا ہے۔

اسلامی نظام نے اپنے تمام دورِ حکومت میں اسلامی معاشرے کی ضرورتوں کو پُورا کیا ہے اور اجتماعی زندگی چاہے وہ مُسلمانوں کی ہو یا غیروں کی، اس کو بہت ہی وسیع پیمانے پر منظم کیا ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنے طولِ تاریخ میں کبھی وضع قانون کے سلسلے میں دوسروں کا محتاج نہیں رہا ہے (اِسی طرح) آج بھی اس زمانے کے تمام تحوّلات کے باوجود دنیا کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے، اور اسلامی معاشرے کی رہبری کر سکتا ہے اور اس کی ضرورتوں کا صحیح جواب دے سکتا ہے۔

اِسلام ہی وہ آئین ہے جس نے مادی نیازمندیوں اور روحانی ضرورتوں (دونوں) کو خصوصی طور پر موردِ توجّہ قرار دیا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں ایک نادر اور متوازن قانون وضع کیا ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو زندگی سے پوری ہم آہنگی رکھتا ہے۔ اس میں کبھی کہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

دنیائے بشریت نے جن مبادی و اصول کو پہچانا ہے ان میں سب سے محکم اور پیشرو اسلام کے مبادی و اصول ہیں۔ اور اس کے قوانین انسانی نقطۂ نظر سے تمام دیگر تعلیمات سے برتر اور آسان تر ہیں۔ جس وقت اسلام کے مبادی و اصول کو دوسرے مکتب ہائے فکر کے مبادی و اصول کے مقابلے میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت

بہت زیادہ واضح ہوجاتی ہے کہ خدائی قوانین انسانی خودساختہ قوانین کے مقابلے میں کہیں زیادہ برتر و بالاتر ہیں۔

دانش کدہ حقوقِ پیرس نے ۱۹۵۱ء میں ایک ہفتہ فقہ اسلامی کی تحقیق کا منایا تھا۔ ذمہ داروں نے دُنیا کے علمائے اسلام کو فقہ اسلامی کے سلسلے میں چند موضوعات پر خاص طور سے اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ اور اس کے علاوہ جن موضوعات پر ان کا جی چاہے وہ بحث کرسکیں گے۔ جن موضوعات پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی وہ حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) فقہ اسلامی میں مالکیت کے اثبات کے طریقے۔ (۲) اجتماعی اور عمومی مصالح کے پیشِ نظر املاکِ خصوصی کے ضبط کرلینے کے شرائط اور اُن کے مقامات کی نشان دہی۔ (۳) مسئولیت جنائی (۴) فقہ اسلامی کے مختلف مکاتیبِ فکر کا تقابل۔

پیرس کے مرکزی وکلار کا سربرآوردہ رئیس جو اس کانفرنس کی صدارت کررہا تھا اُس نے اختتامِ کانفرنس پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا: مجھے نہیں معلوم کہ میں پہلے جو حقوقِ اسلامی کے جمود اور موجودہ دور کے جدید مسائل میں اس کی عدم صلاحیت کے بارے میں سُنا کرتا تھا اس میں اور آج کی کانفرنس میں جو کچھ میں نے سُنا اور سمجھا اس میں کیونکر جمع کروں؟ اس کانفرنس میں یقینی طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ حقوقِ اسلامی میں اچھی خاصی گہرائی ہے اور یہ بہت زیادہ وسیع ہیں۔ اور اس میں اس بات کی صلاحیت ہے کہ موجودہ دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا مثبت اور اطمینان بخش جواب دے سکے۔ فقہ اسلامی کا ہفتہ جب ختم ہوا تو اس نے اسلام کے بارے میں اپنی یہ رائے ظاہر کی: فقہ اسلامی کے اندر یقینی طور پر ایسی صلاحیت موجود ہے کہ جو موجودہ دور کے منابع قانون گزاری کو پورا کرسکے۔ فقہ اسلامی کے مختلف مذاہب کے اقوال و آرار کے اندر حقوقی سرمائے اتنے زیادہ ہیں جن پر تعجب ہوتا ہے۔ ان آرار و اقوال کے پیشِ نظر قطعی طور پر فقہ اسلامی کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ آج کی زندگی کے جملہ ضروریات کا مثبت جواب دے سکے۔

مغربی تمدّن میں اسلامی نقوش

جو لوگ یورپ کے صنعتی ترقی کے پیچھے دیوانہ ہو رہے ہیں وہ مسلمانوں کے علمی تحقیقات فنّی و فرہنگی ذخیروں سے یا تو بالکل ناواقف ہیں اور یا پھر چشم پوشی کر رہے ہیں۔

دنیائے بشریت کو اسلام نے جو قوی تحریک بخشی ہے اس نے بہت ہی مختصر مدّت میں رُوئے زمین کے پسماندہ ترین قوم کو اوجِ ترقی پر پہنچا دیا۔ ایک مدّت دراز تک اس تحریک کی موجیں دنیا کو روشنی اور حیاتِ تازہ بخشتی رہیں۔

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہ تھا کہ وہ ایسی سرزمین پر آیا جو جہالت اور نادانی سے بھرپور تھی اور اس نے ایسی قوم کو جو اقوامِ انسانیت کی صف سے خارج تھی ایسی شاہراہ ترقی پر رواں دواں کر دیا جو بہت ہی آسان اور دیدہ ریزی سے بنائی گئی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب لوگوں کے تمام شعبہ ہائے زندگی سچّائی سے پُر تھے اور اُسی زمانے میں بزرگ ترین تاریخی انقلاب پیدا ہوا۔ بغیر کسی مادی تحریک یا زمانی و مکانی عوامل کے بشریت کو ذلّت و رسوائی کے قید و بند سے رہائی ملی یقیناً اسلام کے علاوہ اُس وقت کوئی ایسی چیز نہ تھی جو لوگوں کی زندگی کو راستی و سچّائی سے ہم آہنگ کر سکتی۔

جس دن سے اسلام نے لوگوں کی زندگی میں قدم رکھا اُسی دن سے ہر چیز میں انقلاب پیدا کر دیا۔ فکر و احساس میں انقلاب، اندیشہ و خیال میں

انقلاب، فرد و اجتماع کے روابط میں انقلاب، مختصر یہ کہ زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اسلام اپنے ظہور کے دوسری صدی ہجری سے بہت تیز رفتاری اور فطری آرام و سکون کے ساتھ ترقی کرنے لگا۔ اسلام نے مغرب میں بحرِ اٹلانٹک سے صحرائے افریقہ تک اور بحرِ اوقیانوس کے کنارے سے دیوارِ چین تک جھنڈے گاڑ دئے۔ اسی طرح اسپین کے فتح کرنے کے بعد شمال میں سرحد پائیرینیز (PYRENEES) کو طے کرتے ہوئے مسلمان سپاہی سرزمین فرانس میں داخل ہوئے اور اس طرح دنیا کے وسیع ترین اور قومی ترین حکومتوں پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کا دوسرا دستہ مشرق میں سندھ و پنجاب کو فتح کرتا ہوا چین کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

یہ فتح و فیروزی دقیق ترین انسان اصول سے کلی طور پر ہم آہنگ تھی دُنیا میں اٹھنے والی تمام تحریکوں سے اگر اس کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی تحریک مکمل طریقے سے ایک شخص کے ہاتھوں میں منحصر تھی۔ اسلامی معاشرے نے جس شگفت انگیز حقیقت کو دنیا کے سامنے پیش کیا وہ جزیرۃ العرب میں محدود نہیں تھی بلکہ مسلمانوں نے جہاں کہیں بھی قدم رکھا وہاں اسلام کے امید بخش پیغام اور عدل و مساواتِ انسانی کے حیات افزا اصول کا تحفہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔

وحشی اور فطرتِ انسانی کے خلاف حکومتوں کو زیر و زبر کرتے ہوئے اسلام نے اس زمانے میں ایک عادل حکومت کے زیرِ سایہ حقائق و افکار کو نشر کرنا شروع کیا اور اپنی خوش تدبیری کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اپنی روشن منطق اور عمیق تعلیم کے ذریعے مفتوحہ زمینوں پر اثر انداز ہونے لگا اور اس زمانے کے عقائد کو اتنا متاثر کیا کہ جو مذاہب اپنی کمین گاہوں میں بیٹھے ہوئے تھے کمین گاہوں کو چھوڑ کر پیچھے ہٹنے لگے۔ عرب میں بُت پرست، ایران میں زردشتی، مصر و شام میں عیسائی جوق در جوق اسلام کے گرویدہ ہو کر

اسلام قبول کرنے لگے۔

عربستان میں اسلام کے پہلے کوئی ایسا تمدّن نہیں دکھائی دیتا اور نہ کوئی ایسا مذہب ملتا ہے جس نے ایسے عظیم الشان تمدّن کی بنیاد رکھی ہو۔ عرب جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے وہ اقتصاد و علم و دانش سے بالکل بے بہرہ تھا اس کے علاوہ جغرافیائی لحاظ سے بھی وہ ماحول قطعاً نامساعد تھا۔

اگر ہم تلاش و جستجو کریں تو روشن اسلامی تمدّن کے صفحات پر موثق ترین اور عالی ترین تمدّن بشری کے دور کو واضح و آشکار اطریقے سے دیکھ سکتے ہیں جن سے طلب دانش کے میدان میں مسلمانوں کی بے انتہا کوشش اور عمیق افکار کا اظہار ہوتا ہے۔ مسلمانوں ہی نے تجربات کے ایسے دروازے کھولے ہیں جس کے نتائج بہت ہی واضح طریقے سے اسپین میں ظاہر ہوئے۔ تاریخی حقیقتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ جو تمدّن اسلام کے زیر سایہ پروان چڑھا اس کا پہلے والے دوسرے تمدنوں سے کسی بھی طرح کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس بات کا انکار تو دشمنانِ اسلام بھی نہیں کر سکتے کہ اسلام روحی مادی اور عقلی لحاظ سے ایک پرشکوہ اور عظیم تمدن دنیا کو دے چکا ہے اور ملتوں کی ترقی کی تاریخ میں اتنی تیز رفتاری سے بڑھنے والا کوئی مذہب نہیں ہوا۔

اس طویل مدّت میں اسلام علمی و فکری پیش قدمی اور مادی قوّت کے حصول میں کبھی بھی اخلاقی پستی یا شہوت رانی کا شکار نہیں ہوا۔ بلکہ یہ عمیق اور درخشاں تمدن جو آسمانی الہامات کے زیر سایہ دنیا میں رونما ہوا علاوہ اس انقلاب کے جو لوگوں کی ظاہری زندگی میں اس نے پیدا کیا قوموں کی روح کی گہرائیوں تک پر اثر انداز ہوا اور اس نے جاہلیت کے تعصّب، خرافات، گندگیوں کو سرے سے ختم کر دیا اور ان کی جگہوں پر لوگوں کے اندر اچھی عادتیں اور انسانی کمالات پیدا کر دے۔

قرونِ وسطیٰ کا وہ تاریک دور جو نظام تحمیلی کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا اور کلیسا

کے قید و بند میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ تاریکی و پراگندگی اور وحشی پن کے لپیٹ میں جب پورا یورپ تھا تو اس وقت بھی اسلام نے ایک ایسے تمدّن کو پیش کیا۔

اسی زمانے میں کاپرنیکس (COPERNICUS) کے نظریات کی پیروی کرتے ہوئے جب گالیلیو (GALILEO) نے زمین کی کرویت کے عقیدہ کا اظہار کیا تو اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اس کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے عقیدہ سے ان الفاظ میں توبہ کرے۔ یہ گالیلیو ستر سال کی عمر میں آپ حضرات (پوپ اور کشیش مراد ہیں) کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے انجیلِ مُقدّس کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس کو دونوں ہاتھوں سے چھُوتے ہوئے توبہ کرتا ہوں۔ اور زمین کی حرکت جو حقیقت سے خالی دعویٰ ہے ـــــ کا انکار کرتا ہوں۔ اور اس نظریہ کو قابلِ نفرت خیال کرتا ہوں[1]۔

مشہور فلسفی بیکن (BACON) کو ایڈورڈ[2] اول بادشاہ انگلستان کے حکم سے علم شیمی میں بحث کرنے سے روک دیا گیا۔ اور اس کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں علم شیمی پر لکچر دینے سے منع کر دیا گیا اور آخر میں اس کو ملک بدر کر کے پیرس بھیج دیا گیا کہ وہاں پر کلیسا کے زیرِ نگرانی رہے۔ اس زمانہ میں بیکن کے علم و دانش کی طرف توجہ کرنے کو کوتاہ نظری سمجھا جاتا تھا، اور چیزوں کی حقیقت شناسی کو شیطانی علم کہا جاتا تھا۔ اسی لئے بیکن کو مخاطب کر کے کہتے تھے: اس جادوگر کے ہاتھ کاٹ دو، اس مسلمان کو ختم کر دو۔!

تاریخی لحاظ سے یورپ کی علمی ترقی میں نقوشِ اسلامی کا دخل ناقابل انکار حقیقت ہے۔ مغربی محققین و مورخین اس حقیقت کو واضح و روشن کرتے ہیں۔ میں یہاں پر مغربی محققین کے قلم سے نکلی ہوئی مسلمانوں کی علمی و فنی ترقی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

---

[1] تاریخ علوم [2] ایڈورڈ اوّل

علمی و ادبی انقلاب

اسلام ابتدا ہی سے علم و دانش کا حمایتی و طرفدار رہا ہے اور تحصیلِ علم کو ہر فرد پر واجب قرار دیا ہے۔ علم و ادب کی ترویج، آموزش و پرورش کے عام کرنے کی وجہ سے احتکارِ علم کو حرام قرار دیا ہے۔ اساتذہ کو شاگردوں کی تعلیم پر آمادہ کیا اور علم و ادب کی تشویق و ترغیب دلائی۔

بانی اسلام بھی نہ صرف قولاً علم و دانش کی ترویج کے لئے لوگوں کو شوق دلاتے تھے بلکہ عملاً بھی اس بات کی کوشش فرماتے تھے کہ مسلمانوں کی سطحِ معلومات وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔ تاریخی لحاظ سے ایک نمونہ پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ حضور کس قدر مسلمانوں کو علم و دانش کے حصول کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ جنگِ بدر سے کامیاب ہو کر جب مسلمان پلٹے تو ان کے ساتھ اچھی خاصی تعداد مشرک قیدیوں کی تھی۔ ان میں کچھ ایسے بھی قیدی تھے جو فدیہ دے کر اپنے کو آزاد کرانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے لیکن دولتِ علم سے مالا مال تھے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہر مشرک اپنی آزادی کے لئے دس دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھلائے تب اس کو آزادی ملے گی۔ بس پھر کیا تھا مشرکوں نے جی توڑ کر محنت شروع کر دی اور اس طرح مسلمانوں کا اچھا خاصا طبقہ لکھنے پڑھنے کی نعمت سے سرفراز ہو گیا۔

حضرت علیؑ نے اپنی ایک پُر ارزش تقریر کے ضمن میں علم و دانش کی توسیع کو حکومت کا فریضہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: لوگو میرا حق تمہارے اوپر ہے اور تمہارا بھی حق میرے

اُوپر ہے۔ میرے اوپر تمہارا حق یہ ہے کہ تم کو وعظ و نصیحت کروں اور تمہارا خیر خواہ رہوں، قومی سرمایہ اور تمہارے حقوق میں اضافہ کروں، جہل و نادانی کے گہرے غار سے نکل کر تم خوش رفتار اور مؤدب بن جاؤ اس کے لئے تمہاری تعلیم و تربیت کا انتظام کروں[۱]۔

عباسی خلیفہ "مامون الرشید" نے ۲۱۵ھ میں "بیت الحکمۃ" کا بغداد افتتاح کیا۔ یہ ایک علمی انجمن تھی جس میں ایک رسد خانہ، ایک پبلک لائبریری تھی۔ اس کام کے لئے مامون نے دو لاکھ دینار "جو آج کے حساب سے سات ملیون تومان سے زیادہ ہوتے ہیں" خرچ کیا۔ اور مترجمین کا ایک ایسا گروہ ملازم رکھا جو بیگانہ زبانوں اور مختلف علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے جیسے حسنین، بختیشوع، ابن طریق، ابن مقفع، حجاج بن مطر، سرجیس راسی وغیرہ تھے اور بیت المال سے ان کی تنخواہ معین کی[۲]۔

مامون نے "ابن طریق" اور "حجاج بن مطر" جیسے لوگوں کو ــــــ جو مختلف زبانوں کے ماہر تھے ــــــ دوسرے ممالک میں اس لئے بھیجا کہ وہاں سے ہر فن کی علمی کتابیں مثلاً طب، فلسفہ، ریاضی، ادب کی تصانیف جو ہندی، پہلوی، کلدانی، سریانی یونانی، لاطینی، فارسی زبانوں میں لکھی گئی ہوں۔ خرید خرید کر بغداد روانہ کریں۔ ان لوگوں نے بھی حسبِ دستور مامون بہت سی قیمتی کتابوں کو خرید کر مامون کے پاس بغداد بھیجا مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کتابوں کو سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا[۳]۔

جب پورے یورپ میں ایک بھی علمی و ادبی مرکز موجود نہ تھا اُس وقت بھی مسلمانوں کے یہاں فراواں تعداد میں علمی و ادبی مراکز موجود تھے۔ تمام شعبہ ہائے علوم میں ہر ہر شعبے کا اکسپرٹ موجود تھا۔ صلیبی جنگوں کے آغاز سے اسلامی تمدن کے درخشاں افکار اسلامی ممالک سے ختم ہونے لگے اور دوسری جگہوں تک پہنچنے لگے اور یورپ مسلمانوں

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۲ صفحہ ۱۸۹ ۔ ۲۔ تاریخ تمدن ویل ڈورانٹ جلد ۱۱ صفحہ ۱۴۷۔
۳۔ دائرۃ المعارف قرن بستم جلد ۶ صفحہ ۶۰۹۔

کے سرچشمۂ علوم سے سیراب ہونے لگا۔

ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (Dr.GUSTAVE-LEBON) تحریر کرتا ہے: جس زمانے میں کتاب و لائبریری یورپ والوں کے لئے کوئی مفہوم نہیں رکھتی تھی اور تمام کلیساؤں میں راہبوں کے پاس پانچسو سے زیادہ کتابیں نہیں تھیں اور وہ بھی سب مذہبی تھیں اس وقت بھی اسلامی ممالک میں کافی سے زیادہ کتابیں اور لائبریریاں تھیں۔ خود بغداد کی لائبریری "بیت الحکمۃ" میں چار ملیون اور قاہرہ کی لائبریری میں ایک ملیون اور طرابلس کی لائبریری میں تین ملیوں کتابیں تھیں، اور تنہا اسپین میں سالانہ ستّر اسّی ہزار کتابیں اکٹھا کی جاتی تھیں[1]۔

جی، ایسٹرینج (I.ESTRANGE) لکھتا ہے، مستنصریہ یونیورسٹی کی عمارت بہت ہی پرشکوہ، مزیّن، وسیع تھی اس میں بہت قیمتی سامان تھا۔ دنیائے اسلام میں اس یونیورسٹی کی نظیر نہیں تھی۔ اس یونیورسٹی میں حقوق کے چار مدرسے الگ الگ تھے۔ ہر مدرسے میں ۷۵ طالب علم تھے اور ہر مدرسے میں استاد تھے، یہ لوگ طلاّب کو مفت تعلیم دیتے تھے اور ہر ایک کو ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور ان تین سو طالب علموں کو بھی ماہانہ ہر ایک کو ایک ایک طلائی دینار دیا جاتا تھا، اس کے علاوہ باورچی خانہ سے روزآنہ طلاّب و اساتذہ کو گوشت روٹی کی معیّن مقدار میں کھانا بھی دیا جاتا تھا۔ "ابن الفرات" کہتے ہیں اس میں ایک لائبریری تھی جس میں مختلف علوم کی نایاب و قیمتی کتابیں موجود تھیں، طالب علموں کو ان کتابوں سے استفادہ کرنے کی عام اجازت تھی جو کوئی کتابوں سے کچھ نقل کرنا چاہے اس کو نقل کی اجازت تھی قلم و کاغذ یونیورسٹی کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کے اندر حمام اور مخصوص اسپتال بھی تھے۔ اسپتال کے حکماء روزآنہ صبح یونیورسٹی میں جاتے تھے، طلاّب کا معائنہ کرتے تھے ان کے لئے نسخہ لکھتے تھے۔ یونیورسٹی کے تمام گودام کھانے پینے کی چیزوں اور دواؤں سے بھرے رہتے تھے، یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ یہ ساری سہولتیں

---

[1] تاریخ تمدّن اسلام و عرب جلد ۳ صفحہ ۳۲۹

تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں موجود تھیں[1]۔

ڈاکٹر ماکس میر ہوف (Dr:MAX MEYERHOF) لکھتے ہیں: صرف اسلامبول کے مساجد میں ۸۰ سے زیادہ کتب خانے موجود تھے جس میں دسیوں ہزار خطی اور قیمتی نسخے تھے۔ اسی طرح قاہرہ، دمشق، موصل، بغداد، ایران، ہندوستان میں بھی بڑے بڑے کتاب خانے موجود تھے۔ اِن نفیس وگراں قدر کتابوں کی ابھی تک فہرست بھی مکمل نہیں کی جاسکی اور جن کی فہرست شائع ہو چکی ہے ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اسپین کے اسکوریل (ESCORIAL) کتب خانہ ـــــ جو مغرب میں اسلامی علوم کی کتابوں اور رسالوں کا سب سے بڑا مرکز ہے ـــــ کی فہرست ابھی تک مکمل نہیں ہو سکی۔ ہاں اِن چند اخیری سالوں میں دنیائے اسلام کے قدیمی علوم کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے مگر یقینی طور پر یہ اکتشافات ناکافی ہیں۔ دنیا آئندہ علومِ اسلامی کی اہمیت پر مطلع ہو گی[2]۔

ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (Dr:GUSTAVE LEBON) لکھتے ہیں: تحصیلِ علوم کے سلسلے میں مسلمانوں نے جس کوشش کا اظہار کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ مسلمان جب کسی شہر پر قبضہ کرتے تھے تو سب سے پہلے وہاں مسجد و آموزشگاہ بناتے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں بہت سی آموزش گاہیں موجود تھیں جیسا کہ بنجامن لوٹلے (BENTAMIN+ TOLE) نے ـــــ جس کی وفات ۱۱۷۳ء میں ہوئی ہے ـــــ لکھا ہے کہ میں نے صرف اسکندریہ میں بیس آموزش گاہوں کو دیکھا جو چالو حالت میں تھیں۔

عمومی آموزش گاہوں کے علاوہ بغداد، قاہرہ، قرطبہ، وغیرہ میں کچھ ایسی آموزشگاہیں بنوائی گئی تھیں جن میں لیبوریٹری، رصد خانہ، بڑے بڑے کتب خانے تحقیق مسائل کے جملہ اوزار موجود تھے۔ خود اسپین میں ستر عمومی کتب خانے موجود تھے۔ قرطبہ میں "الحاکم دوم" کے کتب خانہ میں چھ لاکھ کتابیں تھیں ان میں چوالیس جلدیں صرف ان کتابوں کی فہرست تھیں حالانکہ چارلس

---

[1] میراثِ اسلام صفحہ ۲۳۰ [2] میراثِ اسلام

(CHARLES) نے اس کے چار سو سال بعد حکومت کی طرف سے پیرس میں ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں ہزاروں زحمتوں کے بعد صرف نو سو جلد کتابیں جمع کر سکا تھا اور اس میں بھی ایک تہائی کتابیں مذہبی تھیں[۱]۔

مسلمانوں کی خدمت یہ نہیں تھی کہ تحقیق و تفتیش کے ساتھ علم کو ترقی دے کر اس کے قالب میں مخصوص رُوح پھونک دیں، بلکہ تحریر و نگارش کتب اور بڑے بڑے مدارس قائم کر کے علم کو دنیا میں منتشر کیا۔ منجملہ ان کے یورپی دنیا پر علوم و فنون و معارف کو نشر کر کے اتنا بڑا احسان کیا ہے جس کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ میں آنے والے ابواب میں ایک باب "مسلمانوں کے علمی و ادبی آثار" قائم کر کے اس میں بیان کروں گا کہ مسلمان صدیوں تک یورپ کے اُستاد رہے ہیں اور صرف مسلمانوں کی وجہ سے یونان و رُوم کے قدیمی علوم یورپ میں رائج ہو سکے ہیں[۲]۔

قرونِ وسطیٰ کے اواخر میں جب پورا یورپ جہالت و نادانی کی آگ میں جل رہا تھا اور لوگ بڑی بے چارگی و بدبختی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس وقت وہاں کے بادشاہ اور امراء اپنا علاج و معالجہ کرانے اسلامی ممالک میں آیا کرتے تھے اور ان کے طلاّب علم و دانش و معرفت سیکھنے کے لئے قاہرہ، بغداد، قسطنطنیہ، قرطبہ، اسکندریہ جیسے یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا کرتے تھے اور یہ یونیورسٹیاں اس زمانے کے تازہ و مناسب ترین وسائل تحقیق و آزمائش سے مزین تھیں اور دنیائے عقل و دانش میں عظمت و غرور کا احساس کرتی تھیں[۳]۔

جوزف مارک کاپ (JOSF MARC KAPP) قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی علمی و ادبی کے بارے میں لکھتا ہے: (اسلامی) معاشرہ کا سب سے نچلا طبقہ بھی کتاب پڑھنے کا تھا۔ مزدور پھٹے پُرانے کپڑے اور معمولی غذا پر اکتفا کر لیا کرتے تھے تاکہ جو کچھ بھی بچ سکے اس سے کتاب خرید لیں ایک مزدور کے پاس ایسا کتب خانہ تھا کہ بڑے بڑے دانشمند ذوق و شوق سے وہاں جایا کرتے

۱؎ تمدنِ اسلام و عرب صفحہ ۵۵۷، ۵۵۸ ۲؎ تمدنِ اسلام و عرب صفحہ ۵۶۲ ۳؎ دائرۃ المعارف قرن بستم جلد ۶

تھے۔ "وفیات الاعیان" ابنِ خلکان میں بڑے بڑے دانش مندوں میں زیادہ تر آزاد شدہ غلام یا غلام زادوں کا نام ملے گا۔ بلکہ اس زمانے کے مشاہیر میں بہت سی عورتوں کے بھی نام ملتے ہیں[1]۔

اسپین کے مسلمانوں کی علمی پیش رفت اور فرہنگی تحریک کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو اس طرح تحریر کرتے ہیں: قرطبہ بہت بڑا شہر تھا اس میں ایک ملیون آدمی بستے تھے۔ اس شہر کے اندر ایک باغ تھا جس کی لمبائی تقریباً بیس کلومیٹر، اور اس کی چوحدی تقریباً چالیس کلومیٹر تھی بیان کیا جاتا ہے کہ ساٹھ ہزار عالی شان قصر و پُر عظمت و پُر شکوہ کوٹھیاں تھیں۔ اور ڈیڑھ لاکھ چھوٹے مکان تھے۔ اسّی ہزار دوکانیں اور تین ہزار آٹھ سو مسجدیں، سات سو عمومی حمام تھے۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو مگر بہر حال اس سے شہر کی عظمت کا تصوّر ہر قیمت پر ہو جاتا ہے۔

اس شہر میں کتب خانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان میں مہم ترین اور معتبر ترین کتب خانہ سلطنتی امیر تھا جس میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ قرطبہ کی یونیورسٹی پورے یورپ بلکہ مغربی ایشیا میں بھی بہت مشہور تھی۔ غریبوں کے لئے بہت سے مُفت مدارس بھی تھے۔

ایک مورخ کا بیان ہے: اسپین میں تقریباً ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ اس کے برخلاف یورپ میں ـــــ مذہبی پیشواؤں سے قطع نظر کرتے ہوئے ـــــ اعلیٰ طبقے تک کے لوگ بھی کامل طور سے جاہل تھے[2]۔

---

[1] عظمتِ مسلمین در اسپانیا صفحہ ۱۷۰ [2] نگاہی بتاریخ جہاں صفحہ ۱۳۲

طبابت

مسلمانوں کی طبی ترقی کے بارے میں ڈاکٹر ماگس میر ہوف (Dr.MAXME YERHOF) لکھتا ہے: صلیبی جنگوں میں مسلمان حکماء عیسائی حکیموں پر ہنستے تھے کیونکہ مسلمان حکماء عیسائی حکیموں کی معلومات کو بالکل ابتدائی اور پست سمجھتے تھے۔

عیسائیوں نے "ابنِ سینا، جابر، حسن بن ہیثم، رازی" کی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا ہے اگرچہ ان کے ترجمہ کرنے والوں کا نام معلوم نہیں ہے مگر ترجمے اب بھی موجود ہیں۔ سولھویں صدی میں "ابنِ رشد اور ابنِ سینا" کی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا تھا اور یہ ترجمے اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ پڑھائے جاتے تھے۔[1]

رازی کی موت کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ دنیائے علم و دانش میں بوعلی سینا (۹۸۰ء تا ۱۰۳۷ء) خورشید خاور بن کے چمکنے لگے۔ زیادہ تر لوگ اُن کو ایک فلسفی اور فزکس کے ماہر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی طبابت کا چرچا یورپ میں حیرت انگیز ہے۔[2]

"رازی اور ابنِ سینا" کے علاوہ بھی اسلامی مملکت کے اطراف و جوانب میں بڑے بڑے ماہر حکیم موجود تھے اور انھوں نے اپنی نفیس و قیمتی کتابیں اور رسالے بطور یادگار چھوڑے ہیں اور ان کتابوں کا لاطینی وغیرہ زبانوں میں متعدد بار ترجمہ ہو چکا ہے اور دانش مندانِ یورپ اُن سے استفادہ کرتے رہے ہیں مثلاً ابوالقیس اندلسی، ابنِ زہر اندلسی، عباس ایرانی، علی ابنِ رضوان مصری، ابن بطلان بغدادی، علی ابن عیسیٰ بغدادی، ماسویہ بغدادی، ابو منصور موفق ہراتی، ابنِ وفید

---

[1] میراثِ اسلام صفحہ ۱۳۲ [2] میراثِ اسلام صفحہ ۱۱۶

اسپیناتی، عمامہ موصلی، ابنِ رشد اندلسی وغیرہ[1]۔

مسلمان بہت سے علوم میں اپنے ہم عصروں سے گوئے سبقت لے گئے ہیں اور دنیائے یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ جب مسلمان یورپ میں آئے ہیں تو اس وقت یورپ والے وبائی میکروبات کو نہیں جانتے تھے عام اسپین والوں کا خیال تھا کہ میکروب وبائی ایک آسمانی بلا ہے جو گناہگار بندوں کی تنبیہہ کے لئے آسمان سے نازل ہوتی ہے، لیکن مسلمان طبیبوں نے یہ بات ثابت کر دی کہ طاعون ایک متعدی مرض کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے[2]۔

ڈاکٹر میر ہوف (Dr. MAX MAYERHOF) ابنِ سینا کی کتابِ قانون کے بارے میں لکھتا ہے کہ دنیائے اسلام میں یہ کتاب ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں یورپ میں یہ کتاب سولہ مرتبہ ترجمہ کر کے چھاپی گئی جس میں پندرہ مرتبہ لاطینی زبان میں اور ایک مرتبہ عبرانی زبان میں چھاپی گئی۔ اور سولھویں صدی میں بیس مرتبہ سے زیادہ چھاپی گئی اس بات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بوعلی سینا کی کتابِ قانون کی کتنی اہمیت ہے۔

لاطینی اور عبرانی زبان میں اس کتاب کی جو شرحیں لکھی گئی ہیں۔ سترھویں صدی کے نصف آخر میں یہ کتاب متعدد بار چھاپی گئی اور ایک زمانۂ دراز تک اس کتاب کا شمار درسی کتابوں میں ہوتا رہا ہے، اور شاید اب تک طب کی کسی بھی کتاب کو اتنا رواج نہیں ہوا۔ ان تمام باتوں کے باوجود طبی ترقی آج بھی دانش مندوں کے لئے مورد مطالعہ واستفادہ ہے[3]۔

ویل ڈورانٹ (WILL DURANT) لکھتا ہے مشہور ترین اور مقدم ترین اسلامی حکیم محمد بن زکریا نے دو سو سے زیادہ کتابیں اور رسالے لکھے ہیں اور ان میں زیادہ تر کتابیں فنِ طب سے متعلق ہیں اور بہت زیادہ سود مند ہیں ان کتابوں میں کبھی دو کتابیں تو نہایت ہی لاجواب ہیں۔

۱۔ آبلہ و سرخک۔ اس کتاب کا ابتداءً لاطینی زبان میں اور اس کے بعد یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوتا رہا۔ ۱۴۹۸ء سے ۱۸۶۶ء تک یعنی چار صدی میں چالیس مرتبہ اس کا ترجمہ

---

[1] میراثِ اسلام صفحہ ۱۱۸ [2] میراثِ اسلام صفحہ ۱۲۸ [3] میراثِ اسلام صفحہ ۱۱۱۔

مختلف زبانوں میں کر کے شائع کیا گیا۔

۲۔ **الحاوی الکبیر**۔ یہ کتاب مصنف کی پوری عمر کے مطالعہ اور طبی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب میں علمِ طب کے تمام مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ ویسے تو یہ کتاب بیس جلدوں میں ہے لیکن سرِدست لوگوں کے پاس دس جلد سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کتاب کی پانچ جلدیں تو صرف آنکھوں کی بیماری سے متعلق ہیں ۱۲۷۹ء میں اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا اور صرف ۱۵۴۲ء میں یہ کتاب پانچ مرتبہ چھپی۔ دنیا میں علم طب کا سب سے بڑا ماخذ اس کتاب کو سمجھا جاتا ہے۔ اور ان نو کتابوں میں سے ایک کتاب یہ بھی تھی جس کی بنا پر پیرس کی یونیورسٹی کو ۱۳۹۴ء میں ایک کتب خانہ بنانا پڑا۔[1]

آپریشن کی ترقی بھی علمائے اسلام کی مرہونِ منت ہے۔ ازمنہ آخیرہ تک یورپ کے طبی مدارس کا دارومدار اسلامی کتابوں پر تھا، انتہا یہ ہے کہ بیہوشی کی دوا جو آج کل کی ایجاد سمجھی جاتی ہے اسلامی جراحوں کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ لوگ "بذر البنج" کے ذریعے مریض کو بے ہوش کیا کرتے تھے۔[2]

رازی نے بہت سی چیزوں کو ایجاد کیا، مثلاً تپ دائمی میں ٹھنڈے پانی کا استعمال۔ مرض سکتہ میں بادکش کا استعمال۔ مرہم جیوہ اور حیوان کی آنتوں سے زخموں کا بخیہ کرنا رازی ہی کی ایجاد ہے۔[3]

بُوعلی سینا کی تمام کتابیں دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ چھٹی صدی تک طب کا دارومدار بوعلی سینا کی کتابوں پر تھا۔ فرانس اور اٹلی کے دارالعلوم میں صرف بوعلی سینا کی کتابیں بطور درس پڑھائی جاتی تھیں۔ ابھی پچاس سال سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے کہ فرانس کی درسی کتابوں سے بوعلی سینا کی کتابوں کو خارج کیا گیا۔[4]

---

[1] تاریخ تمدن ویل ڈورانٹ (WILL DURANT) جلد ۷، صفحہ ۷۵۹ [2] تمدن اسلام و عرب صفحہ ۶۳۷
[3] تمدن اسلام و عرب صفحہ ۶۳۰ [4] تمدن اسلام و عرب صفحہ ۶۳۳

اسلامی اطبّاء نے علم طب اور جراحی میں اتنی چیزوں کو ایجاد کیا ہے کہ جن کی تفصیل بڑی بڑی کتابوں ہی میں مل سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ناخون سے سِل کی بیماری کی تشخیص، یرقان کا علاج ٹھنڈے پانی سے، خون کے بہنے کو روکنا، مثانہ یا گردہ میں پڑجانے والے سنگ ریزوں کو ریزہ ریزہ کر کے باہر نکالنا، فتق کا آپریشن وغیرہ وغیرہ یہ سب مسلمان حکماء کی ایجاد ہیں۔[1]

اسلامی جرّاحوں میں مشہور و بزرگ ترین جرّاح ابوالقاسم اندلسی گزرے ہیں جو ابوالقیس اندلسی کے نام سے مشہور ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی میں آپ کی حیات کا زمانہ ہے۔ آپریشن کے بہت سے آلات کو آپ نے خود ہی ایجاد کیا۔ ان آلات کی تصویر موصوف کی کتابوں میں موجود ہے۔ "ہالر" لکھتا ہے: چودھویں صدی کے بعد جتنے بھی آپریشن ہوئے ہیں اِن کا علمی ماخذ ابوالقیس کی کتابیں تھیں۔ ابوالقیس کی کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے متعدد بار چھاپی جا چکی ہیں۔ ۱۸۱۶ء میں آخری چاپ دنیا کے سامنے آیا۔[2]

---

[1] تاریخ تمدن اسلام جلد ۷، صفحہ ۸۰ [2] تمدّن اسلام و عرب۔

دَواسازی

ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (DR. GUSTAYE LEBON) لکھتا ہے مسلمانوں نے معالجات کے جو نئے نئے طریقے استعمال کئے ان میں سے ایک ٹائیفائڈ میں ٹھنڈے پانی کا استعمال ہے۔ یہ طریقہ چند صدیوں تک متروک رہنے کے بعد یورپ میں پھر دوبارہ استعمال ہونے لگا ہے کیمیکل و فزیکل فارمولوں کے بھی مسلمان ہی موجد و مخترع ہیں۔ ان کے بہت سے طریقے آج بھی ہمارے یہاں اِستعمال ہوتے ہیں۔

مُسلمانوں نے دَواؤں کے اِستعمال میں مخصوص طریقے ایجاد کئے ہیں جو مدّت دَراز کے بعد آج ہمارے یہاں جَدید تحقیق کے عنوان سے مرسوم ہے۔

مُسلمان بھی ہماری طرح مفت اسپتال چلاتے تھے یعنی مخصوص دنوں میں لوگ وہاں جاکر مفت دَوائیں لاتے تھے۔ اور جن مقامات پر اسپتال بنانا مشکل ہوتا تھا وہاں پر اطباء کو مخصوص دنوں میں تمام لوازمات کے ساتھ بھیجا جاتا تھا۔[1]

جرجی زیدان لکھتے ہیں: علمائے یورپ نے اخیری دَور میں دواسازی کے فن میں جو دوڑ دھوپ کی اور تحقیق کی، تو پتہ چلا کہ اس فن کی بنیاد رکھنے والے مُسلمان ہیں۔

مُسلمانوں نے ہی پہلی بار دَواسازی کے طریقے کو ایجاد کیا اور نئی نئی دَوائیں

---

[1] تمدن اسلام و عرب صفحہ ۶۵ — ۶۳۷

بنائیں۔ مسلمان ہی پہلے وہ لوگ ہیں جنھوں نے آج کل کے طریقے پر دوا خانے کھولے تھے، بقول "ماک کاپ" تنہا بغداد میں دوا فروشی کی ساٹھ دوکانیں تھیں جو خلیفہ کے خرچ سے چلتی تھیں[۱]۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اب تک جو دوائیں یا جڑی بوٹیاں یورپی استعمال کرتے ہیں ان کے نام وہی عربی، ہندی، فارسی والے ہیں[۲]۔

———×——(پ)——×———

---

۱ عظمتِ مسلمین در اسپانیہ صفحہ ۱۸۳ ۲ تاریخ تمدن اسلام جلد ۲ صفحہ ۲۷۹

اسپتال

جرجی زیدان لکھتے ہیں، تیسری صدی تمام ہونے سے پہلے پہلے مکّہ، مدینہ اور دوسرے شہروں میں بڑے بڑے اسپتال بنائے جا چکے تھے۔ مقتدر عباسی اور اس کے وزراء اسپتال بنوانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے صرف بغداد میں تھوڑی سی مدّت کے اندر چار عظیم الشان اسپتال بنوائے جا چکے تھے اور ۳۶۵ ہجری میں عضد الدولہ نے بغداد کے مغربی حصّے میں "عضدی اسپتال" بنوایا تھا جس میں ۲۴ اکسپرٹ حکیم تھے اور ان میں سے ہر ایک الگ الگ شعبے میں اکسپرٹ تھا۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے یہ اسپتال مدّت دراز تک اسلامی اسپتالوں میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔[1]

اس زمانے کے اسلامی اسپتال بہت قرینے کے ہوتے تھے۔ مذہب، ملّت پیشے کا لحاظ کئے بغیر تمام مریضوں کی بہت توجہ کے ساتھ دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ ہر ہر مرض کے لئے ایک ایک یا کئی کئی لمبے چوڑے ہال بنوائے گئے تھے جس میں ـــــ مریضوں کی دیکھ بھال کے علاوہ ـــــ دَواسازی اور طبابت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اور شاگردوں کو علم سکھانے کے ساتھ عملی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے چلتے پھرتے اسپتال بھی آج کل کی طرح سے ـــــ بنوائے تھے۔ جن کو اونٹوں اور خچروں کے ذریعے اِدھر اُدھر منتقل کیا جاتا تھا۔ انھیں میں سے سلطان محمود سلجوقی کا اسپتال تھا جس کو چالیس اونٹ منتقل کیا

---

[1] تاریخ تمدن اسلام جلد ۳ صفحہ ۲۷۹

کرتے تھے[۱]

ڈاکٹر گوستاوے لیبون (Dr. GUSTAVE LEBON) لکھتا ہے مسلمانوں کے اسپتال بہترین اصولِ صحت کے مطابق بنائے گئے تھے اور یورپ کے آج کل کے اسپتالوں سے بہتر تھے۔ یہ اسپتال وسیع اور ہوادار ہوا کرتے تھے۔ جب محمد بن زکریا رازی کو حکم دیا گیا کہ بغداد میں آب و ہوا کے لحاظ سے بہترین جگہ تلاش کرو جہاں اسپتال بنایا جاسکے، تو رازی نے جگہ کے انتخاب کے لئے جو طریقہ آزمایا گیا تھا اس کی آج کل کے امراض متعدیہ کے محققین بھی تصدیق کرتے ہیں۔ رازی نے شہر کے مختلف حصّوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ہر جگہ گوشت کا ٹکڑا لٹکا دیا۔ جس جگہ کا گوشت سب کے بعد خراب ہوا وہیں پر رازی نے اسپتال بنوانے کی رائے دی۔

مسلمانوں کے اسپتال بھی آج کل کے اسپتالوں کی طرح تھے ان میں بھی بیماروں کے لئے بڑے بڑے ہال بنوائے گئے تھے۔ کچھ کمرے محض طلاب کو تعلیم دینے کے لئے مخصوص کر دئے گئے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ طلاب امراض کو معائنہ کر کے صحیح استفادہ کرسکیں اور تجربہ و مشاہدے کے ذریعے فن کی تکمیل کرسکیں۔

آج کل کی طرح پاگلوں کے لئے علیحدہ اسپتال بنوائے گئے تھے اور مفت کے دواخانے بھی کھولے گئے تھے۔[۲]

ڈاکٹر جوزف مارک کاپ (Dr. JOSFF MARC KAPP) لکھتا ہے: قاہرہ میں ایک بہت بڑا اسپتال بنایا گیا تھا جس میں فوارے، پھولوں سے لدے ہوئے باغیچے اور بہت بڑی چہار دیواری تھی جس بیمار کا اس اسپتال میں داخلہ ہوتا تھا اچھا ہو کر جب وہ جانے لگتا تھا تو اس کو پانچ طلائی سکے بھی دئے جاتے تھے۔[۳]

شہر قرطبہ میں چھ سو مسجدیں، نو سو عمومی حمام، پچاس اسپتال تھے۔[۴]

———×———(۰)———×———

۱۔ تاریخ تمدن اسلام جلد ۳ صفحہ ۲۸۲ ۲۔ تمدن اسلام و عرب صفحہ ۶۳۵ ۳۔ عظمتِ مسلمین در اسپانیہ صفحہ ۱۸۳
۴۔ جہان اسلام صفحہ ۸۲ اور ۸۳۔

شیمی[1] (کیمیا)

امام جعفر صادقؑ کے مشہور شاگرد اور علمی دنیا میں عظیم شخصیت کے حامل "جابر بن حیان" فن کیمیا میں فوق العادۃ مہارت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ماکس میر ہوف (Dr. MAX MEYER HOF) ان کے بارے میں لکھتا ہے: جابر ساری دنیا میں کیمیائے عرب کے بابا آدم کے نام سے مشہور ہیں۔ جابر ابنِ حیان کی فن شیمی کیمیا میں اس وقت بھی سو کتابیں لوگوں کے پاس ہیں۔ ان کی کتابیں یورپ کی کیمیا (شیمی) کی تاریخ میں بہت مشہور ہیں[2]۔

مرحوم علامہ سیّد ہبتہ الدین شہرستانی تحریر فرماتے ہیں: میں نے خود جابر کی پچاس جلدیں کتاب قدیم خط میں دیکھی ہیں اور ان کتابوں میں جس علمی موضوع کو جابر بیان کرتے ہیں اس کی نسبت امام جعفر صادقؑ کی طرف دیتے ہیں۔ اس کے بعد علامہ شہرستان اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جابر بن حیان کی پانچ سو کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور ان میں کی زیادہ تعداد برلن و پیرس کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ دانش مندانِ یورپ جابر کو استادِ حکمت کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور ان کا نام بہت عظمت کے ساتھ لیتے ہیں۔ دانش مندانِ یورپ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ عناصر میں ۱۹ عنصر جو اب تک کشف کئے جا چکے ہیں ان سب کو جابر نے کشف کیا ہے۔ جابر کہتے ہیں تمام عناصر کی بازگشت ایک عنصر قومی برق و آتش کی طرف ہوتی ہے جو باریک سے باریک ذرّے کے اندر چھپی ہے۔ جابر کا یہ قول الکٹرونی

---

[1] ایک ایسا علم ہے جس میں اجسام طبیعی کے خواص اور ایک دوسرے میں ان کے اثر سے بحث کی جاتی ہے۔ شیمیائی تاثیرات کے واسطہ سے ایک جسم کو دوسرے جسم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ایسا کرنے کے بعد اس جسم کی پہلے والی خاصیت بھی بدل جاتی ہے (مترجم) [2] میراثِ اسلام صفحہ ۱۱۲

طاقت ـــ جو ایٹم کے اندر موجود ہے ـــــ سے بہت نزدیک ہے اور دونوں باہم مطابقت رکھتے ہیں[1]

ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (Dr. GUSTAVE LEBON) لکھتا ہے: مسلمانوں نے مواد کا ایک ایسا سلسلہ کشف کیا تھا جس کی صنعت اور شیمی کیمیا کے روزانہ استعمال میں ضرورت پڑتی ہے۔ اگرچہ اسلامی علماء اس علم کو جانتے تھے مگر افسوس کی بات ہے کہ ان کی اکثر وہ کتابیں جو اس موضوع پر لکھی گئیں مفقود ہیں۔ موجودہ کتابوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شیمیائی کیمیائی ترکیبات میں کتنے ماہر تھے۔ رنگ سازی، دھاتوں کو نکالنا، لوہا بنانا، چرم سازی میں ان لوگوں کو جو مہارت تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ پیشے و ہنر میں بھی علم شیمی (کیمیا) سے استفادہ کرتے تھے۔

کیمیا (شیمی) کی کتابوں میں جو یہ لکھا جاتا ہے "لاوازید" اس علم کا موجد ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ کوئی بھی علم خواہ وہ شیمی کیمیا ہو یا غیر شیمی کیمیا دفعتاً موجود نہیں ہو جاتا۔ اگر مسلمانوں کی ہزار سال پہلے والی لیبوریٹریاں اور ان کے اہم اکتشافات نہ ہوتے تو لاوازید کسی بھی قیمت پر ترقی نہیں کر سکتا تھا[2]

جرجی زیدان لکھتا ہے: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں ہی نے اپنے عملیات و تجربات سے جدید علم شیمی کیمیا کی بنیاد رکھی ہے۔ انہیں لوگوں نے بہت سے شیمی کیمیائی ترکیبات کو کشف کیا ہے اور انھیں اکتشافات کی بنیاد پر جدید علم شیمی کیمیا مضبوط و استوار ہوا ہے۔ اہل دانش کا اعتراف ہے مسلمانوں نے ہی نائٹرک ایسیڈ (NITRIC ACID) سلفیورک ایسیڈ (SULPHURIC ACID) نائٹرو گلیسرین (NITRO-GLYCERINE) ہائڈروکلورک ایسیڈ (HYDROCHLORIC ACID) پوٹاسیم (POTA-SSIUM) جوہر نوشادر، نمک نوشادر، نیٹریٹ سلور (NITRATE SILVER) سلفیورک کلورائڈ

---

[1] الدلائل والمسائل [2] تمدن اسلام و عرب صفحہ ۶۱۲

(SULPHURIC-CHLORIDE) الکحل پھٹکری (ROTASSIUM NITRATE) پوٹاسیم نائٹریٹ ہڑتال، بورکیس (BORAX) وغیرہ چیزوں کو کشف کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی علم کیمیا کے ماہر علمائے اسلام نے بہت سی چیزوں کو کشف کیا ہے جن کا اجمالی علم تو ہمارے پاس ہے، لیکن ان کی حقیقت کیا ہے وہ کیونکر بنی ہیں ان کے بارے میں ابھی تک ہم کو صحیح اطلاع نہیں ہو سکی[1]

سرار اورڈ (SERARAVARD) علم کیمیا کی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ خلفائے بنی عباس کے زمانے میں علم کیمیا نے قابل لحاظ ترقی کی تھی اور مسلمان تقطیر، تبخیر، تصعید وغیرہ کو استعمال کرنے لگے تھے اور پہلی بار سوڈیم (SODIUM) کاربن (CARBON) پوٹاسیم کاربونیٹ (POTA-SSIUM CARBONATE) کلورائڈ (CHLORIDE) امونیم (AMMONIUM) المونیم (ALUMINIUM) ڈائی پوٹاسیم (DI-POTASSIUM) کلوریڈ المونیم (CHLORIED ALUMINIUM) سلفیٹ (SULPHATE) سلفا ڈائی پوٹاسیم (SULPHA-DI-POTASSIUM) فیرک سلفیٹ (FERRIC-SULPHATE) ڈائی سوڈیم بوریٹ (DI-SODIUM BORATE) نیٹریٹ (NITRATE) میرکورک سلفیٹ (MERCURIC SULPHIDE) کروسیو سبلیمیٹ (CORROSSIUE-SUBLIMATE) کو باقاعدہ جانا اور اس کا استعمال شروع کیا[2]

ڈاکٹر میر ہوف (Dr. MAX MEYFRHOF) رازی کے لئے لکھتا ہے کہ اس آخری دور میں ان کی کتاب "صنعت کیمیا" ایک ہندوستانی شاہزادے کے کتب خانے میں ملی ہے۔ رازی نے اس کتاب میں مختلف چیزوں کی طبقہ بندی کی ہے اور ہر ایک کی کیمیائی خواص بڑی اچھی طرح سے شرح کی ہے[3]

ویل ڈورانٹ (WILL DURANT) لکھتا ہے: کیمیا کا ایک فن اور علم کی حیثیت سے پہچانا جانا درحقیقت مسلمانوں کی اختراع ہے، کیونکہ یونانیوں کا طریقہ کار ــــ میرے

---

[1] تاریخ تمدن اسلام جلد ا صفحہ ۲۷۹ [2] عظمت مسلمین در اسپانیا صفحہ ۱۸۱ [3] میراث اسلام صفحہ ۱۱۲

خیال ہیں ـــــ بعض تجربات و مبہم فرضیات پر تھا۔ مسلمانوں نے دقیق مشاہدہ اور علمی توجہ سے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ بہت سی چیزوں کا تجزیہ کیا۔ پتھروں کے بارے میں کتابیں لکھیں، پھٹکری اور تیزاب میں فرق بتایا۔ سینکڑوں طبّی دواؤں کی تحقیق کی، اور سینکڑوں نئی نئی دوائیں ایجاد کیں۔ عام دھاتوں کو سونا بنا دینے کے مفروضے کو کیمیا کے ذریعے ایک حقیقت بنا دیا، علماء اسلام کی بہت سی تصانیف ـــــ بعض تصانیف کے مُصنّف نامعلوم ہیں اور لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں ـــــ کے ذریعے یورپ کے اندر علم کیمیا کی ترقی ہوئی ہے[1]

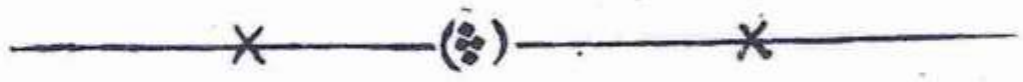

[1] تاریخ تمدن ویل ڈورانٹ جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۵

ایجادات

خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں سب سے پہلے مسلمانوں نے دنیا کی پہلی گھڑی ایجاد کی۔ ہارون رشید نے اس گھڑی کو بطور ہدیہ بادشاہ فرانس شارلمان (SHARLEMANE) کو بھیجا۔

ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (Dr. GUSTAVE LEBON) اس سلسلے میں لکھتا ہے: ہارون رشید نے فرانسیسی سفیر کے ذریعے بہت سے ہدایہ بادشاہ فرانس اور بادشاہ مغرب کو بھیجے۔ ان تمام ہدایہ میں سب سے زیادہ اہم وہ گھڑی تھی جو وقت بتاتی تھی اور ہر گھنٹے پر گھنٹی بجاتی تھی۔ سارلمان اور اس کے مصاحبین اس گھڑی کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے۔ اور پورے دربار میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو اس گھڑی کی بناوٹ کو سمجھ سکتا۔[1]

جب مسیحیوں کے قتل عام یا ملک بدر کرنے کی وجہ سے مسلمانوں سے اسپین خالی ہو گیا تو وہاں کی صنعتیں بھی ختم ہو گئیں۔ یہی ڈاکٹر لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے نکال دینے کے بعد اسپین میں اتنا انحطاط ہو گیا کہ شاید صفحاتِ تاریخ میں کسی قوم کے اندر اتنی جلد اتنا بڑا انحطاط نہ پیدا ہوا ہو۔ علم، فن، زراعت، حرفت غرضیکہ ایک ملک کی ترقی کے لئے جتنی چیزیں ضروری ہیں وہ سب دفعتاً نظروں سے غائب ہو گئیں۔

---

[1] تمدن اسلام و عرب۔

بڑے بڑے کارخانے بند ہو گئے، زراعتی کام ٹھپ ہو گئے، زمینوں کی آمدنی ایک دم سے ناپید ہو گئی۔ اس کا قہری نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کے شہر ویران ہو گئے۔ کیونکہ کوئی بھی شہر صنعت و حرفت کے بغیر آباد نہیں رہ سکتا، مڈریڈ (MADRID) چار لاکھ سے گھٹ کر دو لاکھ ہو گئی، اشبیلیہ میں ایک ہزار چھ سو کارخانے جس میں ایک لاکھ تیس ہزار مزدور کام کرتے تھے وہ گھٹ کر تین سو کارخانے پر آ گئے۔ ہیئت مقننہ کی طرف سے فیلیپ کو جو اطلاع ملی ہے اس کے بموجب آبادی صرف ایک چوتھائی رہ گئی تھی۔[1]

یہی فرانسیسی دانش مند لکھتا ہے: مسلمان ہی کاغذ کے بھی موجد ہیں وہ لکھتا ہے مدّت دراز تک یورپی تحریریں پوست پر لکھی جاتی تھیں اور ان پر اتنی لاگت آتی تھی کہ کتابوں کو چھاپنا اور ان کی اشاعت کرنا ناممکن تھا۔ اور وہ پوست بھی اتنا کمیاب تھا کہ روم و یونان کے راہب قدیمی تالیفات کو اکٹھا کر کے، ان کی تحریریں مٹا کر ان کی جگہ مذہبی مسائل لکھا کرتے تھے۔ اگر مسلمانوں نے کاغذ کی ایجاد نہ کی ہوتی تو یہ راہب ساری پرانی کتابوں کو برباد کر دیتے۔ مسلمانوں کی اس ایجاد نے دنیائے علم و دانش کی حقیقی خدمت کی ہے۔

کاسیری (CASICRIE) نے اسکوریل لائبریری (ESCORIALLIBR-ARY) کے کتب خانے میں ایک کاغذ کی کتاب تلاش کی تھی جو ۱۰۰۹ء میں لکھی گئی تھی، اور یورپی کتب خانوں میں سب سے زیادہ قدیم خطی کتاب تھی۔ اسی کتاب سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے مسلمانوں نے پوست کی جگہ

---

[1] تمدن اسلام و عرب۔

کاغذ کا استعمال شروع کیا۔

اس کے بعد یہی مورخ جن لوگوں نے ریشمی کاغذ کے ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر باندھا ہے۔ ان کے بارے میں لکھتا ہے: ریشمی کاغذ اس زمانے میں یورپ میں استعمال نہیں ہوتا تھا، کیونکہ یورپ میں ریشم کا وجود ہی نہیں تھا صرف روئی تھی۔ مسلمانوں نے روئی سے کاغذ بنایا اور اس طرح سارے یورپ پر عظیم احسان کیا۔ مسلمانوں کی قدیمی کتابوں کے کاغذ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس فن کو انتہائے کمال پر پہنچا دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ اس سے بہتر ابھی تک کاغذ ایجاد نہیں ہو سکا۔

اس سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ زمانۂ قدیم سے کاغذ بنانا مسلمانوں کا خاصہ رہا ہے[1]

---

[1] تمدن اسلام و عرب۔

ریاضیات

بارون کارول ڈی واکس (BARON CARRADE VAUX) لکھتا ہے:
مسلمانوں کو مختلف علوم میں مہارت تھی۔ انھیں لوگوں نے دنیا کو اعداد نویسی سکھائی۔ جبر و مقابلے کو صحیح صورت میں دنیا کے لئے پیش کیا۔ اور اس میں کافی ترقی دی۔ پھر تحلیلی ہندسہ کی اس کی جگہ رکھا۔ لاریب سطحی و کروی مثلثات جس کا یونانی میں کوئی حقیقی وجود نہیں تھا ــــ کے موجد یہی لوگ ہیں۔

جب پورے کا پورا یورپ بربریت، جنگ و جدال میں مبتلا تھا مسلمان اس وقت بھی سرگرمی سے علوم کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنے حفظ معنویات کی کوشش کرتے تھے[1]

تھوڑے ہی دنوں میں مسلمانوں نے علوم ریاضیات میں بہت زیادہ ترقی کر لی۔ ہندسہ، جبر، مثلثات وغیرہ میں ایجاد و اختراع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج کا بہترین علم ریاضی مسلمانوں سے یورپ پہونچا اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اب تک ان علوم کی اصطلاحات عربی کی صورت میں باقی ہیں۔ جیسے اَلجَبر عربی ہے۔ اور حساب کے ارقام کو آج بھی فرانسیسی میں رقم کیپر (CIPHER) کہتے ہیں جو عربی لفظ ہے۔ اسلام نے بڑے بڑے ریاضی کے ماہر پیدا کئے جنھوں نے اہم ایجادات کیں جو آج بھی دنیا کیلئے مورد توجہ ہے۔

---

[1] میراثِ اسلام صفحہ ۲۹۳

آسطرلاب (ASTROLABE) کے موجد مسلمان ہیں۔ اس کے مثلثات و اصطلاحات کی ایجاد عرب یا ایران کے ماہرین ریاضیات نے کیں۔

ابوریحان بیرونی، خیام جیسی شخصیتیں ایرانی ہیں۔ ریاضی میں ان کے کافی آثار موجود ہیں۔

ولز (WILLS) اپنی کتاب "آزمائش در تاریخ عمومی" میں لکھتا ہے: تمام علوم ریاضی مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔[1]

———x———(❁)———x———

---

[1] مجموعہ انتشارات تبلیغاتِ اسلامی۔

جغرافیہ

مشہور فرانسیسی مؤرخ ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (DR. GUSTAVE LEBON) لکھتا ہے: مسلمان کشتی رانی میں ہمیشہ سے دلیر تھے۔ دُور دُور کی مسافرت میں کبھی مضطرب و پریشان نہیں ہوتے تھے۔ حکومتِ اسلامی کے اوائل میں انھوں نے اپنا تجارتی سلسلہ چین جیسے دور دراز ملک سے قائم رکھا تھا، بلکہ روس کے بعض علاقوں میں اور افریقہ تک ان کا سلسلہ قائم تھا۔ اور اس وقت اہل یورپ کو اس موضوع سے کوئی ربط تک نہیں تھا ـــــ سلیمان نے جب اپنا سفرنامہ نشر کیا تو یہ یورپ میں پہلی کتاب تھی جس نے چین کے بارے میں لکھا تھا۔ اسی صدی کے اوائل میں سلیمان کے سفرنامہ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔

ابنِ موقل۔ دنیائے اسلام کا زبردست جغرافیہ کا ماہر تھا وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے: میں نے اپنی اس کتاب میں زمین کے طول و عرض کو لکھ دیا ہے اور تمام اسلامی ممالک اور اسلامی سرحدوں کی تشریح کر دی ہے۔ اور ہر ملک کے ذکر کرتے وقت اس ملک کا ایک نقشہ بھی ساتھ میں دے دیا ہے جس سے اس ملک کے مختلف مقامات معلوم ہو جاتے ہیں۔ ہر ملک سے مربوط مسائل کو بھی ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً شہر، قصبہ، بڑی نہریں، دریا، ذرائع آمدنی، اقسام زراعت، راستے، ان کا فاصلہ دوسرے ممالک یا ہمسایہ ممالک سے، تجارتی چیزیں، مختصر یہ کہ بادشاہوں اور وزیروں یا دوسرے طبقے کے افراد کے لئے علم جغرافیہ سے متعلق تمام امور کی اس کتاب میں شرح کر دی

ہے۔ اس کے بعد یہی مورخ چند اسلامی ماہرین جغرافیہ ــــ مثلاً ابو ریحان بیرونی، ابن بطوطہ ابوالحسن وغیرہ ــــ کا ذکر کرتے ہوئے اضافہ کرتا ہے کہ مسلمانوں نے جغرافیہ میں بہت زیادہ پیش رفت اور ترقی کی، اور اس ترقی کی اصلی علت مسلمانوں کا کثرت سے سیر و سیاحت کرنا تھی۔ اور کچھ وہ معلومات بھی تھیں جن کو ان لوگوں نے علم ہیئت سے فراہم کی تھیں[1]۔

———x——(※)——x———

---

[1] تمدن اسلام و عرب۔

ہنر

مشہور فرانسیسی مؤرخ ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (Dr. GUSTAVE LEBON) لکھتا ہے: اسلامی مساجد، مہمان سرائیں، آموزش گاہیں اسی طرح بنائی گئی ہیں کہ ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے دین کو تمدن سے اسی طرح مخلوط کر دیا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہے۔ ہر ملّت و مذہب کے فنّی ذوق کا ان کی یادگاروں عبادت گاہوں وغیرہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسلام نے اپنے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بنیادی تغیّر کر کے روحانیت و ضرورت کی رنگ آمیزی کے ساتھ ایک جداگانہ صنعت بنا دیا۔ بہت سی موجود دلیلوں کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان چیزوں میں کوئی مذہب مسلمانوں سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ مسلمانوں کی قدیم عمارتوں کو دیکھ کر ان کی قوّتِ ابتکار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مسجد قرطبہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے جس کو مقامی کاریگر ہی نے بنایا تھا لیکن پھر بھی نئے طریقے اور نئے ڈھنگ کو اس میں استعمال کیا گیا ہے۔

لکڑی، ہاتھی دانت، موتیوں کی پچی کاری کی صنعت کو مسلمانوں نے بام ترقی پر پہونچا دیا تھا۔ قدیمی مساجد، ان کے خوبصورت دروازے، زینت بخش منبر، چھتوں کی پچی کاری، کھڑکیوں، دریچوں کی موجودہ شکل و صورت، یہ ایسی چیزیں ہیں جو مسلمانوں کی باقیماندہ یادگاریں ہیں۔ حد یہ ہے کہ صرف کثیر کے بغیر آج بھی ان کے نمونے کے طور پر تعمیر نہیں کی جاسکتی۔

مُسلمان ہاتھی دانت پر کندہ کاری میں کافی مہارت رکھتے تھے مثال کے طور پر سینٹ ایزیڈور ڈولئون (SAINTISIDORE DOLUEN) کے کلیسا کی میز اور گیارھویں صدی میں بادشاہ اشبیلیہ کے لئے بنایا گیا۔ ہاتھی دانت کا صندوق ہمارے دعوے کی زندہ دلیل ہے۔ اسی طرح بارھویں صدی میں ہاتھی دانت کا چھوٹا صندوق جو کلیسائے بایکس سے متعلق ہے، یہ بھی شاہد قوی ہے۔ اور (غالباً) یہ چھوٹا صندوق صلیبی جنگوں میں یورپین لوگ مصر سے لائے تھے۔ اس چھوٹے سے صندوق پر چاندی کی پچی کاری ہوئی ہے اور اوپری حصّے میں زرکوبی کی گئی ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ باریک کاموں کو بھی سادہ ہتھیاروں سے بنالیا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ سخت ہوتے تھے اور یہی چیز ان کے فنّی ذوق اور ذہانت کی علامت ہے۔ آج کل دمشق و قاہرہ میں جو ہتھیاروں کے زیور اور مُرصّع کاریاں دکھائی دیتی ہیں وہ خلفائے اسلامی کے زمانے کی مُرصّع کاری کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس وقت ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ دَور میں یورپ کے اندر کوئی ایسا صنعت گر موجود نہیں ہے جو مشرقی قدیم و سادہ آلات کے ذریعے مشرقی صنعت گروں کی طرح ایک تخت پر پچی کاری یا ایک کوزے کی مُرصّع کاری کرسکے، یا بہترین دست بند بنا سکے۔

کاشی بنانے میں بھی مُسلمان فن تعمیر کی طرح بہت جلد آگے بڑھے ہیں اور اس کو اس منزل پر پہونچا دیا ہے کہ آج تک کوئی ان کا ہمسر نہیں بن سکا۔

دسویں صدی عیسوی کے شروع میں اسپین کے اندر مسلمان کاشی کی مینا کاری بنانے لگے تھے۔ اس کام کے لئے انھوں نے کارخانے بنائے تھے جہاں سے پوری دنیا میں کاشی کی سپلائی ہوتی تھی۔ تیرھویں صدی میں "الحمرا" کے اندر

کاشی کی جو مینا کاری ہوئی ہے اس کو ہم نے ـــــ ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون ـــــ نے دیکھا ہے کہ وہ کتنی لاجواب ہیں۔ وہ موتیوں کی طرح چمکتی ہیں "الحمرا" کی کاشی اٹلی کی مشہور کاشی ـــــ مجالکا ـــــ کی طرح برّاق و درخشاں ہے۔ اور اٹلی والوں نے بھی فن کاشی سازی مسلمانوں سے سیکھا ہے۔ مسلمانوں کی کاشی کاری کی بہت ہی مشہور یادگار "الحمرا" کا گلدان ہے جو ڈیڑھ میٹر اونچا اور جس میں عجیب و غریب صنعت صرف کی گئی ہے۔[1]

ڈاکٹر ماکس میرہوف (DR. MAXMEYERHOF) لکھتا ہے: اسلامی علم و دانش کے ذخیرے رفتہ رفتہ کر کے اب ظاہر ہو رہے ہیں اور عام طریقے سے لوگ ان کا استفادہ کر رہے ہیں۔ ادھر چند آخری سالوں میں جو انکشافات ہوئے ہیں انھوں نے اسلامی دنیا کے قدیم علوم کی تاریخ پر جدید روشنی ڈالی ہے۔ مگر یہ انکشافات ابھی بہرحال ناکافی ہیں مستقبل میں دنیا علوم اسلامی کی اہمیت پر مطلع ہو سکے گی۔

قرونِ وسطیٰ کے یورپی تاریک راتوں کو اسلامی علوم نے ماہ تاباں کی طرح روشن و منور بنایا۔ لیکن جب علوم جدید ظاہر ہوئے تو اس چاند کی روشنی مدھم ہو گئی مگر یہ وہی چاند تھا جس نے تاریک راتوں میں ہدایت بخش کر یورپ کو اس منزل پر پہونچایا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس چاند کی روشنی آج بھی ہمارے ساتھ ہے۔[2]

دوسرے اور بہت سے یورپی و امریکی مؤرخین و دانش مندوں نے مختلف اسلامی علوم کی گہری تاثیر کو مغرب کی ترقی کے سلسلے میں بہت خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے استاد "جان برٹرانڈ" (JOHN BERTRAND) لکھتے ہیں، "مادی و معنوی لحاظ سے جب یورپ کا بہت بڑا حصّہ بدبختی و گمراہی کا شکار تھا۔

---

[1] تمدن اسلام و عرب [2] میراثِ اسلام صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۳۴

اسپین کے مسلمان بہترین تمدن اور منظم اقتصادیات کو جنم دے چکے تھے۔

مسلم اسپین نے صنائع علوم مثلاً فلسفہ و شعر وغیرہ کی نشوونما اور ترقی میں دولت کا ایک طومار خرچ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرھویں صدی میں "تھومس اکینوس" (THOMAS AKINOSE) اور "ڈانتے" (DANTE) جیسے یورپی مفکرین کو اس سے متاثر ہونا پڑا۔ لہٰذا اسپین کو یورپ کے ترقی کا مشعلِ راہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔[1]

"چیمبر" (CHAMBAR) انگریزی مفکر لکھتا ہے: سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا قلم اس بات کے بیان کرنے سے عاجز ہے کہ یورپ کی ترقی و تربیت میں مسلمانوں نے انسانیت کے کسقدر آداب و رسوم اور زندگی کی کتنی سعادتوں کو داخل کیا۔

اگر ۷۱۱ء میں "طارق بن زیاد" کی سرکردگی میں مسلمان "جبل الطارق" نہ پہنچتے اور وہاں سے یورپ کی سرزمین میں داخل نہ ہوتے تو پتہ چلتا کہ ہم اہلِ یورپ کو کتنا نقصان پہونچا اور آج کی ترقی کی دوڑ میں ہم کتنے پیچھے رہ گئے۔[2]

انگریزی دانش مند "بوگولد" (BOGOLD) لکھتا ہے: بغداد اور اسپین کی اسلامی یونیورسٹیوں میں یہودی اور عیسائی طالب علم بڑی خندہ پیشانی سے قبول کئے جاتے تھے اور ان کی تعلیم کا پورا خرچ حکومت اسلامی برداشت کرتی تھی۔ اور ان طلاّب کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ سیکڑوں یورپی نوجوانوں نے مسلمانوں کی اس آزادی اور مدد سے فائدہ اٹھایا اور ان علمی مراکز میں جاکر تحصیل علم کیا کرتے تھے۔

امریکی مورخ "ورابر" (VROBAR) لکھتا ہے: اسلامی علماء اکثر قدیم و جدید علوم کے ماہر تھے۔ ان لوگوں کو "میکینک" (MACHANICS) ایذروستانیک (AZROSTANICS) ڈینامیک (DYNAMICS) کمیسٹری (CHEMISTRY) فزکس (PHYSICS) مباحث تقطیر (DISTILLATION) تصعید (EVAPORATION) تصفیہ (PURIFICATION) میں

---

[1] میراثِ اسلام صفحہ ۱۵۲ [2] فتوح العرب و کنوز الادب صفحہ ۲۶

کافی مہارت تھی۔ اسلامی یونیورسٹیوں میں فزکس، کیمسٹری، ہیئت سے لے کر زراعت، علوم امدادی، اخلاقی کے بڑے بڑے فلسفی ماہر تھے۔ اسلامی یونیورسٹی کے علاوہ آپ کو کوئی ایسی یونیورسٹی نہیں ملے گی جس میں چھ ہزار طالب علم پڑھتے ہوں۔ فیلیپ حتی (PHLIP HATI) کہتا ہے: قرطبہ میں میلوں تک راستے میں پتھر لگائے گئے تھے جن پر دور دور یہ مکانوں کی روشنی پڑتی تھی۔ اور یورپ میں لندن و پیرس تک میں اس وقت کا کیا ذکر۔ اس کے سات قرنوں کے بعد بھی یہ حالت نہیں ہو سکی۔

مدتوں بعد تک ـــــ بارش میں نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ـــــ اور اگر کسی نے ہمت کر کے بارش میں اپنے گھر سے قدم نکالا تو پنڈلیوں تک کیچڑ میں پیر دھنس جایا کرتے تھے۔ جس زمانے میں اکسفورڈ کے اندر بھی حمام کے اندر نہانے کو ایک بت پرستی تصور کیا جاتا تھا قرطبہ کی نسلیں بہترین حماموں سے فائدہ اٹھاتی تھیں[1]

بریلوتھ (BRILIOTH) اپنی کتاب (انسان سازی) میں اس طرح لکھتا ہے:
سرزمین یورپ کے افق پر چمکنے والی ہر روشنی کی اصل مسلمانوں کی دین سمجھنا چاہیے۔ عقل ایک ایسا ہدیہ ہے جس کو اسلام نے جدید روشنی کو بخشا۔ اگرچہ سرزمین یورپ کے افق پر چمکنے والی ہر روشنی اسلام کی دین ہے لیکن اس کی اہمیت اس سے اور زیادہ ہو جاتی ہے جب اس کے اثرات دنیائے جدید کی عظیم قوت میں مشاہدہ کرتے ہیں ایسی قوت علوم طبیعی اور کاوش علمی کی روح میں چھپی ہے۔

مسلمانوں نے ہم کو ـــــ اہل یورپ ـــــ جو کچھ دیا ہے وہ ناگہانی اکتشافات یا ناپختہ افکار نہیں ہیں بلکہ ایک ایسا مفہوم ہے جو ہمارے تصورات سے بالاتر ہے کیونکہ ہماری عقلیں درحقیقت عربوں کی عقول کی گروی ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ قدیم زمانے میں ہماری عقلوں نے ہم سے کتنی دوری اختیار کر رکھی تھی۔ بلکہ درحقیقت اس وقت ہمارے پاس

---

[1] تاریخ عرب جلد ا صفحہ ۶۷۳ [2] (MAKING OF HUMANITY)

عقل ہی نہیں تھی۔

ہم جس کو عقل کہتے ہیں وہ آزمائش و مشاہدہ و تجربات کی جدید روش کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور اس منزل تک پہونچ گئی ہے جس کا وجود یونان میں بھی نہ تھا۔ لیکن یہ فعالِ رُوح، یہ علمی روش یورپی دنیا کے لئے عربوں کا تحفہ ہے۔

اب یہاں پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم جو ایک درخشاں اور باعظمت تمدن کے وارث ہیں آج کیوں اس طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ کیا ہو گیا کہ دنیا کی رہبری ہمارے ہاتھوں سے جاتی رہی۔ ہمارا تمدن، ہمارے علوم، ہماری سیاسی قوتیں سب ضعیف ہو گئیں، ہماری رفتارِ ترقی رک گئی، ہم نے اپنی کرسی مغربیوں کے حوالے کر دی۔ آج ہم علوم اور مصنوعات میں ان کے دست نگر ہو گئے؟ کیا بات ہو گئی کہ مسلمان اپنی تمام سابقہ روایات کے باوجود ـــــ جو مشرق و مغرب میں مشہور تھی ـــ اس طرح سرنگوں ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی ترقی خالی ڈھول کی صدا تو تھی نہیں! بلکہ اسلامی تربیت نے دنیا میں جو انقلاب برپا کیا یعنی ایک ایسے نظام کو بدل دیا جو دنیا کے تمام اجتماعی نظاموں سے الگ تھلگ تھا۔ جس نظام کی پوری طاقت آپسی نفاق و اختلاف و کشمکش کے نذر ہو جایا کرتی تھی اس کو اسلام نے غیر معمولی عجلت کے ساتھ متحد و باعظمت بنا دیا اور تھوڑی ہی مدت میں وہ لوگ ـــ عرب ـــــ بڑی بڑی قوموں کے فرماں روا ہو گئے اور دنیا کی عظیم سلطنتیں ان کے قدم چومنے لگیں۔

ہر مذہب اپنے بقاء و ترقی میں کچھ بنیادی و محکم اصول اور آداب و اخلاق نیز کامل نظام کا محتاج ہوا کرتا ہے۔ یہ چیزیں اسلام کے پاس تھیں اور یہی اسلام کی قوّت تھی ورنہ اسلام کے پاس نہ توپ کے گولے تھے نہ ٹینک، بلکہ اسلام نے افکار کی

تقویت شروع کی، اور معاشرے کے جسم میں عدالت، الفت، برادری کی روح پھونک دی۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب آسمانی تعلیمات کے پابند رہے ترقی کرتے رہے لیکن جب بھی انھوں نے اس سے علیٰحدگی اختیار کی تو زبوں حالی اور بدبختی کے شکار ہو گئے۔ جس وقت ایک شکوہ مند تمدن کے مالک تھے اس وقت یقیناً روحِ اسلام سے نزدیک تر تھے لیکن جب اسلام کی شخصی و اجتماعی زندگی بدلی تو تمدن اسلامی کا خورشید فروزاں بھی نشیب میں ڈوب گیا۔ علم و فکر، مادہ و رُوح کے درمیان توازن ختم ہو گیا۔ روحِ عمل و جہادِ اسلامی کا جھنڈا مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ مغربی اقوام نے ان چیزوں کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور ترقی کرنے لگیں یہاں تک کہ ان کا تمدّن، ان کے افکار، علوم ساری دنیا پر چھا گئے۔ حالانکہ ان کی مذہبی کتابوں میں دینی دستورات میں ان چیزوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

مسلمانوں کی اخلاقی حالت بھی گرتی گئی۔ خلوص، صحتِ عمل، صداقت اور ساری اخلاقی بلندیاں رفتہ رفتہ کر کے رخصت ہونے لگیں۔ مسلمان جب ان سرحدوں سے گزرتے تھے تو اسلام کو رخصت کرتے جاتے تھے اور گمراہی کی طرف پیش قدمی کرتے جاتے تھے یعنی آسمانی دستور کی مخالفت کرتے رہے اور دنیا میں ذلیل ہوتے رہے۔

اگر مسلمان واقعی اسلام سے دور نہ ہو جاتے تو ان کے متحد معاشرے میں اتنا گہرا شگاف نہ پڑتا، بلکہ وہ ساری دنیا کو فتح کر لیتے اور آج چار دانگ عالم میں اسلام کے علاوہ کوئی مذہب نہ ہوتا۔

ناپلیون کے ہمراہیوں میں "سینٹ ہلن" مین "لاکاس" بھی تھا۔ یہ شخص یعنی لاکاس کہتا ہے جب مصر میں ناپلیون زندگی بسر کرتا تھا تو بارہا کہا کرتا تھا کہ مجھے اسلام پسند ہے اور اس پر تعجب کرتا تھا کہ پیغمبرِ اسلام اور دیگر سلاطینِ اسلامی کس طرح اجنبی ملکوں کو فتح کر لیتے تھے اور ان کی سرحدوں پر قابض ہو جاتے تھے؟ اسی زمانے میں وہ کہتا تھا ایک دن میں اسلام قبول کر لوں گا

آج اسلام بھی ایک طور سے اجتماعی نظام کے میدان سے، سیاست کے میدان سے، اسلامی حکومتوں سے، مسلمانوں کی زندگی سے دُور ہو چکا ہے۔

بنیادی طور پر اسلامی معاشرہ آج کے معاشرے سے بالکل الگ ہے کیونکہ جو بھی معاشرہ ایسے نظام و قوانین و دستورات کے تابع ہو جو غیر اسلامی ہیں وہ بنیادی طور پر اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔

مختصراً آج کا اسلامی معاشرہ نہ تو افکارِ اسلامی کا حامل ہے نہ اخلاقِ اسلامی کا۔ آج کے تمدن کا کوئی شعبہ اسلامی اصول پر نہیں بنایا گیا اور اب اسلام اور عمل میں دُور کا بھی رشتہ باقی نہیں ہے۔ اس لئے اس زبوں حالی، بدبختی کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔ اسلام ہرگز نہیں ہے۔

آج کے مسلمان اگر دنیا کے انقلاب میں مؤثر طور سے شریک ہونا چاہیں تو اُن کو اوضاعِ عالم کو درک کرنا ہوگا، اور اپنی قدر و قیمت دینے سے منوانی ہوگی۔ اور اپنی پسماندگی اور اصطلاحات عمومی کے لئے رسالتِ روحی و رسالتِ مادی کے شروط پر عمل کرنا ہوگا۔ یعنی جب تک مسلمان تمدنِ اسلامی کے شیریں چشمے سے سیراب نہ ہوں گے اور حقیقی اسلامی تعلیمات سے فائدہ نہ اٹھائیں گے اپنی عظمتِ دیرینہ کو واپس نہیں لے سکتے۔ کاروانِ بشریت کے ہمیشہ پیچھے پیچھے رہیں گے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اصلی اسلام ــــ جو دنیا و آخرت کے فلاح و بہبود پر مشتمل ہے ــــ کی طرف پلٹ آئیں۔ اور اپنے افکار کو اسلامی فکروں میں ڈھال لیں اور اپنے اور خدا کے مابین کئے ہوئے عہد و پیمان کا احترام کریں، یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔

———x———(ختم)———x———

الکحل اور اسلام

اسلام کی منتظمہ پوری دنیا کے معاشرے کا انتظام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جو انسانی سعادت کی گارنٹی لیتی ہے۔ اسلامی دعوت عقل و وجدان کی بنیادوں پر استوار کی گئی ہے۔ قرآن کی بہت سی آیتیں اعتقادی و عملی معارف کو بہت ہی خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں۔ اور معقول دلیلوں سے اپنے مقاصد کو فطرتِ انسانی پر پیش کرتی ہیں۔ درحقیقت اسلام آدمی کی قوتِ مدرکہ کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے۔

اسلام کی خواہش ہے کہ وہ انسان ـــــ جو قدرت کا عظیم شاہکار ہے اور جو اپنی عقل و خرد ہی کے ذریعے حیوان کی صف سے جدا ہوا ہے ـــــ اپنی فطری ادراک و شعور کے ذریعے اپنے اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جس کے لئے اُسے خلق کیا گیا ہے اور عقل کے سپردگی میں دے دیا گیا ہے ـــــ ترقی کرے۔

اسلام نے شخصی و اجتماعی زندگی کے امور کا انتظام عقل کے سپرد کیا ہے اور عقل کو اتنا عظیم عطیۂ پروردگار قرار دیا ہے کہ اس کو رسولِ باطنی قرار دیا ہے اور ہر اس چیز سے ـــــ جو تلاشِ عقل کو ناکارہ بنائے اور خدا کی اس فطری عطیہ مختل کردے شدت کے ساتھ روکا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک لحظہ کے لئے بھی عقل کو معطل نہیں ہونے دیا۔

الکحل ملے ہوئے جملہ مشروبات ڈائریکٹ عقل کو متاثر کرتے ہیں اور معاشرہ

بشری میں روحانی و اخلاقی بدبختی کا سبب بنتے ہیں۔ اس لئے اسلام نے اس سے ممانعت کی ہے۔ بھلا آدمی کے لئے اس سے بڑھ کر افسوس ناک حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ملیونوں لیٹر مشروبات الکحل کے ذریعے پاک و صحیح ادراک و تعقل کو برباد کر دیا جائے، اور ناموسِ تکامل جہاں کے راستے سے انحراف پیدا کیا جائے۔ کسی بھی ایسے معاشرے کی عمومی سعادت و خوش بختی کی امید نہیں کرنی چاہیے جو اپنے عقل و ادراک کو الکحل استعمال کر کے برباد کر دے۔

مصلحت بیں بانیٔ اسلام نے نشہ آور چیزوں کے استعمال پر بہت سختی سے پابندی عائد کی ہے، حد یہ ہے کہ ایک قطرے کا استعمال بھی ممنوع ہے۔ اسلام نے شراب خواری ایک ایسے معاشرے میں حرام قرار دیا جو پورے کا پورا شراب خوار تھا۔ اور یہ بری عادت اس معاشرے میں مکمل طرح سے موجود تھی۔ ذرا سوچیے تو چودہ سو سال قبل جہاں جہالت و فساد نے لوگوں میں اپنے پنجے گڑ دیے ہوں، بدبختی، خود خواہی، شرارت، تباہی لوگوں میں حکمرانی کرتی ہو وہاں پر ایک الٰہی نمائندہ اپنے ایمان و تقوی کے بھروسہ پر بشری سعادت کو مضبوط کر دے اور اپنے پُر مغز و عمیق دستورات معاشرہ کے شاہراہِ حیات کے سامنے پیش کر دے۔ اس عمومی عادت کو ترک کرنا اور شراب کی حرمت کا حکم دینا اسلام کا نہایت ہی حیرت انگیز حکم ہے۔

البتہ اس پلید عادت کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے اسلام نے مدارات کا راستہ اختیار کیا اور پہلی مرتبہ صرف شخصی و اجتماعی مقاصد کے لئے مُضر بتا کر اس کو بنام "اسم" پہچنوایا[1]۔ لیکن آخری مرتبہ بہت صاف اور واضح لہجے میں اس کے مفاسد و نقصانات کو گوش زد کرایا، اور قطعی حرام قرار دے دیا کہ لوگو! شراب تمھارے درمیان میں دشمنی اور کینہ پیدا کرتی ہے اور ان دستورات کو بے بند و بار اور بے اعتنا بنا دیتی ہے۔

---

[1] سورۂ اعراف آیت ۳۳

جن کی پابندی ہی تمہارے لئے نیک بختی و سعادت ہے[1]

جس وقت حرمتِ شراب کا حکم آیا ہے کچھ لوگ میگساری میں مشغول تھے لیکن حکم سنتے ہی سارے جام و مینا توڑ ڈالے اور خم کے خم شراب گلیوں ہیں، کوچوں میں بہادی انس بن مالک کہتے ہیں جب شراب کی ممانعت کا حکم آیا تو اس وقت ہم لوگ ابی طلحہ کے گھر شراب خواری میں مشغول تھے اتنے میں رسولِ خدا کے منادی نے اعلان کیا مسلمانو! آگاہ ہوجاؤ شراب حرام ہوگئی، شراب کو کوچے میں بہادو۔ ابوطلحہ نے مجھ سے تقاضہ کیا کہ تم بھی شراب پھینک دو۔ چنانچہ میں نے بھی پھینک دی بعضوں نے تو شراب کے برتنوں کو بھی کوچوں میں توڑ ڈالا۔ اور بعضوں نے پانی سے پاک کرلیا۔ مدینہ کی گلیوں میں اتنی شراب بہائی گئی تھی کہ مدت تک یہ عالم تھا جب بارش ہوتی تھی تو اس کی بُو اور اس کا رنگ زمین پر ظاہر ہوجاتا تھا۔

یہ حکم مسلمانوں میں اتنا اثر کر گیا کہ جب بھی کوئی ملک فتح کیا جاتا تھا تو کچھ ہی مدت کے اندر شراب خواری ختم کردی جاتی تھی۔ اس زمانے میں بھی جبکہ مسلمان مفاسد اور تباہ کاریوں کے مختلف اقسام میں مبتلا ہیں جو شہری زندگی کی دَین ہے لیکن اس کے باوجود بھی ملیونوں مسلمان دنیا کے گوشے، کنارے میں ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک شراب نہیں پی بلکہ ان کے ذہن میں کبھی شراب پینے کا تصور تک نہیں پیدا ہوا۔

بشری قانون کے نقائص میں ایک بات یہ بھی ہے کہ انسانی تلوّن مزاجی کا اثر قانون پر بھی پڑتا ہے اور قانون کے تلوّن کی وجہ سے بشری زندگی کبھی معرض دگرگونی میں پڑجاتی ہے۔ دو قابل توجہ تجربوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) امریکہ (ایک زمانے میں) چاہتا تھا کہ قانون کے بَل بُوتے پر نشہ آور چیزوں کو

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۹۱

حرام قرار دے اور جبر و زبردستی سے لوگوں کو اس موذی عادت کے چھوڑنے پر مجبور کردے کیونکہ یہ عادت ـــــ شراب خواری ـــــ بدبختی و تباہی کا سرچشمہ ہے۔ اور اس کے ترک سے معاشرے کے اخلاق و رفتار میں سُدھار پیدا کیا جاسکتا ہے۔

(۲) دوسرا تجربہ صدر اسلام میں شراب کی حرمت کا حکم آنے کے بعد ہوا اب ان دونوں واقعات پر غور کر کے نتیجہ حاصل کیجئے۔

امریکہ کے اساسی[1] قانون میں اٹھارواں اصلاحی قانون شامل کئے جانے سے پہلے معاشرے کے خیر خواہ لوگوں کی طرف سے بڑے وسیع پیمانے پر شراب خواری کے نقصانات بیان کئے گئے اور پبلک کو شراب خواری کے چھوڑنے کی تبلیغ کی گئی۔ یہاں تک کہ دس سال کے اندر اندر کتابیں، رسالے، پمفلٹ چھاپ کر، سینماؤں میں شرابیوں کی نکبت بار زندگی کو فلما کر، تقدیر کے ذریعے شراب خواری کے روحانی، جسمانی، اخلاقی، اقتصادی مفاسد کو اجاگر کیا گیا اور ناقابلِ برداشت زحمتوں کے بعد ملّتِ امریکہ کو ترکِ شراب خواری پر آمادہ کیا گیا۔ ابتداء سے لے کر اس مقصد کو حاصل کرنے تک تقریباً ۶۵ ملیون ڈالر کا خرچ آیا۔ اور آخر کار امریکہ کی اکثریت کی خواہش پر مجلس قانون ساز کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ شراب خواری کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے اور پھر بڑی تحقیق اور نفع و نقصان پر تبصرے کے بعد مجلس سُنائے امریکہ کی کانفرنس نے یہ قانون پاس کر دیا۔ لیکن ابھی یہ قانون عملی طور پر نافذ نہیں ہونے پایا تھا کہ عادی شرابیوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی اور اپنے سابقہ خیالات سے بدل گئے۔ نتیجتاً چوری چھپے شراب کی دوکانیں کھل گئیں اور باقاعدہ شراب کی خرید و فروخت شروع ہوگئی۔ اور یہ ڈھکی چھپی دوکانیں پہلے سے کئی گنا بڑھ گئیں۔ شراب خواری ممنوع ہونے سے پہلے چار سو کارخانے شراب بنانے کے تھے، لیکن شراب

---

[1] اٹھارواں اصلاحی قانون کا مطلب یہ ہے کہ شراب بنانا، بیچنا، نشہ آور چیزوں کا ملک کے اندر لانا، یا ملک سے باہر بھیجنا وغیرہ سب ممنوع قرار دے دیا تھا۔

خواری کے ممنوع ہونے کے سات سال بعد اسّی ہزار شراب سازی کی دوکانیں کھل گئیں اور پھر رفتہ رفتہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان دوکانوں میں آنے جانے لگے اور شراب بیچنے والے گروہ در گروہ خریدار بنانے کے لئے گھروں، تفریح گاہوں، مدرسوں، مسافر خانوں میں آنے جانے لگے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ شہر سے نکل کر دیہاتوں تک پہونچ گیا اور جرائم کی تعداد روز افزوں ہونے لگی۔ امریکائی عدالتوں کے بیان کئے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق شراب خواری کے ممنوع ہونے کے تیرہ سال کے اندر اندر دو سو آدمی قتل کئے گئے۔ نیم ملیون قیدی بنائے گئے، اور تقریباً چار سو ملیوں لیرہ برباد ہوا۔ قانون شکنی کی وجہ سے ڈیڑھ ملیوں لیرہ سے زائد لوگوں سے جرمانہ وصول کیا گیا۔

بچوں میں بھی جرائم کی تعداد بڑھ گئی۔ حد یہ ہوگئی کہ عدالتوں نے اعلان کیا کہ ہماری ملکی تاریخ میں کبھی بھی اتنے بچے مستی کے عالم میں نہیں پکڑے جتنے اب پکڑے جارہے ہیں ذمہ داروں کے بیان کے مطابق ۱۹۲۰ء سے آٹھ سال کے اندر شراب خواروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ تقریباً ـــــ شراب حرام ہونے سے ـــــ پہلے کے مقابلے میں تین گنا بڑھ گئی۔ اور کثرت شراب نوشی کی وجہ سے موتوں اور بیماریوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا ۱۹۱۸ء میں شراب ممنوع ہونے سے نیویارک میں الکحل سے بیمار ہونے والوں کی تعداد ۳۷۴۱ اور مرنے والوں کی تعداد ۲۵۲ تھی، لیکن شراب ممنوع ہونے کے بعد ۱۹۲۷ء میں الکحل سے بیمار ہونے والوں کی تعداد گیارہ ہزار سے زیادہ اور مرنے والوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار تک پہنچ گئی۔

مختصر یہ کہ امریکہ نے اس سلسلے میں جو جانی اور مالی نقصان برداشت کیا وہ تو برداشت ہی کیا لیکن مجبور ہو کر اس قانون ـــــ ممنوعیتِ شراب ـــــ کو واپس لینا پڑا۔ اور چودہ سال کے بعد حرمتِ شراب کی وجہ سے جو تکلیفیں لوگوں نے اٹھائی تھیں ان سے آزاد ہوئے اور ان کو آسودگی ملی۔

ایک زمانے میں انگلستان کے اندر بھی ذمہ داروں نے چاہا تھا کہ ایسا ہی قانون

نافذ کریں لیکن لوگوں نے سیاہ جھنڈیوں سے، ہڑتالیوں سے اس کا استقبال کیا مجبوراً حکومت نے ایسا قانون بنانے سے گریز اختیار کر لیا۔

یہ اختلافات صرف اس لئے ہیں کہ جہاں معاشرے میں خیر و مصلحت کے عناصر ہیں وہیں خواہشات و جذبات بھی موجود ہیں ـــــ اب یہ بات ثابت ہو گئی کہ لوگوں کی خواہشات کا اثر قانون پر پڑتا ہے کیونکہ قانون بھی تو لوگ ہی بناتے ہیں۔

مترجم: لیکن اسلامی قانون میں صرف معاشرے کی سلامتی و سعادت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور لوگوں کی خواہشات سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا۔ اس لئے اس کے قوانین بھی تغیر پذیر یا لوگوں کی خواہشات کے تابع نہیں ہیں۔

علمی ترقی جتنی بڑھتی جائے گی تجربات، تحقیقات کا دامن جتنا وسیع ہوتا جائے گا۔ الکحل کے نقصانات اتنے ہی واضح و روشن ہوتے جائیں گے۔ قتل، بے عفتی، خاندانی جھگڑے معاشرتی نقصانات سے قطع نظر کرتے ہوئے طبّی نقطۂ نظر سے بھی الکحل کے پیکر بشری پر نقصانات ناقابلِ انکار ہیں۔

ادھر دو ایک صدی سے ہزاروں رسالے مختلف زبانوں میں الکحل کے نقصانات ظاہر کرنے کے لئے شائع کئے گئے ہیں اور قابل توجہ اقدامات بھی کئے گئے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی اسلام کے صرف ایک حکمِ حرمت سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اس کے مقابلے میں صدیوں کے اقدامات ہیچ ہیں۔ حد یہ ہے کہ یہ لوگ ایک شہر کے اندر بھی شراب بندی نافذ نہ کر سکے تمام ملک میں کیا کر سکیں گے؟

لیکن صدر اسلام میں نہ تو کوئی مجلس قانون ساز تھی، نہ شراب بندی کی تبلیغ کی گئی اور نہ اسلام نے قانون شراب بندی نافذ کرنے کے لئے ایک دینار خرچ کیا، یہ سب کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ صرف رسولِ خداؐ نے مسلمانوں کے درمیان اعلان کیا کہ: لوگو! خدا نے تمھارے اوپر شراب حرام قرار دے دی ہے! اور یہ حکم بھی ایسے وقت آیا جب عربوں میں شراب سے زیادہ کوئی چیز

مرغوب نہیں تھی۔ چند یہودیوں کو چھوڑ کر پورا معاشرہ مے نوش تھا اور لوگ اس مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ رسولِ خداؐ کا ابھی اعلان ختم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ لوگوں نے شراب چھوڑ دی اور ہمیشہ ہمیش کے لئے اس لعنتی مرض کو وداع کر دیا۔

قانونِ الٰہی کو قانونِ بشری پر ایک اہم فوقیت یہ بھی ہے کہ بشری مقننہ انسانی احساسات و عواطف کا کوئی لحاظ نہیں کرتی اور قانون پر عمل کرنے کے لئے لوگوں کو کسی راستے کی رہنمائی نہیں کرتی۔ قانون شکنی اور اس کے حدود سے تجاوز نہ کرنا صرف انتظامیہ کے ڈر سے ہے اور انتظامیہ کے سزا سے بچنے کی خاطر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جزا دینے والا بھی انسان ہے۔ برخلاف الٰہی قوانین کے کہ اس کا تمام تر دار و مدار انسانی عواطف پر ہے اور پہلی ہی مرتبہ انسانی عالی صفات کے ذریعے لوگوں کو قوانین پر عمل کرنے کے لئے اُبھارتا ہے اور انسان کے تمام اندرونی قوتوں سے اور احساسات کے حدود و قوانین پر عمل کے لئے استفادہ کرتا ہے۔

لوگ قانون سے اور اس کی جزا سے ڈرتے ضرور ہیں۔ مگر کچھ ایسے چوہے دان بھی بنا لیتے ہیں جہاں تک قانون کی رسائی ہی نہیں ہو پاتی۔ انسان فطری طور پر لذتوں کا دلدادہ ہے اس لئے محض حکومت کے ڈر سے لذتوں سے اجتناب نہیں کر سکتا بلکہ اس کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ قانون کے پردے میں دل کی بھڑاس نکال لے۔

حکومت اخلاقی جرائم کی سزا عرفی قانون کے بل بوتے پر دے ہی نہیں سکتی کیونکہ حکومت کتنی ہی مضبوط ہو، نہ تمام جرائم پر نظر کر سکتی ہے اور نہ تمام مجرمین کو سزا دے سکتی ہے اور اسی لئے بہت سے جرائم کا اثبات کبھی ناممکن ہو جاتا ہے اور مجرم سزا سے بچ جاتے ہیں۔ اسی لئے جب تک لوگوں کے دلوں میں انتظامیہ کا خوف نہ ہو اور ان کے جملہ خواہشات و جذبات انتظامیہ کی نظروں میں ہر وقت نہ ہوں ہر اصلاحی قدم ناکامیاب ہو جائے گا۔

برخلاف اسلامی انتظامیہ کے، کہ اگر لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور خلّاقِ

کائنات ہی کو جزا و سزا کا مالک سمجھتے ہوں، ایسا خدا جس کے احکام زمین و آسمان میں نافذ ہیں اس سے ڈرتے ہوں تو اس سے کہاں بھاگ سکتے ہیں؟ اور اس سے چھُپ کر کہاں گناہ کر سکتے ہیں؟

اس لئے لوگوں کو بہت سے گناہوں سے بچانے کا طریقہ ارتباط بخدا کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ خدا پر ایمان لانے سے زندگی کی تصویر میں رنگ بھرتا ہے کیونکہ جب آدمی یہ عقیدہ رکھے گا کہ اس زندگی کے ختم ہو جانے سے ہر چیز کا خاتمہ نہیں ہو جاتا تو اس کے دل میں ایک خاص قسم کا سکون پیدا ہو جاتا ہے اور وہ زندگی کے ہر ہر شعبے میں اعتدال برتنے لگتا ہے۔

ان باتوں کے علاوہ بھی خدائی قانون انسان کے ہاتھوں میں ایک ثابت اور غیر متزلزل دستور العمل دیتا ہے جس میں کسی قسم کا تلون نہیں ہوتا اور جو ہمیشہ تغیّر و انقلاب کے طوفان سے کنارہ کش رہتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک چیز کل حرام رہی ہو اور آج بلا کسی وجہ کے جائز ہو جائے۔ کیونکہ الٰہی قوانین واقع بینی کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں۔ ان میں حق کے علاوہ کسی بھی چیز کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور جس طرح حق غیر متغیر ہے اسی طرح قانونِ الٰہی بھی غیر متغیّر چیز ہے۔ لوگوں کے خواہشات و جذبات سے اس میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔

آج کی متمدن دنیا اس بات پر نازاں ہے کہ اس نے انسان کی آزادی کو محفوظ کر دیا ہے۔ اور قانون میں ارادہ ملّت کی حکومت کو تسلیم کیا ہے ـــــ لیکن ذرا اس دعویٰ کا تحلیل و تجزیہ کیجئے تو خود پتہ چل جائے گا کہ ارادہ کی حکومت اور اکثریت کی آزادی خود ہی ارادہ کی محکومیت اور اقلیت کی آزادی کو سلب کرتی ہے۔ مثلاً ۵۱ فیصد لوگ کسی قانون کے حامی ہیں اور ۴۹ فیصد مخالف، تو اکثریت کی رائے کا اعتبار کرتے ہوئے اس قانون کو جاری و نافذ کر دیا جائے گا اور اقلیت کو مجبوراً اس قانون کو قبول کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا جبری حکم ہے جس کو اقلیت کسی بھی قیمت پر ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اب ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کیا اقلیت انسان نہیں ہے جس کو آزادیٔ رائے سے محروم کر دیا گیا؟ اس کے ارادے کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رکھی۔ کیا کچھ لوگوں کو آزادیٔ رائے سے محروم کر دینا خلافِ حقیقت نہیں ہے؟ کیا اکثریت کی رائے کو اقلیت پر ڈال دینا اسیریٔ فکر کی علامت نہیں ہے؟ کیا اس کے علاوہ کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے؟ بس مجھے کہنے دیجئے اس آزادی میں غلامی پوشیدہ ہے ——— اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس کے برخلاف لوگ الٰہی قوانین میں اپنے ہمجنسوں کی غلامی سے قطعاً محفوظ ہیں۔ وہاں اکثریت و اقلیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہاں تو صرف عمومی مصلحت کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے جس کا مقصد بشری معاشرے کی سعادت و نیک بختی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

ایک دین دار شخص کی نظر میں چونکہ واضعِ قانون صرف خدا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ الٰہی قوانین کی اطاعت و فرماں برداری تمام نوعِ بشر کے لئے مفید ہے۔ اس لئے وہ اپنے تمام اعمال میں اطاعتِ الٰہی کے لئے کوشاں رہتا ہے اور کسی ظاہری قوّت کے سر پر مسلّط ہوئے بغیر بھی وہ قانونِ الٰہی کی مخالفت نہیں کرتا۔

یہ بات تجربے سے ثابت ہو چکی ہے کہ بشری افکار کے سرچشمے سے فیض حاصل کر کے بننے والا قانون انسانی وجود کے اندر کبھی بھی اخلاقی علل کو اُبھار کر، نامطلوب شہوتوں سے انسان کو کبھی نہیں روک سکتا۔ دنیائے انسانیت علوم و فنون میں چاہے جتنی ترقی کر لے اور قوموں کی سطحِ افکار چاہے جتنی بلند ہو جائے پھر بھی وہ خواہشات کے چنگل سے نجات نہیں پا سکتی۔ شہوانی جکڑ بند سے آزادی، بُرائیوں سے اجتناب صرف ایمان باللہ کے سائے میں پروان چڑھ سکتی ہے۔ قرنوں پر پھیلا ہوا تجربہ اس

بات کو ثابت کرتا ہے کہ انسان یا تو خدائی ہدایت پر کاربند ہوگا اور یا پھر دریائے شہوت میں غوطہ خوری کرے گا ــــــ

اسلام کی ایک خوبی میکشی کی حرمت بھی ہے۔ کیونکہ فرزندانِ افریقہ اسی عادت کی بنا پر جنون سے قریب تر ہو گئے اور اہلِ یورپ کی عقلیں ان کے ہاتھوں سے اسی وجہ سے جاتی رہیں۔ افریقیوں کے لئے حرمتِ شراب ضروری ہے، اور یورپین کو ان کے کیفر کردار تک پہونچنا ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شراب شمالی حصّوں میں انسان کو بے وقوف و نافہم بنا دیتی ہے اور جنوبی حصّوں میں دیوانہ کر دیتی ہے[1]

والیٹیر (VOLTAIRE) کہتا ہے: محمدؐ کا دین ایک معقول و واقعی و پاک اور بشریت کا دوست دار ہے۔ معقول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جنونِ شرک میں کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ اور خدا کے لئے مثل کا قائل نہیں ہوا اور دُور از کار و متناقض اور خلافِ عقل باتوں پر اس کی بنیاد نہیں رکھی گئی۔

واقعی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جُوا، شراب، لہو و لعب کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ ان کے بدلے پنج وقتہ نماز واجب قرار دی گئی ہے۔

پاک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ بے حد و حساب عورتوں سے جنسی تعلقات، جیسا کہ ایشیائی حکّام کا طریقہ تھا ــــ سے روک کر رشتۂ ازدواج کو چار عورتوں میں محدُود کر دیا ہے۔

بشریت کا دوست دار ہونے کی دلیل یہ ہے کہ، اپنے ہمجنسوں کی مدد اور زکوٰۃ کو حج سے زیادہ واجب بتایا گیا ہے۔ یہ ساری چیزیں اسلام کی حقیقت کو ثابت کرتی ہیں[2]

---

[1] تفسیر طنطاوی جلد ۱ صفحہ ۱۹۶ [2] اسلام از نظر ولٹر۔

موسیو جولس لابوم (MOSIO JOLES LABOUM) کہتا ہے: عربوں نے شراب خواری کی انتہا کر دی تھی۔ جوا پر فخر کرتے تھے۔ مرد جتنی عورتوں کو چاہے رکھ سکتا تھا۔ اور جب چاہتا طلاق دے سکتا تھا۔ بیوہ عورتیں مرد کا ترکہ سمجھی جاتی تھیں اور اس کے بعد اس کے بیٹوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں اور بیٹے ان کو اپنی بیوی بنا لیتے تھے۔ اسلام نے ان چیزوں کو جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیا۔[1]

پروفیسر ایڈورڈ مونٹہ (EDWARD MONTA) لکھتا ہے، لڑکیوں کے قتل، نشہ آور چیزوں کے استعمال، جوا وغیرہ سے اسلام نے روک دیا، حالانکہ یہ چیزیں عربوں میں کثرت سے رائج تھیں اور اس روکنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمدؐ کو بشریت کا عظیم رہبر مان لیا گیا۔[2]

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی۔ [2] افکار و عقائد۔

اسلامی و نسلی امتیازات

اسلام کے افکار و عقائد کی بنیاد جس طرح توحید کے اساس پر رکھی گئی ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرے کی بنیاد میں بھی توحید ملحوظ ہے۔ اسلام کی نظر میں انسانیت ایک بہت بڑے معاشرے کا نام ہے اور افراد انسان اس کے اعضاء ہیں۔ ایک وسیع فکری تحول کی بنیاد پر انسانوں کے تمام اختلافات، پراگندگیاں، اس عظیم معاشرے سے ختم ہو جاتی ہیں اور سب کے سب محبّت و الفت کے اٹوٹ رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

چونکہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھنی چاہی ہے جو عالمگیر ہو، اس لئے جُدائی و امتیاز کے تمام سلسلوں کو ختم کر دیا ہے مثلاً زبان، نسل، فرہنگی اشتراک، آداب و رسوم میں اتحاد کی وجہ سے جو قومیں موجود ہو سکتی تھیں اسلام نے ان کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے اسلام کی نظر میں یہ چیزیں جدائی کی بنیاد اور معاشرے کی وحدت کے لئے بہت ہی مضر ہیں۔ اسلام کی نظر میں کسی شخص کو رنگ، نسب، نسل، زبان کی وجہ سے دوسرے پر کسی بھی قسم کی برتری حاصل نہیں ہے۔ اس کی نظر میں تو سب کی اصل مٹی ہے۔ مرد عورت، کالا گورا، فقیر امیر، متمدن وحشی انسانیت کے اصلی امتیازات میں باہم شریک ہیں ان کے درمیان میں پیدائشی وحدت موجود ہے اور سب کی بازگشت ایک ہی اصل کی طرف ہوتی ہے۔

اُس خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو جس نے تم سب کو ایک آدم سے پیدا کیا۔[1]

اسی لئے اسلام نے قومیت، محلی و ملی نیشنلیزم (NATIONALISM) کو کالعدم قرار

---

[1] سورۂ نساء، آیت ۱

دیا ہے۔ ہر قسم کی برتری، نسل پرستی، رنگ و زبان پر فخر و مباہات اور اس قسم کے دوسرے امتیازات کو بے بنیاد بتایا ہے ــــــ

رنگ، و زبان کے اختلاف کو قدرت کی نشانی قرار دیا ہے۔ اور لوگوں کو اس بات پر اُبھارا ہے کہ ذرا سوچو! خدا نے تمام انسانوں کو ایک اصل سے پیدا کر کے ان کے چہروں، رنگوں، زبانوں میں کسی قدر اختلاف رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے آسمان و زمین کی خلقت، تمھارے رنگ و زبان کا اختلاف ہے۔ عقل مندوں کے لئے اس میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں[1]۔

لوگ یک قوم و قبیلے سے ہیں ہم نے ان میں رسُولوں کو بھیجا تاکہ اچھے کاموں کے جزا کی بشارت دیں اور بُرے اعمال کے نتائج سے ڈرائیں[2]۔ اس آیت میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ اختلافات، یہ پراگندگی بشری معاشرے کی ابتدا میں موجود نہیں تھی۔ بلکہ وہ سب متحد اور آپس میں کامل تعاون رکھتے تھے۔

مولائے کائناتؑ نے مالک اشتر کو جو تاریخی فرمان بھیجا ہے اس میں فرماتے ہیں، ہاں اے مالک اپنے دل کو قوم و ملّت کے لئے رحم کا مرکز بناؤ، ان سے باکمال محبّت و عطوفت سے پیش آؤ، خبردار ان کے لئے ایسا حیوان درندہ نہ بن جاؤ جو اُن کے مال و جان کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ یا تو تمھارے دینی بھائی ہیں یا پھر تمھاری طرح کے انسان ہیں[3]۔ اس کلیّہ کی بناء پر ہر نسل کے افراد اپنی لسانی اور غیر لسانی اختلاف کے باوجود اسلامی معاشرے کے افراد شمار ہوں گے۔

اس کے علاوہ روحی و فکری وحدت، عقیدے و مقصد کی ہم آہنگی کے زیرِ سایہ لوگوں کا آپسی اتّحاد بھی استوار ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز مفید مطلب نہ ہوگی۔ اگر کسی معاشرے کا فکری محور و عقیدہ متحد نہ ہو، محبّت و الفت کے رشتے سُست

---

[1] سورہ روم آیت ۲۲ [2] سورہ بقر آیت ۲۱۳ [3] نہج البلاغہ۔

اور کمزور ہوں تو مادی منافع میں اختلاف کے وقت ان میں نفاق و کشمکش پیدا ہو جائیگی اس لئے ملتوں کے درمیان سب سے زیادہ مضبوط رابطہ مذہبی رشتہ ہوا کرتا ہے جو مختلف اقوام کے مختلف طبقات کو اچھی طرح مربوط رکھتا ہے۔

اسلام نے اسی ذریعے سے تمام افراد کو متحد کیا ہے اور افتراق و اختلاف کی زنجیر کاٹ دی ہے۔ وحدت و یگانگت کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لئے ایمانی معاشرے کے افراد کو بھائی بھائی قرار دیا ہے۔ اور بشر کے درمیان اخوت و برادری سے زیادہ کوئی مضبوط رشتہ اور نہیں ہے۔ باپ بیٹے کا رشتہ اگرچہ بھائی کے رشتے سے مضبوط ہے مگر باپ بیٹے میں کامل مساوات نہیں ہے۔ احترام و شخصیت کے لحاظ سے ان میں برابری مفقود ہے۔ یہ بات تو صرف برادری کے اندر ہے اور یہی وہ رشتہ ہے جو دو انسانی افراد میں ایک ہی سطح پر اور ایک ہی افقِ زندگی پر شدید دلبستگی اور کمال علاقہ مندی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن مسلمانوں کے درمیان محبت کے عالی ترین مرتبے کو قائم کرتے ہوئے ہر مسلمان کو ایک دوسرے کا بھائی کہتا ہے۔ اور اس تعبیر سے اسلامی معاشرے کے افراد میں لطیف ترین دوستی اور بہترین مساوات کی راہ نمائی کرتا ہے۔

یہ مذہبی برادری کوئی تشریفاتی عنوان نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مسلمان آپس میں وظائف اخوت کو برقرار رکھیں۔ یقیناً ہر شخص کے نزدیک اس کی محبوب ترین چیز اس کا عقیدہ ہوا کرتا ہے اور مسلمانوں کا وحدت روحی اور یگانگت عقیدے میں اتحاد حقیقی برادری کے اتحاد سے بھی زیادہ بلند ہے۔ اور یہی وجہ ہے جب دو آدمیوں کا مقصد مشترک ہو اور ان میں فکری وحدت ہو تو وہ حقیقی بھائی سے بھی زیادہ باہم قریب ہوتے ہیں، کیونکہ سب سے زیادہ

قربت دلوں کی قربت ہوا کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے، مومنین آپس میں ایک دُوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں میں صلح رکھو اور خدا کی نافرمانی سے بچو، تاکہ خدا تم پر رحم فرمائے [1]

رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں، باایمان معاشرے کے افراد مہر و محبّت کے لحاظ سے ایک بدن کی طرح ہیں۔ بدن کے کسی حِصّے میں جب کبھی کوئی درد پیدا ہوتا ہے تو سارے اعضاء اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان رنج و غم میں مبتلا ہو جائے تو معاشرے کے تمام افراد پر لازم ہے کہ اس کی مدد کریں اور اس کے غم میں شریک ہو جائیں [2]

---

[1] سورہ حجرات آیت ۱۰ [2] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۱۳۔

اسلام عدالت و آزادی کا دین ہے

ان ظالموں اور جابروں کے تسلّط سے آزادی کا نام اسلام ہے جو اپنے خودغرضی کے ماتحت انسانوں کو غلام بنانا چاہتے ہیں۔ جو لوگوں کی شرافت، آبرو، جان، مال سے کھیلنا چاہتے ہیں جو لوگوں کو اپنا زرخرید سمجھتے ہیں اور یہ سب اس لئے کرتے ہیں تاکہ لوگ اُن کی خواہشات کے سامنے سر جھکا دیں۔ یہ ظالم ڈکٹیٹری، سرمایہ داری کے ذریعے سے لوگوں کو غلام بنانا چاہتے ہیں اور اپنے ظلم و جبر کے ذریعے معاشرے کو حق و عدالت کے برخلاف قوانین کی پیروی پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے تمام اقسام قدرت کو خدا میں منحصر کر کے بندوں کو سرکشوں اور ظالموں کے غلامی سے نجات بخشی ہے، تاکہ وہ لوگ واقعی آزادی سے فائدہ مند ہو سکیں ایسی آزادی جو کسی ظالم نظام کے تحت نہ ہو۔

اسلام چاہتا ہے کہ لوگ اپنے اندر انسانی شرف کو محسوس کر سکیں اور یہ احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک معاشرے کے تمام افراد صرف ایک خدا کے سامنے سر نہ جھکائیں۔ کیونکہ اسی صورت میں یہ بات ممکن ہے کہ کوئی کسی کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا بلکہ ہر شخص کا حاکم ایک ہی ہے۔

اسلام تمام تر انسانی قدر و قیمت کا قائل ہے اس کا مقصد اصلی انسان کے فطری حقوق کی حفاظت ہے اور شخصی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں عدالت و برابری کی برقراری ہے۔ اسلامی معاشرے میں قانون نے تمام لوگوں کے برابری کی ذمہ داری

لی ہے اور قانون کے سامنے سب کی حیثیت ایک ہے۔

اگر اسلام نے قومیت، ملیّت، نسلی عنصر کا اعتبار کیا ہوتا تو کسی بھی قیمت پر ایسے درخشاں پیش رفت سے ہمکنار نہ ہو سکتا۔ ترقی کا یہی راز ہے کہ جس کی بناء پر ایک صدی سے بھی کم مدّت میں آدھی سے زیادہ دنیا پر اس نے حکومت قائم کر لی۔ اور ہر جگہ بہت ہی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا گیا اور مختلف اقوام و ملل نے اسلام قبول کیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہر زمانے میں کچھ بے بنیاد قسم کے عقائد و افکار نے ملتوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے اور انسان کے مختلف گروہوں میں جنگ کی آگ بھڑکا دی ہے اس قسم کی چیزوں میں سب سے زیادہ دخل نسلی برتری، ملّت پرستی، مذہبی احساسات کے غلط استعمال کو ہے۔

اسلام نے عواملِ اختلاف کو بنیاد نہ بنا کر عواملِ وحدت اور انسانی قدر و قیمت اور اشتراکِ ایمان کو اساس بنایا ہے مسلمان تو یہودی، مجوسی، نصرانی سب ہی سے کہتا ہے۔ آخر ہم آپس میں کیوں اختلاف کریں، آؤ سب مل کر ایک خدا کی پرستش کریں قرآن کہتا ہے، اے آسمانی کتابوں کے ماننے والو آؤ، ہمارے تمھارے درمیان میں جو بنیاد مشترک ہے اس پر عمل کریں اور وہ مشترک بنیاد یہ ہے کہ غیر خدا کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں، ہم میں سے کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں کو خدا کی جگہ پر صاحبِ اقتدار نہ مانیں[1]

آج جو قومیں وحدت، یگانگت، عدالت، حرّیت کی متمنّی ہیں جو استعمار کے چنگل سے اور نسلی امتیاز کے تباہ کاریوں سے نجات چاہتی ہیں وہ اپنے مقصد کو اسلامی نظام کے اندر ہی پا سکیں گی۔ کیونکہ اسلام ہی کے زیرِ سایہ ملتوں کا اتحاد، افرادِ انسانی کی مساوات متحقق ہو سکتی ہے۔ اور تمام لوگ ـــــ سیاہ، سفید، زرد، سرخ ـــــ انسان کے

---

[1] سورہ آل عمران۔ آیت ۶۴۔

دوش بدوش چل سکتے ہیں اور کامل آزادی سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

اسلام سی بھی شخص کی برتری کا دو بنیادوں پر قائل ہے۔ علم و عمل اور امتیاز کا دارومدار صرف آگیز گی روح اور فضیلتِ اخلاق پر ہے۔ اسلام نے شرافت و شخصیت کی بنیاد تقویٰ پر رکھی ہے اس کے علاوہ کوئی معیار فضیلت نہیں ہے۔ ارشاد خدا ہے: تم سب ہمارے نزدیک یکساں ہو تم میں سب سے بزرگ وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو[1]

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی الاعلان فرمادیا، عرب کو عجم پر اور سفید کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں ہے البتہ تقوی و روحانی فضیلت سبب ہے۔

مکہ فتح کرنے کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متکبر خود پسند زبان و نسل کو ملیہ افتخار سمجھنے والے عربوں کو مخاطب کر کے فرمایا: اس خدا کی تعریف ہے جس نے اسلام کے طفیل میں تمھارے جاہلیت کے آثار، فخر، تکبر، نخوت کو ختم کیا۔ یاد رکھو خدا کی بارگاہ میں تمام لوگ دو ہی قسم کے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو تقوائے الٰہی کی بنا پر بارگاہ ایزدی میں بزرگ ہے دوسرا گروہ وہ ہے جو گنہگاری کی وجہ سے اس کے سامنے سر جھکائے ہے۔

ایک شخص نے امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی، مولا! روئے زمین پر کوئی ایسا نہیں ہے جس کے آبا و اجداد آپ کے آبا و اجداد سے بالاتر اور شریف تر ہوں! امامؑ نے فرمایا ان کی بزرگی تقویٰ کی وجہ سے تھی ان کا مقصدِ حیات اطاعتِ پروردگار تھا۔ یہ شخص امامؑ کی نسلی برتری ثابت کرنا چاہتا تھا، آپ نے فوراً اس کے غلط طرزِ فکر کو ٹوک کر برتری کا معیار تقویٰ کو بتایا۔ ایک اور شخص نے حضرت سے کہا خدا کی قسم آپ دنیا میں سب سے بہتر ہیں، امامؑ نے فوراً کہا اے شخص قسم مت کھا، اگر کوئی

---

[1] سورہ حجرات۔ آیت ۱۳

مجھ سے زیادہ متقی ہے اور مجھ سے زیادہ خدا کی اطاعت کرتا ہے تو وہ مجھ سے بہتر ہے۔ خدا کی قسم ابھی یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ (وہ آیت یہ ہے) تم میں سب سے زیادہ محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے[1]

وہی تقوی جو عین حریت ہے نہ کہ محدودیت، کیونکہ محدودیت انسان کو موہبت اور سعادت سے محروم کر دیتی ہے لیکن تقویٰ روح کی زرہ ہے جو اس کو معنویت عطا کرتی ہے اور اس کو قید بندگی و ہوا و ہوس سے آزاد کرتی ہے اور شہوت و خشم، حرص و طمع کی زنجیروں کو اپنے گلے سے نکال دیتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں بھی تقویٰ بشر کے لئے آزادی بخش ہے جس کی گردن میں روپے اور مرتبے کی زنجیر پڑی ہو وہ اجتماعی لحاظ سے آزاد زندگی نہیں رکھتا۔

حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں۔

قیامت کے دن درستی و پاکیزگی کی کنجی اور ذخیرہ تقویٰ ہے یہی ــــ تقویٰ غلامی کی ہر قید و بند سے آزادی ہے۔ ہر بدبختی سے نجات و رہائی ہے تقویٰ سے انسان اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے، دشمن کے شر سے محفوظ رہتا ہے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو حاصل کر لیتا ہے[2]

تاریخ کے اس تاریک ترین دور میں جب نسلی و طبقاتی نزاع و کشمکش لوگوں میں پوری شدت کے ساتھ موجود تھی اور عقل و آزادی کے برخلاف وسیع پیمانے پر امتیازات موجود تھے، جب کمزور و تہی دست تمام شخصی و اجتماعی حقوق سے محروم تھے، قوم و ملت خونخوار حاکموں کے پنجوں میں تڑپتے تھے۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی بے جگری کے ساتھ ہر قوم کے ناجائز و غلط امتیازات کو لغو قرار دیا۔ اور تمام افراد میں برابری و کامل مساوات کا اعلان فرمایا۔ بندگی خدا

---

[1] تفسیر برہان۔ [2] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۷۔

کے زیرِ سایہ ہر شخص کو معقول آزادی بخشی، یہاں تک کہ معاشرے کے وہ کمزور طبقے جو اشراف حکام کے سامنے اپنے ارادے کو ظاہر کرنے پر قادر نہیں تھے اسلام کے مبنی بر انصاف قانون کے زیرِ سایہ طاقتور ہو گئے اور رؤسا و بزرگانِ قوم کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے لگے۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کے موجودہ مکاتیب فکر اجتماعِ بشری سے محروم، اور ستم رسیدہ لوگوں کا دفاع اسی طرح کر سکتے ہیں جس طرح اسلام نے کیا ہے وہ یقیناً اشتباہ میں مبتلا ہیں انھوں نے حقیقتِ اسلام کو درک ہی نہیں کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی عدالت کی جو کامل ترین صورت اسلام نے پیش کی ہے کوئی بھی سسٹم یا مکتب فکر نہیں پیش کر سکا۔ انتہا یہ ہے کہ کمیونسٹ جو دین و مذہب کے دشمن ہیں اسلام کے عظیم نہضت، موثر نقش، اساسی تعلیمات کا اعتراف کرتے ہیں۔

ایران کا ایک کمیونسٹ اخبار لکھتا ہے: ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں اسلام کا ظہور تاریخ کا وہ بہترین شاہکار ہے جس نے بشر کے چہرۂ تمدن میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس عظیم واقعہ ـــــ ظہورِ اسلام، جس کے فتوحات ایک صدی سے بھی کم مدت میں ایک طرف تو ساحلِ "لوآر" تک اور دوسری طرف ساحل "سندھ و جیحون" تک پہونچ گئے تھے ـــــ نے کتابِ زندگی میں ایک دلچسپ باب کا اضافہ کیا ہے۔

خود جزیرۃ العرب کے اندر یہودی، عیسائی متعدد مرکزِ تبلیغ تھے، اعرابِ مکہ اور بادیہ نشین قبائل بت پرست تھے، مکہ مرکزِ تجارت تھا، سود خواروں کا گڑھ تھا، قبائل سسٹم کا ملجا و مادی تھا، ملی تعصب کا منبع تھا، مختلف مذاہب کا مرکز تھا۔

اسلام ابتداءً چھوٹے موٹے تاجروں، کسانوں، غلاموں میں مقبول ہوا اور چونکہ سود خواروں کی مخالفت کرتا تھا اس لئے مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوا، اسلام ایک طرف سے تو تمام دوسرے مذاہب کے خصوصیات کا حامل ہے لیکن دوسری طرف سے سرزندہ و مادی

جنبوں کا بھی حامل ہے۔ رہبانیت سے فرار، نسلی و قبائلی مساوات، زن و مرد کے حقوق کی مساوات، غلاموں کی حمایت، غریبوں مجبوروں کی طرف داری، سادہ اصول، یہ چیزیں ایسی ہیں جس نے اسلام کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کر دیا۔

خونخوار و مغرور حاکموں کے سر پر اسلام سنگین ضرب بن کر آیا۔ دیہاتیوں، پیشہ ور شہریوں نے اس کو رحمت و نجات سمجھ کر دل سے لگایا۔ عظیم پیکر شاہی (مگر بوسیدہ) پر بہت ہی برمحل اسلام نے ضرب کاری لگائی اور اس کو نیست و نابود کر دیا۔ اور دو صدی کے اندر اندر چین سے لے کر اسپین تک اپنی عظیم حکومت قائم کی۔[1]

جس وقت اسلامی پیشواؤں اور سوشلسٹ ملکوں کے ذمہ داران حکومت کا مقابلہ کیا جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ ان حکومتوں میں اور اسلام میں زمین سے لے کر آسمان تک فرق ہے۔ اسلام طبقاتی نظام کے بالکل برخلاف ہے وہ حاکم و محکوم کو نہیں پہچانتا وہاں کامل مساوات ہے۔

حضرت علیؑ کو جب یہ خبر پہنچائی گئی کہ آپ کے نمائندہ "عثمان بن حنیف" کے اعزاز میں بصرے کے اندر ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، تو آپ کو یہ بات بہت ہی ناگوار گزری کہ حاکم اور شہر کے اونچے طبقے میں خصوصی روابط پیدا ہو جائیں جس کے سبب سے بڑے لوگوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا جائے۔ آپ نے فوراً اپنے گورنر کو ایک عتاب آمیز خط لکھا اور بہت زیادہ اس میں عثمان کو سرزنش کی۔[2]

نسلی امتیازات کا مقابلہ دنیا کے تمام مکاتیبِ فکر سے پہلے اسلام نے کیا۔ اگرچہ آج ساری دنیا میں سیاہ و سفید کے برابری اور قانونی مساوات کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے لیکن قول و فعل میں بہت فرق ہے کیونکہ بشری تاریخ کے تاریک ترین زمانے کی طرح آج بھی انھیں بنیادوں پر مختلف امتیازات موجود ہیں۔ کیا صرف برابری، مساوات، آزادی

---

[1] ماہنامہ مردم۔ شمارہ دوم۔ سال سوم [2] نہج البلاغہ۔

جیسے الفاظ بشریت کو کوئی پہنچا سکتے ہیں؟ جبکہ ان لفظوں کے پیچھے تلخ حقائق اور ناگوار حقائق پنہاں ہوں! کیا ان تمام موجودہ امتیازات کے باوجود آج کی متمدّن قوموں کو آزادی و حرّیت کا بنیان گزار کہا جاسکتا ہے؟

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد بشری آزادی و برابری کا منشور ساری دنیا میں مان لیا گیا اسی طرح حقوقِ بشر کو فرانس کے انقلاب کے بعد درست مانا گیا لیکن یہ سب صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ کیونکہ جس ملک میں ان کے خصوصی منافع پر چوٹ نہ پڑتی ہو وہاں تو اس پر عمل درآمد ہوتا ہے ورنہ مختلف بہانوں سے اس مسئلے کو گول کر دیا جاتا ہے۔

بہت سے متمدن ملکوں کے رہنے والوں کے لئے اب تک یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ رنگ و نسل کا اختلاف سببِ فضیلت و برتری نہیں ہوا کرتا۔ اسلام کی طویل ترین تاریخ میں "نسلی امتیاز" کا مسئلہ ہی نہیں اٹھا۔ آج کی طرح کل بھی تمام کالے لوگ بلاکسی احساسِ کمتری کے اسلامی اجتماعات، مذہبی جگہوں پر جمع ہوا کرتے تھے۔ اور معاشرے کے جملہ حقوق سے بہرہ مند ہوا کرتے تھے۔ بانیٔ اسلام نے چودہ سو سال پہلے کی تاریک دنیا میں عملی طور سے اس نابرابری کا خاتمہ کیا اور اسی مقصد کے خاطر اپنی پھوپھی زاد بہن "زینب" کا عقد اپنے غلام "زید بن حارثہ" سے کیا۔

ایک دن رسولِ خدا (ص) بہت ہی حسرت کے ساتھ "جویبر" ـــــ یہ ایک سیاہ رنگ کے فقیر تھے مگر بہت پرہیزگار لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے ـــــ کی طرف دیکھ کر فرمایا: جویبر کتنا اچھا ہوتا کہ تم شادی کر لیتے تاکہ شریک زندگی مل جاتی جو دنیا و آخرت میں تمہاری مدد کرتی! جویبر نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں بھلا کون عورت مجھ سے شادی پر تیار ہوگی؟ میں نہ حسب رکھتا ہوں نہ نسب، نہ مال و منال نہ حسن و جمال، پھر کوئی عورت میری بیوی بننا کیونکر گوارہ کرے گی؟ رسولِ خداؐ نے فرمایا: خداوند عالم نے زمانۂ جاہلیت کے بے سبب آقائیت کو لغو قرار دے دیا ہے

اور جو لوگ اسلام سے پہلے محروم و بے چارہ تھے ان کو آقائیت بخشی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ ذلیل تھے اسلام کی وجہ سے آج صاحبِ عزت ہیں۔ اسلام نے زمانۂ جاہلیت کے خود پسندی، نسلی و خاندانی تفاخر کے محلوں کو مسمار کر دیا ہے، آج تمام کالے گورے برابر ہیں، عرب عجم برابر ہیں سب کے سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب و پیارا شخص وہی ہے جو تقویٰ و پرہیزگاری میں سب سے بہتر ہو۔ اے جوئیبر! میں کسی کو تم سے برتر نہیں سمجھتا البتہ وہ شخص جس کا تقویٰ اور اطاعتِ خدا تم سے زیادہ ہو وہ تو تم سے بہتر ہے ورنہ نہیں۔

اس کے بعد فرمایا: تم قبیلۂ "بنی بیاضہ" کے شریف ترین شخص "زیاد بن لبید" کے پاس جا کر کہو کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دو! جس وقت جوئیبر پہنچے تو زیاد اپنے قبیلے والوں کے ساتھ گھر میں بیٹھے ہوئے تھے جوئیبر اجازت حاصل کر کے اندر داخل ہوئے اور سب کو سلام کر کے زیاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: رسولِ خداؐ نے مجھے تمھارے پاس ایک حاجت لے کر بھیجا ہے آپ کہئے تو سب کے سامنے عرض کر دوں، یا آپ چاہیں تو تنہائی میں عرض کروں؟ زیاد نے کہا تنہائی میں کیوں؟ نہیں نہیں تم سب کے سامنے کہو! کیونکہ رسولِ خداؐ کا پیغام میرے لئے باعثِ صد افتخار ہے۔

جوئیبر نے کہا! رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے آپ اپنی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دیں! زیاد نے کہا: ہم انصار اپنی لڑکیوں کی شادی اپنے سے کم مرتبے والے کے ساتھ نہیں کرتے واپس جاؤ اور رسولِ خداؐ کو میرا عذر بتا دو!

جوئیبر وہاں سے روانہ ہوئے کہ رسولِ خداؐ کو جواب بتا دیں! ادھر زیاد بہت پشیمان ہوئے اور ایک آدمی کو بھیج کر جوئیبر کو راستے ہی سے واپس بلا لیا اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کے ساتھ پیش آئے اور کہا آپ ٹھہریئے، میں پیغمبرِ اسلامؐ سے بات کر کے آتا ہوں۔ وہاں پہونچ کر کہنے لگے: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہو جائیں جوئیبر آپ کی

طرف سے ایک پیغام میرے پاس لائے تھے میں نے چاہا میں خود براہ راست حضورؐ سے بات کرلوں اور عرض کردوں کہ ہم انصار اپنے سے کمتر والے میں لڑکیوں کی شادی نہیں کیا کرتے! رسولِ اسلامؐ نے فرمایا! اے زیاد، جویبر مومن ہے۔ مومن کی ہمسر مومنہ ہوتی ہے مسلمان کی ہمسر مسلمہ ہوتی ہے، اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کردو، اس کو داماد بنانے میں ننگ و عار محسوس نہ کرو! زیاد وہاں سے گھر واپس آئے بیٹی سے پورا قصہ بیان کیا! لڑکی نے کہا: بابا، رسولؐ کے مشورے پر جویبر کو اپنا داماد بنا لیجئے! زیاد وہاں سے نکل کر باہر آئے، جویبر کا ہاتھ پکڑ کر قبیلے کے افراد کے پاس لائے اور ان کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی۔ مہر و جہیز کا انتظام بھی خود ہی کیا۔ اور زیاد کے حکم سے ایک گھر جس میں لوازمات زندگی موجود تھے جویبر کے حوالے کر دیا گیا۔ اور اس طرح ایک عظیم قبیلے کے بزرگ ترین شخص کی بیٹی ایک فقیر سیاہ رنگ کے ساتھ بیاہ دی گئی جس کے پاس ایمان کے سوا کوئی دولت نہ تھی۔!

ایک جگہ تین مختلف قوم کے آدمی جمع تھے سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی، اتنے میں وہاں قیس آیا اُس نے تینوں کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے کہا: اوس و خزرج تو خیر عرب تھے جنھوں نے اپنی خدمات و فداکاری کے ذریعے رسولِ خداؐ کی مدد کی! مگر یہ تین آدمی کہاں سے آٹپکے! کس نے اِن کو پیغمبرؐ کی مدد کے لیے بلایا تھا؟ جب رسولِ خداؐ کو اس کی خبر ہوئی تو بہت ناراض ہوئے لوگوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: خدا ایک ہے، تمھارا باپ ایک ہے، تمھارا دین ایک ہے جس عربیت پر تم فخر کر رہے ہو، نہ وہ تمھاری ماں کی طرف سے آئی ہے اور نہ باپ کی طرف سے! عربیت تو صرف تمھاری زبان ہے۔

رسولِ خداؐ قومیت کا سر کچلنے اور برابری کا قانون نافذ کرنے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ ایک دن ایک کالا آدمی پیغمبرؐ کے پاس آیا۔ ابوذر کو اس سے کچھ پہلے

ہی سے پرخاش تھی لہٰذا اس کو دیکھتے ہی کہنے لگے اے فرزندِ سیاہ! بس اتنا سننا تھا کہ رسولؐ کو غصّہ آگیا ابوذر سے فرمانے لگے کیا اس کی ماں کے کالے پن پر طنز کر رہے ہو؟ رسولِ خداؐ کو اس حالت میں دیکھ کر ابوذر کے حواس گم ہو گئے اور اپنی اس غلطی پر بہت پشیمان ہوئے۔ معاملے کو رفع دفع کرنے کے لئے اپنے چہرے کو زمین پر ملنے لگے۔ تب رسولِ اسلامؐ نے اس لغزش کو معاف فرمایا۔!

مشہور فرانسیسی دانش مند ڈاکٹر گستاوے لیبون (DR-GUSTAVE LEBON) لکھتا ہے: مسلمانوں میں مساوات و برابری حد درجے تھی۔ یورپ میں جس مساوات کا ذکر بڑی شدت سے کیا جاتا ہے اور مختلف لوگوں کے زبان زد ہے یہ صرف کتابوں کی حد تک ہے۔ خارج میں اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ مگر مسلمانوں میں عملی طور سے موجود تھی اور مشرقی معاشرت کا جزو تھی۔ طبقاتی اختلافات جن کی بنا پر یورپ میں انقلاب آیا مسلمانوں میں نہیں ہے پیغمبرِ اسلام کی نظر میں ہر مسلمان برابر ہے۔

دنیائے عرب میں ایک ایسی شخصیت پیدا ہوئی جس کے مختلف اقوام و قبائل کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ اور ان کو مخصوص قوانین و نظام کی مضبوط زنجیر میں باندھ دیا۔ کسی بھی مملکت کا رہنے والا مسلمان دوسروں کے لئے اجنبی نہیں ہے، مثلاً ایک چینی مسلمان کا حق اسلامی ملکوں میں اتنا ہی ہے جتنا کسی اسلامی ملک کے رہنے والے کا ہے۔ اگرچہ خود مسلمان نسل و ملیّت کے لحاظ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن مذہبی رشتے کی بنا پر ان کے اندر ایک خاص قسم کا معنوی ربط موجود ہے جس کی بنا پر وہ بہت آسانی سے ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔[1]

ایم یو لوپلاے (M.U.LEPLAV) لکھتا ہے: کاریگروں اور ستم دیدہ افراد کے اصلاح حال کے سلسلے جن مخطورات اور بُرے نتائج سے یورپ میں انتظامیہ دوچار ہوئی ہے۔ اسلامی

---

[1] تمدنِ اسلام و عرب صفحات ۱۴۶، ۵۱۶، ۵۱۷

معاشرے میں اس کا وجود نہیں ہے مسلمانوں کے یہاں بہترین انتظامیہ ہے جس کی بنا پر امیر فقیر کے درمیان صلح و آشتی قائم رہتی ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے جس قوم کے لئے یورپ کا دعویٰ ہے کہ ان کو تعلیم دے کر تربیت دینی چاہیئے واقعتاً خود یورپ کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔ اسلام میں ممتاز طبقے، موروثی منصب کا کوئی وجود نہیں ہے اسلام کا سیاسی نظام بہت ہی سادہ ہے اور اس نظام کے تحت جن لوگوں کا ادارہ کیا جاتا ہے اس میں شریف، رزیل، امیر فقیر، سیاہ سفید سب ہی برابر ہیں۔[۱]

گپ (GOB) اپنی کتاب میں لکھتا ہے: اسلام میں ابھی اتنی قدرت ہے کہ انسان کی بزرگ و عالی خدمت انجام دے۔ اصولی طور پر اسلام کے علاوہ کوئی بھی مذہب یا گروہ ایسا نہیں ہے جو انسان کے مختلف نسلوں کو کسی ایک ایسے مقصد پر جمع کر لے جس کی بنیاد مساوات پر ہو عظیم کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔ افریقہ ہندوستان و انڈونیشیا میں عظیم اسلامی معاشرہ اور چین میں بھی چھوٹا معاشرہ اور جاپان میں بہت ہی قلیل اسلامی معاشرہ خبر دیتا ہے کہ اسلام کے اندر ایسی طاقت ہے جو ان تمام مختلف عناصر و طبقات کے درمیان اثر انداز ہو سکے۔ اگر کبھی مشرق و مغرب کی بڑی حکومتیں اپنے اختلافات کو دور کرنے کے لئے کسی ترازو کا سہارا لیں تو وہ سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

مراسم حج میں بھی وحدت فکر و عمل کی بنیاد پر اسلامی تعلیم استوار کی گئی ہے ظاہری امتیازات کا وہاں کوئی شائبہ بھی نہیں ملتا۔ خانہ کعبہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کو اپنی عجیب و غریب قوتِ جاذبیہ کی بنا پر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور تمام لوگ صرف ایک قانون کی پیروی کرتے ہیں اور کسی سیاہ و سفید، سرخ و زرد امتیاز کے بغیر ایک صف میں پہلو بہ پہلو پُر شکوہ باعظمت مراسم کو بجالاتے ہیں۔

---

[۱] تمدنِ اسلام و عرب صفحہ ۵۱۵، ۵۱۶

فیلپ ہٹی (PHILIP HATTI) یونیورسٹی کا استاد لکھتا ہے: اسلام میں فریضۂ حج کی بنیاد تمام زمانوں میں ایک اہم اجتماع کا سبب ہے اور مسلمانوں میں سب سے بڑا اجتماع یہاں ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ زندگی میں کم از کم یک مرتبہ ـــــ بشرطِ استطاعت ـــــ اس فریضہ کو بجالائے۔ یہ عظیم اجتماع ـــــ جو دنیا بھر کے مسلمانوں کو چاروں طرف سے کھینچ لیتا ہے عجیب و غریب اثر رکھتا ہے جس کا انکار ناممکن ہے۔

اپنے خدا کے حضور میں زنگی، بربری، چینی، ایرانی، ہندی، ترکی، شامی، عربی، غنی، فقیر، بلند، پست سب ہی مل جل کر متحد ہو کر کلمۂ "شہادتین" پڑھتے ہیں۔ ساری دنیا میں غالباً ایک اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے خون، نسل، رنگ، قومیت کے حدود و فاصلوں کو ختم کر دیا ہے اور اسلامی معاشرے کی چار دیواری میں ایسا اتحاد اور یگانگت قائم کیا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے افرادِ بشر کے درمیان کفر و ایمان کے علاوہ کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ عظیم سالانہ اجتماع اس نظریہ کے ماتحت عظیم ترین خدمت انجام دیتا ہے۔ اور ملیونوں ایسے آدمیوں کے درمیان جو دنیا کے مختلف گوشوں میں زندگی بسر کرتے ہیں دین و مذہبِ الٰہی کو منتشر کرتا ہے [1]

افسوس کی بات ہے کہ بعض اسلامی ممالک میں مختلف نسلی و قومی و ملی تعصب پیدا ہو گیا ہے جو روحِ اسلام کے قطعاً منافی ہے۔

اسلام کا عدالتی نظام بھی ایسی برابری و مساوات پر مبنی ہے جس کی مثال آج کی متمدن دنیا میں نہیں مل سکتی۔ حالانکہ متمدن دنیا کا مقصد قانونی برابری ہے لیکن اب تک یہ بات حاصل نہیں ہو سکی۔

تاریخ کے تاریک ترین دور میں بھی افراد کے دلوں میں اسلام نے جو شعلۂ روشن

---

[1] اسلام از نظرگاہ دانش مندانِ غرب صفحہ ۲۳۹، ۲۴۰

کیا تھا وہ خاموش نہیں ہوسکا۔ ہارون رشید کو قاضی کے سامنے ایک واقعہ میں قسم کھانے کے لئے بلایا گیا تھا اور "فضل بن ربیع" نے ہارون کی موافقت میں گواہی دی تھی لیکن قاضی نے فضل کی گواہی کو رد کر دیا جس پر ہارون کو غصّہ آگیا کہ فضل کی شہادت اور گواہی کیوں نہیں مانی جارہی ہے۔ قاضی نے کہا میں نے فضل کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ وہ تم سے کہہ رہا تھا "میں آپ کا غلام ہوں" اگر فضل نے یہ بات سچ کہی تھی تو غلام کی گواہی آقا کے حق میں قبول نہیں ہوتی اور اگر اس نے جھوٹ کہا تھا تو جھوٹے کی گواہی اسلام میں قابل قبول نہیں ہے اس لئے میں نے فضل کی گواہی رد کر دی۔!

منصور خلیفہ عباسی نے حج کے لئے کچھ اونٹوں کو کرایہ پر لیا۔ لیکن مراسم حج تمام ہونے کے بعد مختلف حیلوں سے کرائے کو ٹالتا رہا اور نہ دیا آخر شتر بانوں نے قاضی مدینہ کے یہاں شکایت کی۔ قاضی نے فوراً خلیفہ کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور منصور شتر بانوں کے پہلو بہ پہلو عدالت میں آکر بیٹھا۔ قاضی کا فیصلہ منصور کے خلاف ہوا اسی وقت قاضی نے منصور سے کرایہ وصول کر کے شتر بانوں کے حوالے کیا۔

ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (DR. GUSTAVELEBON) لکھتا ہے: مسلمانوں کے عدالتی امور کا انتظام اور فیصلوں کی ترتیب بہت ہی مختصر و سادہ ہے۔ ایک شخص جو بادشاہ کی طرف سے حجی کے عہدے پر فائز ہوتا ہے، تمام دعوؤں کو شخصی طور پر خود ہی سنتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔ اور اس کا حکم قطعی ہوتا ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ عدالت میں حاضر ہو کر اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتے ہیں اور پھر اسی نشست میں قاضی کی طرف سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اور اسی وقت حکم صادر کر دیا جاتا ہے ـــــ مراکش میں مجھے ایک قاضی کی عدالت میں فیصلہ سننے کا اتفاق ہوا۔ قاضی دارالحکومت کے قریب ایک مکان میں مسندِ قضا پر بیٹھا تھا مکان چاروں طرف سے کھلا تھا۔ مدعی اور مدعا علیہ اپنے اپنے گواہوں کے ساتھ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے تھے اور اپنے مطلب کو سادہ و مختصر لفظوں میں بیان کر رہے تھے بعض

فیصلوں میں اگر کسی کو کوڑے لگانا کا حکم دیا گیا تھا تو ختم مجلس کے بعد وہیں کوڑے لگادیے جاتے تھے۔

اس طرح کی عدالت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ کا قیمتی وقت بچ جاتا ہے۔ اور عدالتی کارروائیوں کی پیچیدگی اور کمر توڑ مالی نقصان سے آدمی بچ جاتا ہے۔ اور سادگی کے باوجود بغیر تکلفات تمام احکام عدالتی طور پر نافذ ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کے افراد جب اس بات پر مطمئن ہوں کہ ان پر نافذ ہونے والا قانون الٰہی قانون ہے اور قاضی بھی لوگوں کی طرح برابر کا حقوق رکھتا ہے اور مسندِ قضا پر بیٹھنے والا قاضی ہر حکم خدائی قانون کے ماتحت دیتا ہے اپنی خواہشات سے نہیں دیتا تو ایسی صورت میں لوگوں کی تشویش ختم ہو جاتی ہے۔ اور معاشرہ کا ہر فرد آرام و سکون سے رہتا ہے۔

اگر دنیا عدالتی بے راہ روی اور اہرمنی چنگل سے نجات چاہتی ہے اور نسلی امتیازات سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کو اسلام کے سیاسی و انتظامی اصول و قوانین سے روشنی حاصل کرنی چاہیئے۔ لیکن آج کی دنیا میں مسائلِ قومیت، جغرافیائی منطقوں نسلی امتیاز کے اردگرد گھومتے ہیں اس لئے آج کی دنیا مشاکلِ امروزی کو حل کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اور نہ روئے زمین پر بسنے والی قوموں کو تمام اختلافات کے باوجود باہم مربوط کر سکتے ہیں اور نہ ان کو عدالت و مساوات کی بنیاد پر ایک نئی دنیا بنانے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف جدید نیشنلیزم (NEW NATIONALISM) کی دل فریب باتیں آج بہت سے ملکوں میں جڑ پکڑتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے وہ ممالک خود ہی تشتت و پراگندگی، نزاع و کشمکش کا شکار ہیں۔

لویس ایل سنایڈر (LOES. L. SNAEDER) امریکہ یونیورسٹی کا استاد رس اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے: جدید نیشنلیزم کے ضمن میں بے شمار تاریخی و طبیعی کشمکش پیدا ہو گئی اور اقتصادی و فرہنگی مناسبات جو ان میں مدت سے برقرار تھیں۔

وہ بھی ختم ہوگئیں۔ اور اس کا قہری نتیجہ بے امنی تھا جس کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر شخصی آزادی کی محدودیت، جنگی اسلحوں کی کثرت، بین المللی روابط کی قلت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

استقلال و حاکمیت جو بیسویں صدی کے آخری دہے میں زیادہ وسیع ہوا اور جس کو مقدس شمار کیا جاتا ہے لیکن اس میں یہ صلاحیت نہیں تھی جو شخصی آزادی کو وسعت دے سکے اور بین المللی روابط کے لئے اطمینان بخش ہو سکے[1]

صرف ایک چیز جو سب کو ایک پرچم کے نیچے لا سکتی ہے اور بشریت کی خدمت کر سکتی ہے وہ وہی اتحاد و یگانگت ہے جو ایمان باللہ اور روحانی و اخلاقی فضائل کے محور پر گھومتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کے اتحاد میں برادری کی روح بیدار ہوتی ہے اور دل و فکر باہم مربوط ہو جاتے ہیں نسلی امتیاز، قومی اختلاف، قسم کی چیزیں اس میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں۔!

اسلام انسانی معاشرے کو بہت اونچا کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے مسلمانوں میں اتحاد رہے اور ان کے دل پاک انسانی احساسات سے بھرپور رہیں۔ خدا نے دنیا اس لئے نہیں پیدا کی کہ انسانی قلوب میں شگاف و فاصلے باقی رہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تم کو قبیلوں میں اس لئے قرار دیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو[2]

اسلامی برادری ایک بہت ہی پر ارزش و واقعی مسئلہ ہے جس میں ہر قسم کی محبت و عطوفت کو ہونا چاہئے اگرچہ مغربی غلط افکار کے تاثر کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں روح مادیت و سود خوری وسیع ہو گئی ہے ——— لیکن پھر بھی بہت سے مسلمانوں کی زندگی ان خرافات سے خالی ہے۔ اسی لئے ایک مغربی سیاح کہتا ہے: شفقت، مہربانی، مہمان نوازی، غریب پروری، مشرقی لوگوں کا خاصہ ہے جس میں اسلامی تعلیمات نے اور زیادہ جلا بخشی ہے۔ ان میں سے تھوڑی سی بھی خصوصیت یورپی لوگوں میں نہیں پائی جاتی ———

---

[1] جہان در قرن بیستم صفحہ ۳۴، ۳۵ [2] سورہ حجرات، آیت ۱۳

جہادِ اسلامی کی علّت

مشرکوں کے خلاف اسلامی جہاد نہ تو کسی مادی غرض ـــــ مثلاً ملک گیری، وسعت طلبی ـــــ سے تھا اور نہ کسی استعماری مقصد ـــــ مثلاً منابع اقتصادی پر تسلّط ـــــ کے پیشِ نظر تھا۔ اس سلسلے میں اسلام کا نظریہ تمام مکاتیبِ فکر سے جُدا ہے۔

اسلام نے چونکہ ابتدا ہی سے بہت معقول طریقے سے مغروروں، ستم گروں کی مخالفت شروع کر دی تھی لہٰذا مخالف قوتیں متحد ہو کر اس نئے مذہب کی نشر و اشاعت میں روڑے اٹکانے لگیں اور اس سلسلے میں تمام امکانی صورتوں اور مادی قوّتوں کو اسلام کے خلاف استعمال کرنے لگیں۔ انتہا یہ ہے کہ اگر کوئی اس نئے مذہب کو قبول کر لیتا تھا تو مخالفین بڑی بے دردی کے ساتھ اس کو شکنجے میں کس دیتے تھے۔

قریش نے پیغمبرؐ اور اصحابِ پیغمبرؐ کا بائیکاٹ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال تک پیغمبرؐ کو اپنے مخصوصین کے ساتھ ایک پہاڑ میں زندگی بسر کرنی پڑی اور ناقابلِ بیان تکالیف برداشت کرنی پڑی، حد یہ ہے کہ کبھی کبھی تو یہ لوگ قوتِ لایموت سے بھی محروم رہ جاتے تھے۔

حد یہ ہے کہ جب نبیؐ اسلام نے مدینے میں قیام کیا اور مشرکوں کے مقابلے میں ایک مضبوط طاقت اکٹھا کر لی، تب بھی مشرکین آرام سے نہیں بیٹھنے دے رہے تھے۔ برابر مسلمانوں کو زدوکوب کرنا، اُن پر حملے کرنا انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تب کہیں جا کر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اب تم دفاع کرو کیونکہ تم میں اب دفاع کی صلاحیت

ہوگئی ہے۔

اسی لئے آپ دیکھیں گے رسولِ اسلام کے زیادہ تر غزوات دفاعی قسم کے تھے جب کوئی فوج مسلمانوں کی سرکوبی اور مدینے پر حملہ کرنے کے لئے چلتی تھی تب مسلمان اس کا مقابلہ کرتے تھے، جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ مخالفین پر تیار ہو کر حملے کرنے سے پہلے حملہ کر دیا جائے اور ان کو ابتداء ہی میں ناکارہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ان آیات میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً

راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کو دفاع کی اجازت دی جا رہی ہے کیونکہ یہ لوگ ستائے ہوئے ہیں اور خدا ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ (بیچارے) بلا کسی جرم کے اپنے شہروں سے نکالے گئے ہیں (ان کا جرم صرف یہ تھا کہ) یہ لوگ کہتے تھے ہمارا پروردگار خدا ہے [1]

جو لوگ تم سے جنگ کریں تم بھی راہِ خدا میں ان سے جنگ کرو لیکن حد سے ہرگز تجاوز نہ کرنا [2]

چونکہ اسلام تمام دنیائے بشریت کے لئے آیا ہے اور ہر بشر کو فائدہ پہونچانا چاہتا ہے۔ اس لئے اپنے کو جغرافیائی حدود میں رکھ کر کسی مخصوص جگہ میں محصور نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا تو نظریہ ہے کہ شرک و روحی آلودگی کے چنگل سے ساری دنیا کو نجات عطا کرے اور ساری کائنات میں کلمۂ حق کو پہنچائے۔

اصولاً ہر نظام جو پرانی رسموں اور مذاہب کو ختم کر کے ان کی جگہ نیا نظام جاری کرنا چاہتا ہے وہ بغیر جنگ و جدال کے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا کرتا۔ دنیا کا کوئی بھی انقلاب بغیر جنگ کے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا، اس کی شہادت تاریخ دے سکتی ہے۔ فرانس کا انقلاب ہو، یا ہندوستان کا، امریکہ کی نہضت استقلال کی

---

[1] سورہ حج۔ آیت ۳۰ ـــــ ۴۰ [2] سورہ بقر۔ آیت ۱۹۰۔

مانگ ہو، یا نظامِ کہنہ کو ختم کرنے کے لئے روسی انقلاب ہو، بہر حال جنگ کے بغیر کامیاب نہیں ہوا۔

اسی طرح چونکہ اسلام کا مقصد بدکرداری، افکارِ فاسدہ کو ختم کرنا تھا اس لئے خواہ مخواہ اس کو ان لوگوں سے جنگ کرنا تھا جو معاشرے کا استحصال کر رہے تھے، سُود خوری، قتل و غارت جیسے بداخلاقی امراض میں مبتلا تھے۔

کسی بھی مذہب ——— جو پوری دنیا کے لئے اصلاحی قانون لے کر آیا ہو، اس کی نشر و اشاعت صرف تحریر و تقریر کے ذریعے ناممکن ہے۔ تحریر و تقریر چاہے کتنی ہی مؤثر ہو مگر وہ ایسے معاشرے کو خلق نہیں کر سکتی جو جملہ برائیوں سے پاک ہو۔ کیونکہ کچھ لوگ اپنے عادات و رسوم کے اتنی سختی سے پابند ہوتے ہیں کہ کوئی منطقی دلیل ان کو ان کے عقیدے سے ہٹا ہی نہیں سکتی، ان کو صرف طاقت و قوّت کے زور سے ان خرافات سے روکا جا سکتا ہے۔ اور بس! اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سرکارِ دو عالمؐ نے فرمایا: نیکی اور قدرت و شمشیر کے زیرِ سایہ ہے اور کچھ لوگ بغیر طاقت حق بات نہیں مانا کرتے[1]

ذرا سوچئے اگر مخالف منظم طاقتیں، حق اور دینِ الٰہی کو پھلنے پھولنے سے روکنے لگیں تو کیا طاقت کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ہو سکتا ہے؟

جب لوگوں سے آزادیٔ فکر چھین لی گئی ہو، صحیح راستہ کا انتخاب ناممکن ہو گیا ہو، تب جنگ اور لشکر کے استعمال کی اجازت دی گئی۔ اور ظالم اور اسلام کی زبردست رکاوٹوں کو روکنے کے لئے اسلام نے بھی مسلح جنگ کا آغاز کیا۔ تاکہ معاشرے کی فکری گلوگیری ختم ہو سکے اور تمام مخرب و منفی عوامل ختم ہو سکیں اور انسانی معاشرہ با قصد و ارادہ فکری قضائے آزادی میں زندگی کا صحیح راستہ انتخاب کر سکے۔ کیونکہ اس کے علاوہ ہر قسم کی اصلاحی کوششوں کو ابتدا ہی سے ختم کر دیا جاتا تھا۔

---

[1] وسائل کتاب جہاد باب ۱۔

اسلام نے جس جنگ کا آغاز کیا ہے وہ درحقیقت بشریت کی جنگِ آزادی ہے عقل کی خرافات کی جکڑبند، اوہام سے آزادی کی جنگ ہے۔ یہ جنگ ہوا و ہوس سے دور، ظلم و ستم سے الگ، مادی امور سے بے نیاز جنگ ہے۔ روئے زمین پر فساد و تباہی کے خلاف جنگ ہے۔ اسلام بشری قدر و قیمت بڑھانے کے لئے اور بشریت کے لئے عدالت عزّت و سربلندی حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے۔ اسلام تمام لوگوں کے فائدے کے لئے جنگ کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ خیر عمومی کی راہ میں جتنی رکاوٹیں ہیں ان سب کو ختم کر دیا جائے۔ ایک آسمانی دستور کے تحت ہر مسلمان کا فریضہ ہو کہ وہ مظلوموں کی مدد کرے اور استعمار فکری کے قید سے بشریت کو آزاد کرائے تاکہ نومولود اسلامی معاشرے کی آزاد فضا میں سانس لے کر اپنی حفاظت کر سکے اور ہمیشہ رشد و ہدایت کے راستے پر گامزن رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ملاحظہ فرمایئے: تمھارے بچّے، مرد، عورتیں جو مکہ میں اسیرِ ظلم ہیں جو یہ کہتے ہیں پالنے والے ہم کو ظالموں سے نجات دے اور اپنی طرف سے مددگار بھیج دے۔ ان کی رہائی کے لئے تم راہ خدا میں کیوں نہیں جہاد کرتے ہو[1]

دنیا کی نظر میں جنگ کا مفہوم قتل کرنا، گرفتار کرنا، دشمن کو نابود کرنا، دشمن کے ساتھ بے رحمی، شقاوت کرنا وغیرہ ہے لیکن اسلام کے نزدیک جنگ کا مفہوم ہی الگ ہے۔ اسلام کہتا ہے: ظلم و ستم، تباہی و بربادی کو روکنا، حق و صداقت کو زندہ کرنا مختصراً گمراہی کا ختم کرنا اور فضیلت و عدالت کو نشر کرنے کا نام جنگ ہے۔

اسلام کی بنیادی دعوت یہ ہے کہ لوگ خدا کے تمام باطل معبودوں کی عبادت چھوڑ کر دیں اور لوگوں کے دل و دماغ پر خدائی قانون کے علاوہ کسی اور قانون کی حکومت نہ ہو، کیونکہ اس سے زیادہ انحرافی کیا ہو سکتی ہے کہ انسان لکڑی، پتھر، بے شعور موجود کے سامنے سربسجود ہو۔

---

[1] سورہ نساء۔ آیت ۷۵

اسلامی دستور ہی یہ ہے کہ جنگ سے پہلے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو، وعظ و نصیحت کرو، یہ دستور خود ہی مقصد کو واضح و روشن کر دیتا ہے۔

جب اسلامی فوجیں ایران فتح کر رہی تھیں تو ایرانی فوج کے سردار رستم فرخ زاد نے اسلامی فوج کے سردار سعد وقاص سے گفتگو کی اس وقت اسلامی نمائندہ جہاد کے مقصد کو اس طرح بیان کرتا ہے، ہمارے آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کو باطل خداؤں کی پرستش سے روکیں اور خدائے واحد کی عبادت اور محمد مصطفیٰؐ کی رسالت پر آمادہ کریں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ بندے بندوں کی بندگی چھوڑ دیں، خدا کی بندگی اختیار کریں، ہم چاہتے ہیں لوگ قیامت پر عقیدہ رکھیں، ظلم و جور ختم کر کے عدل و انصاف کا دور دورہ قائم کریں۔ تین دن تک مسلمانوں کے تین نمائندوں نے گفتگو کی اور ہر ایک نے ایک ہی بات کہی اور سب نے آخر میں کہا اگر آپ ہماری بات مان لیں تو ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے، یہ رہا آپ کا ملک اور یہ رہے آپ! (یعنی اسلام کا مقصد ملک گیری نہیں ہے۔ مترجم)

حضور رسالت مآبؐ نے سرکار ولایت حضرت علیؑ سے فرمایا: جب تک کسی کو اسلام کی دعوت نہ دے لو اس سے جنگ کی ابتدا ہرگز نہ کرو۔ خدا کی قسم اگر تمھاری وجہ سے خدا ایک شخص کو ہدایت عطا کرے تو پوری دنیا کی ملکیت سے تمھارے لئے بہتر ہے[1]

اسلامی جنگوں کی بنیاد قربِ خدا اور ابدی سعادت کے حصول پر استوار کی گئی ہے مسلمانوں کو ملک گیری کی اجازت ہرگز نہیں دی گئی اور نہ اس کی اجازت دی گئی ہے کہ لوگوں کو اپنا غلام بنائیں، اسی لئے صفحاتِ تاریخ پر پھیلی ہوئی وہ جنگیں جن کا مقصد ملک گیری، مطامع مادی کا حصول، استعمار، تغلب رہا ہو وہ اسلامی جنگ کہلانے

---

[1] وسائل۔ جلد ۲ صفحہ ۴۲۱

کی مستحق نہیں ہیں۔!

مسلمان جنگ کو بطور عبادت بجا لاتا ہے۔ مسلمان اعلائے کلمۂ حق کی خاطر جنگ کرتے تھے ان کا خیال تھا جب ساری دنیا میں اسلام پھیل جائے گا تو ہر قسم کا ظلم و ستم ختم ہو جائے گا۔ افراد بشر میں کامل مساوات پیدا ہو جائے گی۔ ایسے مقاصد کو لے کر راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کو خدا دوست رکھتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے، جو لوگ راہِ خدا میں سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی مانند ڈٹ کر جہاد کرتے ہیں خدا ان کو دوست رکھتا ہے۔[1]

اگر مجاہدین کی کوئی جماعت اپنی پرانی جاہلیت والی عادت کی بنا پر مال غنیمت کو مطمحِ نظر بنا لیتی تھی تو اس کی شدت سے تردید اور سختی سے سرزنش کی جاتی تھی چنانچہ ارشاد ہے: تم دنیا کی مال و دولت چاہتے ہو اور خدا تمھارے لئے آخرت کا خواہاں ہے۔[2]

یقیناً یہ اسلام کی بہت بڑی خوبی ہے کہ اس نے انسانی عدالت و شرافت کے لئے اتنی سعی و کوشش کی۔ ڈاکٹر مجید خدوری لکھتے ہیں، یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنی چاہئے کہ اسلام کی نظر میں جہاد صرف ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے "دارالحرب" کو "دارالاسلام" بنانا مقصود ہے۔ اگر اسلام کا یہ مقصد کبھی حاصل ہو جائے گا تو پھر جہاد کا مقصدِ داخلی دشمنوں کی سرکوبی کے علاوہ کچھ نہیں رہ جائے گا اور پھر ایک نہ ایک دن داخلی جنگ بھی ختم ہو ہی جائے گی۔ اس بنا پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کے وضع قانون کی تھیوری میں بالذات جنگ ہدف نہیں ہے۔ بلکہ اس کو تو صرف صلح و آشتی کے لئے رکھا گیا ہے۔[3]

اسلام کے جنگی دستور میں اخلاقی پہلو کا مکمل طرح سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں جنگ کرتے وقت بھی مسلمانوں کے اخلاق کی طرف اتنی توجہ دی گئی ہے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا کے کسی بھی مذہب میں توجہ نہیں دی گئی ہے اسلام نے حفاظتِ نفوس کے لئے اور قتل و غارت گری کو روکنے کے لئے بہت ہی معقول اقدام کئے ہیں اور امکانی حد تک اس

---

[1] سورہ صف، آیت ۱۔ [2] سورہ انفال، آیت ۶۷۔ [3] جنگ و صلح در اسلام، صفحہ ۲۱۴۔

کو روکنا چاہا ہے۔

اسلامی جہاد میں ترکِ دشمنی دشمن کے سرخم کر دینے ہی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ صرف اتنی سی بات کافی ہے کہ دشمن اس بات کا عہد کرلے کہ مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اور نہ کسی قسم کی سرکشی کرے گا، اور نہ فتنہ و فساد برپا کرے گا۔

میدانِ جنگ میں اگر کوئی مجاہد دشمن سے کوئی معاہدہ کرلے یا دشمن کو امان دے دے تو بڑے سے بڑا اسلامی حاکم بھی اس معاہدے کو ختم نہیں کرسکتا اور دیئے ہوئے امان کو توڑ نہیں سکتا۔ اسلام نے جہاد میں جلانے، کھیتوں کو نیست و نابود کر دینے، آب و دانہ بند کر دینے کو سختی سے روکا ہے۔ بچّوں، بوڑھوں، عورتوں، دیوانوں، بیماروں کو قتل نہ کرنے کی تاکید کی ہے اور اُن کے خون کو محترم قرار دیا ہے۔ کسی بھی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ دشمن کو شکست دینے کی خاطر ان افراد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ اسی طرح دشمن کے نمائندوں اور سفیروں کو محترم قرار دیا ہے۔ پروفیسر "محمد حمید اللہ" پیرس یونیورسٹی کے استاد اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں: سرکارِ رسالت نے ایک ملیون مربع میل زمین پر حکومت فرمائی ہے اور یہ مساحت پورے سرزمین یورپ کے برابر ہے۔ یقینی طور سے اتنا بڑا حصّہ اربوں اشخاص کا مسکن تھا۔ زمین کے اتنے بڑے حصّے کو فتح کرنے میں صرف ڈیڑھ سو مخالف جنگ میں مارے گئے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی کم از کم دس سال تک ہر ماہ ایک شخص کی شہادت پر مشتمل ہوتی ہے۔ انسانی خون کا اس قدر احترام بشری تاریخ میں بے نظیر ہے[1]

اِس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے چند نمونے یہاں پر ذکر کرتا ہوں۔ رسُولِ خدا صلعم جب لشکر جنگ کے لئے بھیجتے تھے تو فرماتے تھے: خدا کی راہ میں خدا کی مدد اور خدا کے نام کے ساتھ اور اس کے بھیجے ہوئے رسُولؐ کی روش پر جاؤ (دیکھو) مکاری و خیانت نہ کرنا، کسی کے اعضائے بدن کو نہ کاٹنا، بوڑھے، بچّے، از کار افتادہ اشخاص اور عورتوں کو

---

[1] رسُولِ اکرم در میدانِ جنگ صفحہ ۹۔

قتل نہ کرنا، مجبوری کے علاوہ کسی بھی صورت میں درخت نہ کاٹنا، تم میں جو بھی ـــ خواہ وہ کتنا ہی پست ہو یا کتنا ہی بلند ـــ کسی کو پناہ دے دے اس کی حفاظت سب پر ضروری ہے جب تک کہ وہ حق بات سُن نہ لے، اگر وہ تمھاری بات مان لیتا ہے تو تمھارا بھائی ہے ورنہ پھر اس کو بحفاظت اس کی پناہ گاہ تک پہنچا دو، اور ہر حالت میں خدا سے مدد مانگو۔[1]

حضرت علیؑ نے اپنے لشکر کو یہ دستور دیا جب وہ لشکر معاویہ سے جنگ کرنے پر تیار تھا، میدانِ جنگ سے بھاگنے والے دشمن کا ہرگز پیچھا نہ کرنا اور نہ ان کو قتل کرنا، جو لوگ میدان میں اپنی حفاظت کرنے کے لائق نہ ہوں یا زخمی ہو گئے ہوں ان کو اذیت و تکلیف نہ پہنچانا، عورتوں کی حفاظت کرنا، ایسے کام نہ کرنا جس سے عورتوں کو تکلیف یا اذیت ہو

میدانِ جنگ میں اس کا بھی امکان ہوتا ہے کہ دشمن کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے انسان کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھے اس موقع پر بھی مسلمان کو تاکید کی گئی ہے کہ اپنی غرض و غایت کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور اپنے غصّے اور جذبۂ انتقام کو پی جائے۔ سب ہی اس قصّے کو جانتے ہیں کہ ایک جنگ میں حضرت علیؑ نے جب دشمن پر وار کیا تو وہ گر پڑا حضرت علیؑ فوراً اس کے سینہ پر سوار ہو گئے اس نے آپ کے اوپر لعابِ دہن ڈال دیا۔ حضرت علیؑ اس کے سینہ سے اتر کر الگ کھڑے ہو گئے لوگوں نے پوچھا آپ نے یہ کیا کیا؟ فرمایا اس کی اس حرکت سے مجھے غصّہ آ گیا تھا اگر میں اس وقت قتل کر دیتا تو جذبۂ انتقام کو بھی دخل ہوتا اس لیے جب غصّہ ختم ہو گیا تب میں نے قتل کیا، تاکہ یہ قتل خالص خدا کے لئے ہو۔ اسلام نے ایک انسانی احساس تمام لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہا ہے اور کسی بھی صورت میں بے عدالتی کو جائز نہیں قرار دیا، کسی بھی مسلمان کو حدود عدالت سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اسلام نے دشمن کے تعدی و تجاوز کے برابر

---

[1] وسائل جلد ۲ صفحہ ۴۲۴۔

ہی تعدّی و تجاوز کو جائز قرار دیا ہے اور مجاہدین کو صریحی طور پر اس کے لئے آمادہ کیا ہے چنانچہ قرآن آواز دیتا ہے: جو شخص تم پر ظلم و تعدّی کرے اس کے ظلم و تعدّی کے برابر ہی تم اس کو جواب دو، اور عذابِ الٰہی سے ڈرو اور یہ جان لو کہ خدا متقی و پرہیزگاروں ہی کے ساتھ ہے[1]

خبردار کہیں دشمن تم میں سے ایک گروہ کو خلافِ عدالت پر نہ اکسائے عدالت کو اپنا پیشہ بنالو کیونکہ یہ تقوے سے نزدیک تر ہے[2]

خبردار جن لوگوں نے تم کو مسجد الحرام میں داخل نہیں ہونے دیا (کہیں) ان کی دشمنی تم کو ظلم پر آمادہ نہ کردے[3]

اسلام تو ساری دنیا میں عدالتِ دافعیہ کو پھیلانے کے لئے آیا ہے وہ اجتماعی عدالت اور بین المللی عدالت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اگر مسلمانوں کا بھی کوئی گروہ حق و عدالت کی راہ سے منحرف ہوجائے تو اسلام نہ صرف یہ کہ اس کو بُرے کام سے روکتا ہے بلکہ جنگ و مبارزہ کے لئے اس کی سرکوبی کے لئے تیار ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں جھگڑا کرلیں تو ان کے درمیان صلح و آشتی کراؤ اور اگر کوئی زیادتی کرتا ہے تو زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کا پابند ہوجائے۔ اگر حکمِ خدا کا پابند ہوجاتا ہے تو ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح و آشتی کراؤ یقیناً خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے[4]

جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اصلاح کرانے والوں کو تاکید کی جارہی ہے کہ دونوں فریق میں عدالت و انصاف سے کام لیا جائے تاکہ ہر شخص کو اس کا حق مل جائے کیونکہ جہاں جہاں پر تعدی و تجاوز کی وجہ سے جنگ شروع ہوئی ہو اگر ان کے درمیان طرف داری سے کام کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ظلم کرنے والوں کو تقویت پہنچ جائے۔

معاف کردینا یقیناً ایک اچھا و مستحسن اقدام ہے لیکن اس قسم کے مواقع پر معاف کردینے

---

[1] سورہ بقر آیت ۱۹۱ [2] سورہ مائدہ آیت ۱۱ [3] سورہ مائدہ آیت ۳ [4] سورہ حجرات آیت ۳۔

کا مطلب تجاوز کرنے والے کو چھوٹ دے دینا ہے اور اس کی ہمت افزائی کرنی ہے حالانکہ اسلام معاشرے سے جبر و ظلم کو ختم کرنا چاہتا ہے اور لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ظلماً و جبراً کوئی چیز حاصل نہیں کی جا سکتی۔!

مفتوح قوموں کے ساتھ مسلمانوں کا انسانی رَویّہ اور جواں مردانہ اقدام سبب بن گیا کہ عموماً یہ لوگ مسلمانوں کے ہمدرد ہو گئے اور مسلمانوں کے لئے رائے عامہ ہموار ہو گئی ان کے رَویّہ نے لوگوں کا دل جیت لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حمص والوں نے برقل کے لشکر پر شہر کا دروازہ بند کر دیا تھا لیکن مسلمانوں کے لشکر کے پاس ان لوگوں نے خود پیغام بھیجا کہ ہمارے لئے رومیوں (اپنوں) کا ظلم و ستم گوارہ نہیں ہے لیکن آپ لوگوں "اجنبیوں" کا عدل و انصاف پسندیدہ ہے۔ آپ حضرات تشریف لائیے اور ان کے لئے شہر کا دروازہ کھول دیا۔ ابو عبیدہ کی سرکردگی میں جب اسلامی لشکر اردن کی سرزمین پر پہنچا تو وہاں کے عیسائیوں نے اس مضمون کا خط مسلمانوں کو لکھا۔

اے مسلمانو! آپ لوگ ہمارے نزدیک رومیوں سے زیادہ محبوب ہیں اگرچہ رومی ہمارے ہم مذہب ہیں لیکن چونکہ آپ لوگ عادل، باوفا، مہربان ہیں نیک ہیں (اس لئے ہم لوگ آپ کو چاہتے ہیں) رومیوں نے نہ صرف یہ کہ ہم پر تسلّط اختیار کیا بلکہ ہمارے گھروں کو بھی تاراج کر دیا۔

فیلیپ ہٹی (PHILIPH HITTI) اسپین پر مسلمانوں کے قبضے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: اسلامی لشکر جہاں پہنچ جاتا تھا لوگ ان کے لئے آغوش پھیلا دیتے تھے ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے اور اپنے کمین گاہوں کو یکے بعد دیگرے خالی کر دیتے تھے جو لوگ بادشاہان ویزیگوٹ (VISIGOTH) کے ظلم و ستم سے واقفیت رکھتے ہیں ان کے نزدیک اس کا فلسفہ بہت ہی واضح و آشکار ہے[1]

---

[1] تاریخ عرب جلد ۲ صفحہ ۶۳۸۔

مسلمان جس ملک کو فتح کرتے تھے وہاں کے لوگوں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ اسلام کے اجتماعی نظام نے اقلیتوں کے مذہبی عقیدے کو کامل آزادی دے رکھی ہے۔ ان کے عبادات، داخلی زندگی سے اسلام کوئی باز پرس نہیں کرتا۔ مختصر یہ کہ قانونی حق سے اسلام اور غیر اسلام ہر عقیدے والے لوگ برابر کا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

مسلمانوں سے زکوٰۃ کے نام سے جو ٹیکس لیا جاتا ہے اس میں عبادت اور مالیات دونوں قسم کے جنبے موجود ہیں۔ اس کے باوجود اسلام دوسروں سے یہ ٹیکس وصول نہیں کرتا، بلکہ ان سے جزیہ وصول کرتا ہے جس میں عبادت یا مذہبی پہلو بالکل نہیں ہے اور یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگ اسلامی عبادت پر اپنے کو مجبور نہ سمجھیں۔ غیر مسلم جزیہ دے کر اسلامی حکومت کی پناہ میں آجاتا ہے اور جتنی بھی سہولتیں مسلمانوں کے لئے ہیں وہ سب دوسروں کے لئے بھی دی جاتی ہیں۔ اس بنا پر یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی نظام نہ صرف شخصی اصول کا لحاظ کرتا ہے بلکہ تمام دیگر مذاہب کا بھی قانوناً لحاظ کرتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جنائی، مدنی، تجارتی امور جو مذہبی عقائد سے ارتباط رکھتے ہیں ان کی بھی باقاعدہ مراعات کرتا ہے تاکہ اقلیتیں ان چیزوں میں بھی کامل آزادی کا احساس کر سکیں جن کا دینی عقیدے سے تعلق ہے۔

قرآن نے مسلمانوں کے دوسرے مذاہب والوں سے روابط کو بھی مشخص و معین کیا ہے غیر مسلمانوں سے محبّت ان کے ساتھ احسان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اَلبتہ جو لوگ مسلمانوں سے دشمنانہ رَویّہ رکھتے ہیں اور اسلام و مسلمانوں کو ظاہر بظاہر اور پوشیدہ طریقے سے نقصان پہنچانے کے دَرپے رہتے ہیں ان سے محبت و دوستی کو منع کر دیا ہے۔

جن غیر مسلموں نے تم کو اپنی زمینوں سے باہر نہیں نکالا اور تم سے برسرِپیکار نہیں ہوتے ان سے محبّت کو منع نہیں کرتا۔ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ خدا صرف ان لوگوں کی دوستی سے تم کو منع کرتا ہے جو تمھارے دین کی وجہ سے تم سے جنگ کرتے ہیں۔

اور اپنے ملکوں سے دربدر کرتے ہیں اور اس کام پر برابر اصرار بھی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے دوستی کرنے والے یقیناً ظالم ہیں[1]

ان اقلیتوں کے ساتھ جو اسلامی قلمرو میں زندگی بسر کرتی ہیں جیسے یہودی عیسائی ان سے اسلام دوطرفہ محبت کا قائل ہے۔ اور اپنی مکمل حکومت و سلطنت کے باوجود اسلام ان لوگوں پر کسی قسم کی سختی نہیں کرتا۔ مدینے میں پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں یہودی جب تک اپنے عہد و پیمان پر باقی تھے معمولی سے ظلم کے بغیر مسلمانوں کے دوش بدوش زندگی بسر کرتے تھے۔ حضور سرورِ کائنات کے بعد خلفاء کے دور میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔

سرکار دو عالم فرماتے ہیں: کسی ذمی کو تکلیف پہنچانے والا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ جو غیر مسلم ہم سوگندوں پر ظلم و ستم کو جائز رکھتا ہے اور ان کو روح فرسا تکلیف پر آمادہ کرتا ہے یا اس کی اجازت کے بغیر اس کا کوئی مال لیتا ہے قیامت میں میں اس سے احتجاج کروں گا۔

حضرت علیؑ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک بوڑھے و نابینا شخص کو دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھا اصحاب نے کہا یہ نصرانی ہے، جوانی کے عالم میں حکومت اسلامی میں ملازم تھا (یہ سن کر) حضرت نے فرمایا: جوانی میں اس سے کام لیتے رہے اور جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اس کو اس کے حق سے محروم کر دیا (یہ تو ظلم ہے) اس کے بعد بیت المال کے متصدی کو بلا کر حکم دیا کہ بیت المال سے اس کے مصارف پورے کیا کرو[2]

ناپل یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر واگلیری (DR. LAURAVACCEIAVAGLIERI) لکھتے ہیں: اسلامی حکومت مفتوح قوموں کے حقوق و مالیات کی حفاظت اسی طرح سے کرتی ہے جس طرح مسلمانوں کی۔ فاتح بدو عرب اپنی فتح و قدرت کے باوجود ہمیشہ اس بات پر تیار رہتے تھے کہ دشمنوں سے کہیں جنگ ختم کر کے ایک معقول جزیہ دو، اور پھر اسلام کی

---

[1] سورہ ممتحنہ آیات ۸، ۹ [2] وسائل۔

پوری حمایت میں آجاؤ، پھر تم کو وہی حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ہم لوگوں کو حاصل ہیں۔
اگر محمدؐ کے اقوال یا صدر اسلام کے فتوحات کی طرف نظر کریں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں پر الزام ہی الزام ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا خود قرآن کا اعلان ہے دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہیں ہے۔

مسلمانوں نے غیر قوموں کے ساتھ جو بُردباری لطف و مہربانی برتی ہے اس کے متعدد نمونے تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ رکھے ہیں جیسے رسولؐ اسلام نے خود شخصی طور پر نصاریٰ نجران کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی۔ اور یمن جانے ایک گورنر کو حکم دیا تھا کہ تمہارے حدود سلطنت میں کسی یہودی کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسی طرح مسلمانوں نے بھی دوسری قوموں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی اور ان سے جزیہ کے نام سے ٹیکس لے کر ــــ جزیہ مسلمانوں کے ٹیکس سے کم ہوتا تھا ــــ ان کی حفاظت اسی طرح سے کی جاتی تھی جس طرح دوسرے مسلمانوں کی۔

آدم مٹز (ADAM METZ) لکھتا ہے: اسلامی ممالک کو یورپی ممالک سے جس چیز نے ممتاز کیا ہے وہ غیر مسلموں کا نہایت آزادی کے ساتھ اسلامی ممالک میں زندگی بسر کرنا ہے۔ کیونکہ یہ بات یورپی ممالک میں ناپید تھی۔ اسی طرح یہ بات بھی سببِ امتیاز تھی کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اسلامی ممالک میں اتنی آزاد تھیں کہ خیال ہوتا تھا یہ دائرے اسلامی ممالک سے خارج سے ہیں۔ اس قسم کی مذہبی آزادی کا تصور قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے اندر قابلِ تصور بھی نہ تھا۔[۱]

جان ڈیون پورٹ (JOHN DAVENPORT) لکھتا ہے: اسلام نے عدالت کے اصول نہ صرف اپنے ماننے والوں پر لازم قرار دئے تھے بلکہ غیر مسلم اقوام جو حکومتِ اسلامی کی پناہ میں زندگی بسر کرتی تھیں اُن پر بھی لاگو کئے تھے۔ تمام مذہبی علماء سے

---

[۱] روح الدین الاسلامی

عبادت گاہوں پر صرف ہونے والی رقم کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا تھا اسی طرح حکومتی ٹیکس سے بھی تمام مذاہب کے علماء کو معاف کر دیا تھا[1]

فرانسیسی مشہور مورخ ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (DR. GUSTAVE LEBON PROFESSOR) لکھتا ہے چند ہی صدیوں کے اندر مسلمانوں نے اسپین کے اندر علمی و مالی اعتبار سے عظیم انقلاب پیدا کر دیا تھا اور اسپین کو یورپی ممالک کے سر کا تاج بنا دیا تھا۔ اور یہ انقلاب صرف علمی و مالی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی تھا۔ مسلمانوں نے ایک بہت ہی پر ارزش اصول رواداری کو سکھایا تھا، یا سکھانا چاہا تھا اور وہ "باہم زندگی بسر کرنا" تھا۔ غیر مسلم اقوام کے ساتھ ان کا برتاؤ اتنا نرم تھا کہ پادریوں کو مذہبی اجتماعات منعقد کرنے کی خصوصی اجازت دی گئی تھی چنانچہ اشبیلیہ میں ۸۷۲ء اور قرطبہ میں ۸۵۲ء کے اندر مذہبی تحقیقی اجتماعات برپا کئے گئے تھے۔

مسلمانوں کے دور میں بکثرت کلیساؤں کے تعمیر سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ غیر مسلم اقوام کا کتنا احترام کرتے تھے۔ بہت سے عیسائی مسلمان ہو گئے حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسلامی حکومت میں یہودی و عیسائی مسلمانوں کے حقوق میں برابر کے شریک تھے۔ دربارِ خلافت میں ہر قسم کے عہدے ان لوگوں کو دئے جا سکتے تھے[2]

مسلمانوں کی فتوحات و جوانمردی کو صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کے شرمناک اعمال سے مقابلہ کریں تو اسلام کا صحیح موقف جنگ کے بارے میں معلوم کر سکتا ہے عیسائیوں نے نہایت ہی وحشیانہ طریقے سے بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا۔ اور بدترین اعمال و بے حساب قتل و غارت گری اس شہر والوں کے ساتھ روا رکھی گئی تھی، بیت المقدس کے

---

[1] عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد و قرآن صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶ [2] تمدن اسلام و عرب صفحہ ۳۴۵

میدانوں میں، راستوں میں، سروں اور پیروں اور ہاتھوں کے ٹیلے بنائے گئے تھے۔ مسجدِ عمر میں دسیوں ہزار مسلمان جو پناہ گزیں ہوئے تھے ان کو بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ معبد سلیمان میں اتنا خون بہایا گیا تھا کہ گھوڑے زانو تک خون میں بھیگ جاتے تھے۔ اور اس میں مرنے والوں کے جسم غوطے کھاتے تھے۔

یورپی رائٹر کلارک (KENNETH CLARK) کہتا ہے: یقینی اور قطعی بات یہ ہے کہ دنیائے اخلاق نے صلیبی بہادروں سے کسی بھی خیر و برکت کو نہیں دیکھا کیونکہ کسی بھی زمانے میں کسی شہر کے اندر اتنی شرارت، بے شرمی، شہوت رانی، فسق و فجور کا ظہور نہیں ہوا جتنا "مقدس جنگ" کے نام پر اس شہر میں ہوا۔

صلیبی بہادروں نے وہم پرستی و خرافات کو ابدی نشانی بنا دیا تھا۔ معمولی معمولی تعصب کے نمونوں کو پہاڑ بنا دیا کرتے تھے، جنگ مقدس وظیفہ بن گئی تھی۔ دعا، احسان، کارِ خیر کے بدلے گناہوں کا کفارہ مسلمانوں کا قتلِ عام قرار دیا تھا[1]

صلیبیوں کے ۸۸ سالہ دورِ حکومت کے بعد مسلمانوں نے فلسطین واپس لینے کی فکر شروع کی، اور جنگ کا آغاز کر دیا۔ یورپ نے بیت المقدس پر اپنا تسلط باقی رکھنے کے لئے اپنی ساری قوت ایشیا میں صرف کر دی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور آخر کار فلسطین میں صلیبی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور صلاح الدین ایوبی کی فلسطین پر حکومت قائم ہو گئی یورپی اپنے وطن واپس چلے آئے۔

اکتوبر ۱۱۸۷ء (رجب ۵۸۳ھ) میں بیت المقدس پر اسلامی پرچم دوبارہ لہرایا شہر کے دروازے مسلمان سپاہیوں کے لئے کھل گئے اور بادشاہ اسلام صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے بیدردی سے قتل اور صلیبی بہادروں کے ظلم و ستم کے بدلے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اور عیسائیوں کو قتل و پھانسی سے بچا کر اسلامی فتوحات کی تاریخ افتخار

---

[1] عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمدؐ و قرآن صفحہ ۱۳۹

میں ایک اور باب کا اضافہ کر دیا۔ اس پوری جنگ میں مسلمان سپاہیوں کے اندر اسلامی روح شدت سے اثر انداز تھی اور یہ لوگ ہر قسم کی قساوت و بے رحمی سے پاک تھے۔

صلاح الدین ایوبی نے عام معافی کا اعلان کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ مرد دس دینار، عورتیں پانچ دینار، بچے دو دینار دے کر اپنی پوری پونجی لے کر جہاں جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔ اور چونکہ تمام شہروں میں بیت المقدس ہی محفوظ ترین شہر تھا اسی لئے بڑے لوگ اپنے بال بچوں کو بیت المقدس میں رکھتے تھے اور خود دوسرے شہروں میں رہتے تھے (اس لئے صلاح الدین نے جانے کی اجازت دے دی) اسی وقت سب سے بڑا پادری اپنی بے پناہ دولت لے کر جانا چاہتا تھا۔ کچھ لوگوں نے صلاح الدین کو مشورہ دیا کہ اس پادری کا مال چھین کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ صلاح الدین نے کہا یہ بات ناممکن ہے میں ایسی خیانت نہیں کر سکتا۔ کسی بھی شخص سے دس دینار سے زیادہ نہیں لوں گا۔

جان دیون پورٹ (JOH NDAVEN PORT) لکھتا ہے: شامی بادشاہ صلاح الدین ایوبی نے جب دوبارہ اس شہر "بیت المقدس" کو واپس لیا تو ایک آدمی بھی قتل نہیں کیا اور عیسائی اسیروں کے ساتھ حد سے زیادہ ترحم کا برتاؤ کیا۔[1]

اسپین میں عیسائیوں کی وحشت گری مشرق میں صلیبی جنگوں کی وحشت گری سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اسپین میں مسلمانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے تھے اور ملک کو جتنی ترقی عطا کی تھی اس کے بدلے عیسائی مذہب کے رہبروں نے مسلمانوں کے بوڑھوں، جوانوں، عورتوں، بچوں کے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ پوپ فلیپ دوم (POPE FALEPE-II) نے مسلمانوں کو اسپین چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ لیکن مسلمان ملک چھوڑنے سے پہلے پہلے کلیسا کے حکم سے قتل کر دئے گئے۔ اور جو لوگ اپنی جان بچا کر

---

[1] عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمدؐ و قرآن۔ صفحہ ۱۳۹

بھاگ رہے تھے ان کو عدالت میں پیش کیا گیا اور عدالت نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔
اس مدت میں تقریباً تین ملیون مسلمان عیسائیوں کے تعصّب کی وجہ سے قتل ہوئے۔

جان دیون پورٹ (JOHN DAVENPORT) لکھتا ہے: کون ایسا ہے جو جوانمردی کے زوال یعنی اسپین میں اسلامی حکومت کے خاتمے پر سوگوار نہیں ہے؟ کون ہے جس کے سینے میں اس شجاع و غیرت مند ملّت کا احترام موجود نہیں ہے؟ یہ وہی ملّت تو ہے جس نے آٹھ سو سال تک اسپین پر حکومت کی لیکن مخالف مورخین بھی ان کے معمولی سے ظلم و ستم کو قلم بند نہ کر سکے کیونکہ ان کا پورا دور عدل و انصاف سے بھرپور تھا۔ کون ہے جو تحریک عیسائیت سے شرمندہ نہیں ہے؟ اس تحریک سے مراد وہ تحریک ہے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے خلاف شیطانی مظالم کی انتہا کر دی گئی تھی اور یہ سارے مظالم ان مسلمانوں پر کئے جا رہے تھے جنھوں نے اسپینیوں کی انسانیت کا درس دیا تھا۔[1]

مشہور مؤرخ جرجی زیدان تحریر کرتے ہیں: اسپین پر عیسائی قبضے کے بعد مسلمانوں کو یہودیوں اور بدکاروں کی طرح اپنے ساتھ نشانی رکھنے پر مجبور کیا گیا تاکہ اس نشانی کے ذریعے سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ مسلمان ہے اور پھر آخر میں مسلمانوں کو موت یا عیسائیت کے لئے اختیار دے دیا گیا۔

انسان دوست عیسائیوں نے اسپین پر قبضہ کرنے کے بعد مسجدوں کو کلیسا میں بدل دیا، مسلمانوں کی مذہبی آزادی چھین لی، مسلمانوں کے قبرستانوں کو برباد کر دیا۔ ان کو حمام میں جانے سے ——— جو ایک ضروری کام ہے ——— روک دیا گیا۔ اور خود مسلمانوں کے حماموں کو ویران و برباد کر دیا۔

ہنری چہارم کے زمانے میں اسپینی نام نہاد مجاہدوں نے ——— جن کو قصبہ

---

[1] عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمدؐ و قرآن صفحہ ۱۳۳ [2] تاریخ تمدن اسلام جلد ۴ صفحہ ۲۸۲
[3] عظمت مسلمین در اسپانیہ صفحہ ۲۴۳۔

دولان کے برخلاف ابھار آگیا تھا اور جس کی آبادی چار ہزار نفوس پر مشتمل تھی — دولان کے تمام مسلمانوں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا[1] پوری تاریخ میں عیسائیوں کے صلح جوئی کا یہ مفہوم رہا ہے۔!

آج کی دنیا میں بھی متمدن استعمار گروں کے چنگل میں پھنسی ہوئی قوموں کے ساتھ ان لوگوں کے برتاؤ کی طرف توجہ کی جائے تو پتہ چل جائے گا کہ رُوبہ ترقی اقوام کی عزت و شخصیت کو کس طرح پامال کیا جا رہا ہے۔ اور ان کو ان کے واقعی تمدن سے کس طرح محروم کر دیا ہے۔ ان کی پوری تعلیم کا مقصد —— خواہ وہ مرئی ہوں یا غیر مرئی نفوس کی روح و افکار کو استعمار کرنا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص مصالح کے لئے لوگوں کو آزادی رائے و فکر سے محروم کر دیا ہے اور ان کو اس طرح جکڑ دیا ہے کہ ان کے مصالح کے خلاف وہ لوگ کوئی اقدام نہ کر سکیں۔ جہاں بھی انصاف کی آواز بلند ہوتی ہے اس کو بلند ہونے سے پہلے گلے ہی میں گھونٹ دیتے ہیں۔

صلح کی طرفداری بھی ایک ایسی چیز ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں جس کا نعرہ لگاتی ہیں لیکن کیا ان صلح کے حامیوں نے جنگ چھوڑ دی؟ کیا ان لوگوں نے اپنے تمام اختلافات کو ڈپلومیسی طرح سے حل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیا ان کے سیاسی نقشہ جنگ کی کوئی قدر و قیمت لگائی جا سکتی ہے؟

اسلام نے صلح کو تہذیب و اسباب کے کنٹرول کی بنیاد پر مضبوط کیا ہے۔ صلح کی ابتدا لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں سے قرار دی ہے۔ پھر بین الملی اور عالمگیر پیمانے پر ترقی کی ہے۔ کیونکہ جب لوگوں کے قلوب مطمئن نہ ہوں گے۔ دنیا کے اندر آرام و سکون ناممکن ہوگا جب تک لوگوں کے افکار پر ایک اخلاقی حکومت کی ضمانت نہ ہوگی صلح کی تمام کوششیں نقش برآب ثابت ہوں گی اور بشری معاشرے میں صلح ناممکن ہو جائے گی۔

---

[1] جنگ ہائے صلیبی جلد ا صفحہ ۷۴۔

درحقیقت معاشرے کا سنگِ بنیاد فرد ہے اسی لئے اسلام نے ایمان وعقیدے کے سہارے سکون وآرام کے بیچ کو افراد کے وجدان میں کاشت کیا ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہی ایمان وعقیدہ اس کی رفتار وکردار میں بھی اثرانداز ہوتا ہے اور پھر افراد کے سدھار سے معاشرے کا قہری طور پر سدھار ہو جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ صرف فرد کے اندرونی عقیدے ہی پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ کچھ قابلِ اطمینان قانون وضع کرتا ہے جس میں ہر فرد احساس مساوات کے علاوہ کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا۔ جو لوگ اسلامی محیط میں زندگی بسر کرتے ہیں انھیں احساس ہوگا کہ ان کی جان، مال، آبرو سب ہی مکمل طور پر امان میں ہے۔ اور گویا معاشرے کے افراد کا حوادث سے بیمہ کرتا ہے۔

بعض مکاتیبِ فکر رابطہ فرد با فرد دیگر کو رابطہ تصادم سمجھتے ہیں لیکن اسلام چاہتا ہے ان سب کا رابطہ تعاون پر اور ایک دوسرے سے محبّت و دوستی کی بنیاد پر ہو اور فردی واجتماعی آداب، درخشاں اخلاقی تعلیمات سے اس مقدس مقصد کو مدد پہنچائی جائے اور دلوں سے روحِ عداوت وبغض وکینہ کو ختم کر دیا جائے۔

جب لوگوں کے دلوں میں لطیف احساسات پیدا ہوں گے اور ان کے دلوں میں برادری اور نزدیکی کے چراغ روشن ہوں گے تو پھر ان کے دل بھی رحمت کے نور سے منوّر ہو جائیں گے اور پھر آپسی اختلافات، رنجشیں کشمکش، جدائی، جنگ، بے ایمانی رفتہ رفتہ کر کے ختم ہوتی جائیں گی اور صلح وصفائی کا ہی معاشرہ اپنے بال وپر کھول دے گا۔

دنیا کا کوئی بھی نظام تمام افرادِ بشر کے لئے تمام حالات میں عادلانہ عمل نہیں کر سکتا۔ دنیا میں اجتماعی عدالت چاہے جتنی مضبوط ہو جائے لوگوں کے تمام مظالم کو دور کرنے پر قادر نہیں ہے سب کے بارے میں مکمل عدالت انسانی جملہ وسائل کے باوجود ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں بہت سے ایسے بھی مظالم ہوتے ہیں جن کا احساس دنیاوی عدالت کر ہی نہیں سکتی۔ حد یہ ہے کہ کبھی ایسی بھی بے انصافی ہوتی ہے کہ خود صاحبِ حق کو احساس نہیں ہو پاتا

کہ اس نے اپنے حق سے تجاوز کیا ہے۔ جب تک قیامت میں خدا الٰہی عدالت کے ذریعے ظالموں سے مظلوموں کا انتقام نہ لے لے اس وقت تک ایسی توقع بیکار سی ہے۔

اب آیئے ذرا دیکھا جائے اسلام اور متمدن دنیا کی نظر میں صلح کا مفہوم کیا ہے؟ اسلام جس صلح کا خواہشمند ہے وہ رؤسائے مملکت کے صلح سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کی نظر میں صلح کا مطلب یہ ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں چھوٹے ممالک کے منابع ثروت کو صلح کے نام پر آپس میں بانٹ لیں اور بخیال خود دوسروں کو اپنے زیر نفوذ کر کے ان کو راحت و آرام پہونچائیں۔

دوسرے لفظوں میں ان کے یہاں صلح کا مطلب دوسروں کو تاراج کرنا ہے۔ اسی لئے یہ لوگ مصالحت کی راہ کوئی مثبت اقدام اور خلوص نیت کا اظہار نہیں کرتے۔ جلسے جلوس بحث و مباحثہ یہ صرف رسمی چیزیں ہو کر رہ گئی ہیں اور بلا کسی نتیجے کے یہ اختتام پذیر ہو جاتی ہیں۔

لیکن اسلام ایسی صلح کا خواہش مند ہے جس کی بنیاد دنیا کی مختلف قوموں کے تساوی حقوق پر استوار کی گئی ہے۔ اور بغیر کسی تفاوت کے جس کا سایہ دنیا کے تمام اقوام پر خواہ وہ کمزور ہوں یا طاقتور، برابر پڑے۔ اسلام پوری بشریت کے لئے مکمل صلح چاہتا ہے۔

اقوام متحدہ نے اپنے منشور میں اپنے مقصد صلح کو عالمگیر پیمانے پر رکھنے کا دعویٰ کیا ہے اور اسباب جنگ و علل اختلافات کو دور کرنے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اگر کسی دن منشور کا مقصد پورا بھی ہو جائے تو آزادی رائے، آزادی افکار کا مقصد پورا ہو سکے گا؟ کیا مختلف اقوام میں زمانہ صلح میں بھی اختناق فکری اور استعمار کا وجود نہیں ہے؟

مشرقی بلاک والے اور سرمایہ دار کہتے ہیں: ہم ایک عالمگیر سسٹم کے برقراری کے خواہش مند ہیں لیکن آزادی کے بغیر کونسے عالمگیر سسٹم موجود ہو سکتا ہے؟

مشرق و مغرب میں حکمراں طبقے کے مخالفین کو عملی طور پر زندہ رہنے کا حق نہیں ہے، یہ حکمراں چاہتے ہیں کہ جبر و ظلم سے دوسروں کے مسلک و عقائد کو ختم کر دیں لیکن اسلام صرف صلح کو انسانوں کی سعادت و خوش بختی کا ضامن نہیں سمجھتا بلکہ کچھ اصول کو اجتماعی زندگی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اسلام لوگوں کی آزادی فکر و رائے کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے تاکہ بشری معاشرہ سعادت بخش و صحیح راستے کی تشخیص کر کے اس کو اپنے لئے اختیار کر لے۔ اسی لئے اپنی عالمگیر دعوت میں جبر و ظلم کو ناپسند کرتا ہے اور مختلف قوموں میں پیش رفت کی علت صرف عقل و رشد فکری کو سمجھتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے دین کو قبول کرنے پر کوئی جبر نہیں ہے کیونکہ رشد و ہدایت کا راستہ گمراہی و ضلالت کے راستے سے جدا کیا جا چکا ہے[1]

تمہارے خدا کی طرف سے تمہارے پاس دلائل و براہین آ چکے ہیں پس جو شخص حق کو ان دلائل کی روشنی میں دیکھے گا فائدہ اٹھائے گا اور جو حق کو دیکھنے سے اپنی آنکھ بند کر لے گا وہ خود نقصان اٹھائے گا[2]

نصیحت کیجئے آپ کا کام صرف تذکر ہے آپ کسی کو مجبور نہیں کر سکتے[3] اسلام آزادی عقیدے کا قائل ہے اس لئے دین قبول کرنے کے لئے کسی بھی قسم کے جبر و اکراہ کو غلط سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی خود عقیدے اور ایمان کا تعلق امور قلبی سے ہے اس لئے باطنی میلان کے بغیر جبراً اس کا تحقق ممکن ہی نہیں ہے مختلف قسم کے اسباب و عوامل انسانی افکار و عقائد میں موثر ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے اصلاح کے خاطر صحیح تعلیم و تربیت منطق و استدلال کی ضرورت ہے ورنہ زبردستی انسانی خیالات کو بدلنا ناممکن سی بات ہے۔ چونکہ اسلام نے لوگوں کو حریت فکر بخشی اور ہر قسم کے فکری خفقان کو ختم کر دیا اس لئے لوگ بلا کسی جھجک و خوف کے اسلام یا کسی بھی آسمانی مذہب کو قبول کر سکتے

---

[1] سورہ بقر آیت ۲۵۶ [2] سورہ انعام آیت ۱۰۴ [3] سورہ غاشیہ آیت ۲۲

ہیں۔ اسی لئے اسلام نے قبولیت اسلام کے لئے کسی بھی قسم کے جبر و ظلم کو جائز نہیں قرار دیا۔

اس تمہید سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسلام کے ابتدائی جہاد کو دیکھ کر عیسائی مبلغین کا یہ فیصلہ کر دینا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے قطعاً حقیقت سے دُور ہے۔ ان لوگوں نے جہادِ پیغمبرؐ یا قانونِ جہاد سے اگر یہ غلط نتیجہ نکالا ہے تو جائے تعجب نہیں ہے کیونکہ ان لوگوں کے یہاں سوائے جنگ و جدال، جبر و استعمار کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں، حد یہ ہے کہ ان کے مقدسین، پوپ، تارک الدنیا قسم کے لوگوں نے عیسائیت کی تبلیغ میں اور غیر عیسائی لوگوں کو عیسائی بنانے کے سلسلے میں وہ وہ ظلم و ستم ڈھائے ہیں جن کے سامنے مغلوں اور تاتاریوں کی سختیاں ہیچ نظر آتی ہیں[1]۔

پیغمبرِ اسلام نے مشرکین قریش کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے وہ عربستان میں ایک صلح عمومی اور امن اجتماعی کی داغ بیل ڈالتا ہے اس معاہدے سے اسلامی اکسپرٹ اور انسانی اصول کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا، یہ معاہدہ ان کا منھ توڑ جواب بھی ہے۔ اس معاہدے کی ایک اہم شرط یہ تھی۔

"مشرکینِ مکّہ کی کوئی بھی فرد اگر بھاگ کر رسولِ اسلام کے پاس آجائے اور اسلام قبول کر لے اور اپنے بزرگ سے اجازت نہ حاصل کی ہو، تو رسولِ اسلام پر لازم ہے کہ اس کو مکّہ واپس کر دیں لیکن اگر کوئی مسلمان بھاگ کر قریش کے پاس چلا جائے تو قریش اس کو واپس نہیں کریں گے" کچھ مسلمان معاہدے کی اس دفعہ سے بہت رنجیدہ ہوئے اور پیغمبرؐ سے کہنے لگے آخر قریش کے پناہ گزینوں کو ہم کیوں واپس کر دیں؟ جبکہ

---

[1] اسلام مکتب مبارز و مولد صفحہ ۹

وہ ہمارے پناہ گزیں کو واپس کرنے پر مجبور نہیں ہیں تو رسولِ اسلام نے اس کا جواب اس طرح دیا۔

اگر کوئی مسلمان قریش کے پاس بھاگ جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے صدق دل سے اسلام قبول ہی نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے ایسا مسلمان ہمارے لئے مفید نہیں ہو سکتا اس لئے اس کا جانا ہی بہتر ہے اور ہم اگر قریش کے پناہ گزینوں کو واپس کر دیتے ہیں تو ہم کو اطمینان ہے کہ خدا ان کے نجات کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کرے گا۔[1]

رسولِ اسلام کا یہ فرمانا "خدا ان کے نجات کا کوئی راستہ پیدا کرے گا" بالکل سچ نکلا کیونکہ کچھ ہی مدت کے بعد خود قریش نے خواہش کی کہ اس دفعہ کو ختم کر دیا جائے۔

دنیا کے مختلف حصّوں میں جنگ و خونریزی کا وجود خود مادی تمدّن کے کمزور ہونے کی دلیل ہے۔ صلح اور جنگ کے مواقع پر اسلام کے کلّی اصول اسباب ایجاد جنگ کو برابر ناپسند کرتے رہے ہیں اور مادی منافع کی خاطر اور دوسروں کو غلام بنانے کی خاطر متمدّن دنیا کی ساری جنگوں کو اسلام بُرا سمجھتا ہے۔

جب تک انسانی قدر و قیمت اور دوسروں کے حقوق کا احترام نہ کیا جائے دُنیا کو صلح و آرام دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ جس دنیا میں اخلاقی لوازمین اور انسانی اصول کا ستیاناس کر دیا گیا ہو اس میں اس سے بہتر وضع کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔!

جب تک ٹیکنالوجی اور مادی تمدن ترقی پذیر رہے گا، اور لوگ صلح کے بہانے مشغولِ جنگ رہیں گے، نئے نئے خطرناک ترین اسلحے ایجاد کرتے رہیں اس وقت تک یہ حقیقت اپنی جگہ پر مُسلّم ہے کہ بشریت کو اپنے لئے دو راہوں میں سے

---

[1] بحار جلد ۲۰ صفحہ ۳۱۲۔

کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ تیسرا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ ایک تو یہ دنیا جنگ کی بھٹی میں جلتی رہے اور اقوام تباہ و برباد ہو جائیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ لوگ خدا پر ایمان لائیں، اُن اخلاقی و انسانی اصول کی پابندی کریں جن کو انبیاء بشریت کے لئے بطور تحفہ لائے تھے تاکہ دنیا اپنی بدنی و فکری قوتوں کو راہِ فنا میں صرف کرنے کے بجائے خوش بختی کے راستے پر لگائے۔ مختصر یہ ہے کہ انسان یا خدا کو اختیار کرے یا پھر تباہی و بربادی کو۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ایک نہ ایک دن بشر پیغمبرِ اسلام کے تعلیمات سے آشنا ہوگا اور پھر نیکی و سعادت کے راستے پر چل کر اپنے لئے فائدہ ہی فائدہ حاصل کرے گا۔ کیونکہ بحران، گمراہی، تباہی سے مجبور ہو کر انسان ایک دن دامنِ اسلام میں پناہ لے گا۔ جیسا کہ روسی فلسفی ٹلسٹوی (RUSSE - FALSAFI TALESTVE) کہتا ہے کہ شریعتِ محمد (ص) عقل و حکمت کے موافق ہونے کی وجہ سے آئندہ ساری دنیا پر چھا جائے گی۔

اسلام کی نظر میں معاشرہ

جس طرح انسان کا بدن مختلف اعضاء سے مل کر بنا ہے اور ان اعضاء کے درمیان فطری رابطہ موجود ہے اسی طرح معاشرہ بھی چھوٹے بڑے خاندانوں سے مل کر بنتا ہے جب کسی خاندان کے افراد میں اتحاد اور یگانگت ہوتی ہے تو اس سے ایک مضبوط اور سالم معاشرہ بنتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر ان افراد میں اختلاف ہو تو معاشرے کا پہیّہ پورا نہیں گھومتا اور تشتّت و پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

انسان فطری طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے اور اپنی اس خواہش کو پوری کرنے کے لئے ہر قسم کی کوشش کرتا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے آسان طریقہ ایجادِ نسل ہے کیونکہ جب تک نسلِ انسانی رہے گی، زندگی رہے گی۔ اور ایجادِ نسل کے لئے ایک خانوادے کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے اقتصادیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایجادِ خانوادہ میں بھی مختلف نظریات کارفرما ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خانوادے کی تشکیل صرف جنسی سکون کے لئے کی جاتی ہے اور کچھ لوگ جو تاجرانہ ذہنیت رکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اقتصادیات کو حل کرنے کے لئے خانوادے کی تشکیل کی جاتی ہے اور شادی بیاہ بھی دو خاندانوں کے درمیان ایک قسم کا تجارتی مسئلہ ہے۔ مگر یہ طرزِ فکر اجتماع کی واقعی غرض ـــــ یعنی شادی بیاہ کا مقصد بقائے نسل ہے ـــــ سے دور ہے۔

مولر لیور (MOLER LEVIR) لکھتا ہے کہ شادی بیاہ کے تین اسباب ہوتے ہیں

(۱) اقتصادی ضرورت (۲) اولاد کی خواہش (۳) عشق - یہ اسباب اگرچہ ہر معاشرے میں موجود ہیں مگر مختلف زمانوں میں ان کے اندر مختلف تغیّر ہوا ہے - ابتدائی معاشروں میں اقتصادی علت کی اہمیت زیادہ تھی اور آج کے دور میں عشق کی اہمیت زیادہ ہے[1]

اسلام نے تشکیل خانوادہ ـــــ جو عفتِ عمومی کے حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے ـــــ کی طرف تشویق دلانے کے ساتھ ساتھ فطری مانگ کا بھی مثبت جواب دیا ہے اور شادی بیاہ کو بقائے نوع انسانی اور اولاد صالح کی پیدائش کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے - چنانچہ قرآن کہتا ہے، خدا نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لئے بیویاں بنائیں اور ان سے تمھارے لئے اولاد در اولاد کا سلسلہ قرار دیا، اور پاک چیزوں کو تمھاری روزی قرار دی[2]

اسلام نے جوانوں کو جنسی بے راہ روی سے روکنے کے لئے خاندان کے ذمّہ داروں کو ابھارا ہے کہ جوانوں کی شادی جلد از جلد کریں - کیونکہ جو جوان شخصی طور پر اپنی شادی کرنے پر قادر نہیں ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ شہوانی جذبے سے مجبور ہو کر خود کو تباہی کے غار میں گرا دے، اس لئے بچّوں کی شادی بیاہ کی ذمہ داری والدین کے سر ڈال دی اور والدین کو اس انسانی فریضہ کی ادائیگی کی طرف ضرورت سے زیادہ تشویق دلائی - کیونکہ جلد از جلد شادی کر دینا بچّوں کے اخلاق و ایمان کو محفوظ رکھے گا - اسلام کا عقیدہ ہے کہ جنسی افراط و تفریط سے بچانے اور خوش بختی کی زندگی بسر کرنے کے لئے شادی بیاہ کرنا اور خاندان کی تشکیل کرنا ضروری ہے -

رسولؐ اسلام نے ایک دن منبر سے اعلان فرمایا مسلمانو! تمھاری لڑکیاں درختوں پر پکّے ہوئے میوے کی طرح ہیں اگر ان کو بروقت توڑا نہ گیا (یعنی لڑکیوں

---

[1] جامعہ شناسی ساموئیل کینگ [2] سورہ نحل آیت ۷۲ -

کی شادی نہ کی گئی) تو آفتاب کی حرارت اور فضائی عوامل اسے تباہ و برباد کر دینگے اسی طرح اگر لڑکیوں کی فطری خواہش کو پورا نہ کیا گیا اور ان کی بروقت شادی نہ کی گئی تو ان کے فاسد ہونے کا خطرہ ہے کیونکہ وہ بھی انسان ہیں اور اُن کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہی چاہیئے [1]

امام محمد باقرؑ کے صحابی "علی بن اسباط" نے حضرت کو ایک خط لکھا اس میں تحریر کیا، مناسب و معقول لڑکے ہماری لڑکیوں کے لئے نہیں ملتے اب بتایئے ہم کیا کریں؟ حضرت نے جواب دیا ہر لحاظ سے مناسب جوان کا انتظار مت کرو کیونکہ رسولؐ اکرم نے فرمایا ہے، اگر ایسے جوان تمھاری لڑکیوں کی خواستگاری کریں جو مذہبی و اخلاقی لحاظ سے تم کو پسند ہوں تو اپنی لڑکیوں کی شادی کر دو۔ اس کے علاوہ صورت میں اپنے لڑکے اور لڑکیوں کی بے راہ روی سے مطمئن نہ ہو [2]

پس اسلام نہ صرف یہ کہ شادی بیاہ میں کوئی اڑچن نہیں پیدا کرتا، بلکہ اس فطری قوت سے شخصی زندگی اور اجتماع کو فائدہ حاصل کرنے پر آمادہ بھی کرتا ہے۔ شادی بیاہ سے جسمانی سکون کے علاوہ روحانی، فکری، اخلاقی سکون بھی ملتا ہے۔ کیونکہ جو شخص وحشت و اضطراب کے عالم میں ہو وہ واقعی سعادت کو درک نہیں کر سکتا۔ اسلام کی نظر میں یہ انسانی پیوند ـــــ شادی ـــــ دلوں کا مقدس عہد و پیمان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طرفین سکون و آرام کی زندگی بسر کر سکیں۔ قرآن میں ارشاد ہے۔ خدا کے وجود کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے تمھاری ہی نوع سے تمھارے لئے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے آرام حاصل کرو اور تمھاری درمیان مہر و محبت قرار دی اور جو لوگ اس محبت و دوستی میں غور و فکر کریں گے ان کے لئے بہت سی نشانیاں اس میں موجود ہیں [3]

---

[1] وسائل۔ باب ۲۲ [2] وسائل۔ باب ۲۷ [3] سورۂ روم آیت ۲۱۔

افرادِ خاندان میں استحکام روابط کے لئے اسلام نے کچھ معاشرتی اصول و قوانین بھی بتائے۔ اسلام نے شادی کو "پیمان محکم" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے[1]

اور تمام مادی وسائل کو اپنے مقصد سے بالکل الگ رکھا ہے۔ خاندان کے افراد میں اتحاد و ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے ہر ایک کے فرائض عادلانہ طریقے سے بتادیتے تاکہ ہر شخص اپنے فنی استعداد کے لحاظ سے اپنے امورِ زندگی کو پورا کر سکے۔ چنانچہ ارشاد ہے عورت و مرد ایک دوسرے کے ساتھ برابر کے حقوق رکھتے ہیں[2]

تقسیم کار کے سلسلے میں بھی عورت و مرد کی فطرت کا بہت ہی دقیق نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ مرد پر اقتصادیات کی فراہمی اور ان سے متعلق امور لازم کئے گئے اور عورتوں سے بچّوں کی تربیت و پرورش اور امور خانہ داری کا انتظام متعلق کیا گیا۔

اسلام نے عورت کے ذمّے اس کے فطری فرائض ہی رکھے اور اس سلسلے میں معمولی سی بھی فروگذاشت نہیں رکھی اور اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ اس کے فطری رجحانات ضائع و برباد نہ ہو جائیں۔ البتہ کسی شخصی یا اجتماعی امر کی بنا پر عورت کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ گھر سے باہر والے کام بھی انجام دے سکے لیکن معاشرے میں اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دی کہ وہ دوسرے مردوں سے غلط روابط قائم کر سکے۔

ہر انتظامیہ کا ایک سربراہ ہونا ضروری ہے گھر اور گھر داری بھی ایک قسم کا انتظامیہ ہے جس کا ایک سربراہ ہونا ضروری ہے کیونکہ بغیر سربراہ انتظامیہ ہرج و مرج میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے گھریلو انتظامیہ کی سربراہی مرد یا عورت کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ آیئے ذرا دیکھیں یہ کام کس کے سپرد ہونا چاہیئے۔ اس انتظامیہ کی ذمہ داری، بچّوں کی تربیت۔ نگرانی۔ خانوادے کا سنگین بار اُٹھانے کے لئے عورت

---

[1] سورہ نساء۔ آیت ۲۵ [2] سورہ بقر۔ آیت ۲۲۸۔

سے زیادہ مَرد لائق و سزاوار ہے۔ صرف مرد ہی ہے جو اتنی بڑی ذمہ داری کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا سکتا ہے۔

اپنی جگہ پر یہ بات طے شدہ ہے کہ عورت اپنے جذبات کی تابع ہوتی ہے اور اس کی خلقت ہی کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ فطری طور پر وہ مرد سے زیادہ زُود حِس ہے۔ برخلاف مَرد کے کہ وہ فطری طور پر عقل کا تابع ہوتا ہے۔ اِس بنا پر عاطفہ کے مقابلے میں فکر کی زیادہ اہمیت ہوئی۔ اسی لئے اسلام نے خانوادے کی ریاست مَرد کے ہاتھوں میں رکھی[1]۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت سے کسی قسم مشورہ نہ لیا جائے اور مرد حسبِ خواہش ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر بن جائے۔ اسلام نے مَرد کو سَرپرست بنانے کے ساتھ اس کو عورتوں پر ہر قسم کی زیادتی و ظلم سے رُوک دیا ہے۔ قرآن اعلان کرتا ہے ظلم و تعدّی سے الگ ہو کر شائستہ اور معقول طریقے سے عورتوں کے ساتھ زندگی بسر کرو[2]۔

گھریلو امور کی ذمہ داری مَرد کے سپرد ہونے کے باوجود گھر کے داخلی معاملات میں عورت مستقل ہے اور وسائل زندگی کی ذمہ داری اس پر ہے۔ رسولؐ اکرم نے فرمایا: خانوادے کا نگہبان مَرد ہے مگر عورت بھی گھر، شوہر، بچّوں کے بارے میں مسئول ہے[3]۔

ہمارے یہاں آج کل جو شادی بیاہ کی قدر و قیمت گھٹ گئی ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر علیحدگی ہو جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل شادی بیاہ میں واقعیات زندگی کا خیال نہیں رکھا جاتا اس قسم کی شادیاں عموماً رومانی اور بچکانہ و کچے تصورات کی بنا پر کی جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ ہم آہنگی استحاد نظریات کے بغیر محض دَولت و شہرت اور ظاہری سمائش پر شادی کر لیتے ہیں اس کے نتیجے میں یہ شادیاں ناکامیاب ہوتی ہیں ان کا مستقبل تاریک ہوتا ہے، کیونکہ عورت و مرد کے اختلافِ نظریات روز بروز

---

[1] فرانس کے جدید قانون مادہ صفحہ ۲۱۳ میں تصریح کی گئی ہے کہ خانوادے کی سَرپرستی مَرد سے متعلّق ہے۔
[2] سورہ نساء آیت ۱۹ [3] مجموعہ ورام صفحہ ۶۔

وسیع سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں اور آخری نتیجہ علیحدگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔
جب تک لوگ اصولی اور صاحبِ فکر و نظر نہ ہوں گے زندگی کے واقعی مسائل کا صحیح مطالعہ نہیں کریں گے اس قسم کے حالات روز بروز بڑھتے جائیں گے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ایسے طرزِ فکر ـــــ جو بدبختی اور کشمکش کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیتا ـــــ کو رد کر دیا ہے۔ اسلام کی نظر میں تشکیل خانوادے کے لئے دولت، شہرت، مادی امور کی کوئی قیمت نہیں ہے بلکہ شادی کا دار مدار ایمان و فضیلت عفت و پاک دامنی پر ہے مرد و عورت کے تقویٰ و پرہیزگاری کی طرف خصوصی دیتا ہے پیغمبر اسلام فرماتے ہیں۔

جو شخص کسی عورت سے خوبصورتی کی بنا پر شادی کرے گا اپنی محبوب چیز اس میں نہیں پائے گا اور جو کسی عورت سے محض دولت کی خاطر شادی کرے گا خدا اس کو اسی کے حوالے کر دے گا۔ اس لئے تم لوگ با ایمان و پاک دامن عورت سے شادی کرو[1]

اسلام نے تشکیل معاشرے کی طرف بہت تشویق و ترغیب دلائی ہے۔ حدیث ہے کہ شادی سے زیادہ پسندیدہ کسی چیز کو نہیں قرار دیا[2] جو لوگ نامعقول اسباب کی بنا پر شادی نہیں کرتے ان کی مذمت کی ہے اور ہر اس بہانے کو جو جنسی رو کو غلط راستے پر ڈال دے سختی سے روکتا ہے۔ فرماتے ہیں: نکاح میری سنت ہے جو میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے[3] اسی طرح ایسے لوگوں سے اسلام شادی کو روکتا ہے جن کے اندر نفسانی کمالات اور روحانی فضائل نہ پائے جائیں اور جو خاندان نجیب نہ ہو، یا اخلاقی و مذہبی تربیت سے بے بہرہ ہو اس سے بھی شادی کو روکتا ہے گھورے کی سرسبزی سے بچو! لوگوں نے پوچھا اس سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ایسی خوبصورت عورت جس کا خاندانی ماحول خراب ہو[4]

ظاہر ہے کہ جو بیویاں اخلاقی و مذہبی اصول و قوانین کی پابند نہیں ہیں وہ خاندان

---

[1] وسائل جلد ۳ صفحہ ۶ [2] من لایحضرہ الفقیہ صفحہ ۴۰۹ [3] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۵۶۱ [4] وسائل کتاب نکاح باب ۷۔

کو خوش بخت و سعادت مند نہیں بنا سکتیں، اور ایسی شادیوں کا نتیجہ بدکار، شہوت پرست اولاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام دونوں کی نیک بختی کی طرف عقلی و اخلاقی لحاظ سے خاص نظر رکھتا ہے، اور بُری و فاسد نسلوں سے شادی کو منع کرتا ہے۔

اگر نوجوان بیوی کو منتخب کرتے وقت ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کو نہ دیکھتے ہوئے اسلامی اصُول کی پابندی کریں اور خواہشات نفس کے بجائے عقل سے کام لیں تو بدبختی سے بچ سکتے ہیں۔

ہمارے آج کل کے کچھ نوجوان بیوی کے انتخاب کے لئے صحیح راستہ یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ دنوں تک عورت کے ساتھ باقاعدہ نشست برخاست رکھی جائے۔ ساتھ رہا جائے تاکہ اس کے اخلاق و عادات سے جانکاری کے بعد اقدام کیا جائے تاکہ پوری زندگی خوشگوار طور سے گزرے حالانکہ یہ طریقہ اپنے مفاسد و نقصانات کے ساتھ بیوی کے صفات و خصائص پر پوری طرح سببِ اطلاع نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے بہت طولانی معاشرت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ؎ خبثِ نفس نگردد بسالہا معلوم تھوڑے دنوں کی آمد و رفت نشست و برخاست سے کافی معلومات نہیں حاصل ہو سکتے۔ بلکہ جوں جوں زندگی میں واقعات و حادثات رونما ہوتے رہیں گے اسی طرح انسان کی شخصیت آشکارا ہوگی درحقیقت کسی کے صبر و شکیبائی، متانت، بردباری، قناعت، درگزر، فداکاری وغیرہ کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی جاں گداز واقعہ پیش آجائے، ورنہ خوشی و آسائش، تفریح کے وقت ان اخلاقی صفات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

کیا تفریح گاہ یا سینما میں ملاقات سے طرفین کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے؟ جبکہ ابتدا میں دونوں طرف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی کمیوں کا اظہار نہ ہونے پائے، بلکہ تصنع کر کے اپنے کو نیک خصلت، پسندیدہ صفت ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسی

صورت میں صحیح حالات کا علم کیونکر ہو سکتا ہے؟ بھلا سوچئے تو جو نوجوان عمر کے شدید جذباتی دور میں ہیں وہ محض چند دنوں ساتھ رہ کر کس طرح سے پتہ لگا سکتے ہیں کہ روحانی اور اخلاقی لحاظ سے دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے؟ اس شہوانی دور اور خواب دیکھنے کی عمر نوجوان جنسیات کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں۔!

کیا وہ نوجوان مختصر سی مدت ساتھ رہنے کے بعد اپنی بیوی کا انتخاب کریں گے اور اس سے شادی کریں گے، وہ آخری عمر تک لڑائی جھگڑے کشمکش سے بچے رہیں گے؟ ان کے اور ان کی بیوی میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا؟ اور یہ دونوں قابل غبطہ زندگی بسر کر سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔!

تجربات اس کے برخلاف موجود ہیں! کیونکہ اس قسم کی شادی میں شروع شروع تو میاں بیوی بہت خوش خوش رہتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی کمی کی گرفت کرنے لگتے ہیں اور پھر نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ——

ہر جوان کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دو آدمیوں میں روحی تطابق ہر جہت سے اس طرح مشکل کیا بلکہ محال ہے جس طرح کہ ظاہری قیافہ میں اتحاد اور شکل و صورت میں مطابقت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کا اندازِ فکر اور ان کے احساسات کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ ان کو مرد سے الگ صورت میں مشخص کرتے ہیں۔

اسلام شادی بیاہ میں جس اہمیت کا قائل ہے اسی کے پیش نظر اس نے ہر فرد کو اجازت دی ہے کہ نکاح سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ لے اور اس کے اخلاقیات و دیگر خصوصیات کا علم جانکار افراد کے ذریعے بہت آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔

خاندان کی نیک بختی سب سے پہلے مرد و عورت کے روابط و یگانگت پر موقوف ہوا کرتی ہے۔ اس گھر کے دو اصلی افراد میں روحانی روابط جتنے زیادہ استوار

ہوں گے اسی قدر اس گھر کی خوش قسمتی بھی ہوگی۔ جب مرد و عورت میں ایک دُوسرے پر فداکاری کا جذبہ جتنا زیادہ موجود ہوگا تو ماحول اتنا ہی اچھّا ہوگا اور یہی جذبۂ فداکاری خاندان کو تباہ و برباد ہونے سے بچالیتی ہے۔

معاشرتی حقوق و قوانین کے علاوہ بھی اسلام نے گھریلو زندگی میں بھی ایسے مبنی بر انصاف قانون بنائے ہیں جس سے ہر ایک کے فریضے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور تعارض کی صورت ختم ہو جاتی ہے۔

مثلاً ایک طرف مرد کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ افراد خاندان کے ساتھ نیکی، خوش رفتاری میں کسی بھی قسم کی کمی نہ ہونے دو، اور دوسری طرف عورت کو تاکید کرتا ہے کہ مرد کے ساتھ اچھا برتاؤ ایک "مقدس جہاد" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیے رسولِ اکرم فرماتے ہیں میری اُمت کے بہترین فرد وہ ہیں جو اپنے خاندان کے ساتھ سخت گیری نہیں کرتے اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں[1]

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے خانوادے کے ساتھ سب سے زیادہ خوش رفتار ہو۔ میں تم سب لوگوں سے زیادہ اپنے خانوادے کے ساتھ خوش رفتار ہوں[2] عورتوں کے لئے فرماتے ہیں: اچھی عورت کا جہاد شوہر داری کرنا ہے[3]

آج کے دَور میں جوانوں کے اندر تشکیل خانوادہ کی فکر نہ کرنے اور شادی بیاہ کی تعداد میں کمی ہونے کی علت مہر کا زیادہ ہونا اور شادی بیاہ کے ناقابل برداشت مصارف کا ہونا ہے۔ کیونکہ جو نوجوان اس پر قادر نہیں ہیں وہ شادی سے فرار کرتے ہیں۔ شادی بیاہ کے سلسلے میں اس قسم کی بے بنیاد چیزیں اسلام کے نظریہ کے سخت مخالف ہیں کیونکہ اسلام تو زندگی بسر کرنے کے لئے آسان سے آسان فارمولا پیش کرتا ہے۔

---

[1] مکارم اخلاق صفحہ ۲۴۸ [2] من لایحضرہ الفقیہ صفحہ ۴۲۵ [3] تفسیر الدر المنثور

اور شادی کے سلسلے میں ہر رکاوٹ کو دُور کرنا چاہتا ہے اسی لئے اسلام کا حکم ہے مہر کم معیّن کرو اور شادی بالکل سادہ طریقے سے انجام دو۔ سرکارِ دو عالم فرماتے ہیں، عورت کی خوش قسمتی اور مُبارک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی خواستگاری آسانی سے ہو اور اس کا مہر کم ہو۔

یہ بات تجربے میں آچکی ہے کہ گھریلو اختلافات کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب عورت کا مہر زیادہ ہوتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ مرد ادا نہیں کر سکے گا تو وہ مرد کے ساتھ سختی کا سلوک کرتی ہے اس کا احترام ختم کر دیتی ہے اور یہی باتیں رفتہ رفتہ اختلاف کا سبب بنتی ہیں۔

ایک دن رسولِ اسلامؐ کے پاس اصحاب کرام بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک جوان عورت آئی اور اس نے بہت ادب سے کہا خدا کے رسول میں شادی کرنا چاہتی ہوں، رسولؐ نے حاضرین کی طرف نظر کر کے پوچھا کون شخص اس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ ایک مرد نے کہا میں حاضر ہوں، رسولِ خدا نے پوچھا اس کا مہر کیا رکھو گے؟ اس نے کہا، مہر کے لئے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے تو حضرت نے کہا پھر نہیں ہو سکتا عورت نے دوبارہ پھر شادی کی خواہش کا اظہار کیا مگر کسی نے جواب نہ دیا صرف وہی جوان بولا جو غریب تھا۔ رسولِ خدا (ص) نے پوچھا قرآن جانتے ہو؟ اس نے کہا ہاں! حضرت نے فرمایا تھوڑے سے تعلیم قرآن کے بدلے میں اس عورت کی شادی تجھ سے کرتا ہوں[1]

اس سے ظاہر ہوا کہ مالی پریشانی بھی تشکیل خانوادے میں اسلام کے نظر میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ غریبوں کو بھی شادی کی سہولت ہے۔ غربت تشکیل خانوادے سے مانع نہیں ہے۔!

---

[1] وسائل باب مہور۔

ویسے غربت و مفلسی بھی شادی نہ کرنے کی ایک بہت بڑی علّت ہے، مگر اسلام اس قسم کے بہانوں کی کوئی فکر نہ کرتے ہوئے لوگوں کو خوشخبری دیتا ہے کہ تم شادی کرو تو خدا تمھاری غربت کو بھی دُور کرے گا۔ چنانچہ خدا ارشاد فرماتا ہے جو شائستہ اور لائق لوگ شادی شدہ نہیں ہیں ان کے شادی کے اسباب مُہیّا کرو اگر وہ غریب ہیں تو خدا اپنے لطف و کرم سے ان کی غربت دُور کر دے گا[1] انسان کی ضرورتیں اس کو متحرک و فعال بناتی ہیں اس لئے جب کسی کے ذمّے خانوادے کا بار ہوگا تو زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی کوشش و فعالیت میں اضافہ کرے گا اسی لئے شادی کو زندگی کی ترقی کا ذریعہ سمجھنا چاہئے۔

مغربی ممالک میں حد سے بڑھی ہوئی آزادی جیسی بے راہ روی نے جوانوں کو تشکیل خانوادے کی طرف سے بالکل ہی بے پرواہ بنا دیا ہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے ہر اُس ضرورت کا خاتمہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آزادی مطلق، عیاشی جیسی چیزوں نے جوانوں کی زندگی کا محور ہی بدل دیا ہے اور ان میں حد سے زیادہ انحراف پیدا ہو گیا ہے۔ شادی بیاہ کی تعداد میں کمی، گھریلو اختلافات کی کثرت، طلاق کی بہتات سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی دنیا میں خانوادے کی بنیاد متزلزل ہو چکی ہے۔

ویل ڈورانٹ (WELDORANT) لکھتا ہے، چونکہ جدید معاشرے میں عورت و مرد کی شادی صحیح معنی میں نہیں ہوتی کیونکہ زیادہ تر شادیاں محبّت کی بنا پر ہوتی ہیں باپ کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا اسی لئے بہت اختلاف ہو جاتا ہے۔ اور طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ اور پھر عورت و مرد جو کامل طور سے دو الگ الگ جزو ہیں اپنی اپنی جگہ پریشان ہوتے ہیں اور عموماً مرد اپنے کو غرق مے ناب کر دیتا ہے اور دادِ عیش دینے لگتا ہے۔ ہر روز نئے چہرے کو دیکھتا ہے۔

---

[1] سورہ نور آیت ۳۲۔

غور و فکر کے بعد ہر انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بیوی کے انتخاب میں ہمارا دخل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ماں باپ ہی اس کام کو بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔

آج کل جدید نظام کی دین یہ بات بھی ہے کہ ہمارے بڑے بڑے شہروں میں تشکیل خانوادے کا مسئلہ رُو بزوال ہے۔ شادی جو (عموماً) مرد کو ایک بیوی پر قناعت کر لینے کو بتاتی ہے اس کی اہمیت ختم ہو گئی ہے اور حصولِ لذت کی خاطر تعداد ازواج کا مسئلہ روز افزوں رو بترقی ہے۔ مرد تو خیر اپنی آزادی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کرنا چاہتا ہی ہے لیکن عورت بھی اس کی تائید کرنے لگی ہے کیونکہ تنہائی میں پڑا رہنا جہاں کوئی ہمراز نہ ہو، دمساز نہ ہو اس سے بہتر تو شمعِ محفل بن جانا ہے۔ اسی لئے عورت بھی تاکید کرنے لگی ہے۔

بہت جلد جدید شادی بیاہ کی صورت میں عظیم تغیّر ہونے کی توقع ہے کیونکہ جب مرد عورت کو شادی سے پہلے آزمائے گا اور اس کے بعد شادی کرے گا تو پھر طلاق بکثرت ہونے لگے گی، گھروں کی بربادی شروع ہو جائے گی، شہروں کا سکون غارت ہو جائے گا[1]

اسی زمانے میں جو لوگ بڑے زور شور سے مغربی عورت کی آزادی سے بحث کرتے ہیں وہ لوگ عورت کے بارے میں اس زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے اسلامی انقلاب سے بے خبر ہیں۔ اگر کوئی شخص اسلام کی رُوح اور اسلام کی تاریخ پر نظر کرے گا اس کو پتہ چل جائے گا کہ مغربی تمدّن نے عورت کے سلسلے میں اسلام سے زیادہ کوئی نمایاں انقلاب نہیں پیدا کیا۔ ہاں مغرب نے بے راہ روی، بداخلاقی، غلط آزادی ضرور عورت کو بخشی ہے۔

لیکن اسلام بداخلاقی، فساد، لاابالی پن سے روکتا ہے۔ لیکن کیا ان چیزوں سے

---

[1] لذات فلسفہ۔

عورت کو روکنا عورت کی ترقی کی راہ میں عظیم رکاوٹ ہے؟ کون سی چیز عورت کی شخصیت کو آبرومند بناتی ہے اور اس کو ترقی عطا کرتی ہے۔ سوچئے کے بعد خود بخود یہ گتھی سلجھ جاتی ہے۔

اسلام کا نظریہ ہے کہ خدا نے عورت و مرد کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ انسانی مدارج عالیہ اور روحانی کمالات حاصل کریں برخلاف تحریف شدہ توریت و انجیل کے کیونکہ یہودی وعیسائی کہتے ہیں: ہزار آدمیوں میں ایک آدمی خدا کا محبوب پیدا ہوتا ہے لیکن پوری دنیا میں کوئی عورت ایسی نہیں ہے جس پر لطف و کرم الٰہی کی بارش ہو سکے۔ [1]

اور اسلام کھلے عام یہ اعلان کرتا ہے کہ مرد و عورت کو ایک دوسرے پر کسی قسم کا امتیاز نہیں ہے فضیلت و امتیاز کا دارومدار سب کے لئے — خواہ مرد ہو یا عوت — تقویٰ و پرہیزگاری اور حسن عمل ہے قیامت میں ہر شخص اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائے گا یعنی بخشش و جزا کا مژدہ دونوں کے لئے ہے۔

سورہ نحل آیت ۹۹ میں ارشاد ہوتا ہے: ہر اچھا کام کرنے والا مومن — خواہ مرد ہو یا عورت — کو پسندیدہ زندگی دوں گا۔ اور اچھے کاموں کی بہترین جزا دوں گا۔

اسلام کی نظر میں عورت و مرد ایک دوسرے کو مکمل کرنے والے ہیں، خوش مزاجی سختی اور دیگر صفات ایک کو دوسرے پر فوقیت عطا کرنے والی نہیں ہیں۔ سورہ آل عمران آیت ۱۹۴ میں ہے: خدا نے ان کی دعا کو قبول کر لیا اور کہا: میں تم میں سے کسی کی — خواہ وہ مرد ہو یا عورت — نیکی کو ضائع و برباد نہ کروں گا، تم لوگ ایک دوسرے سے ہو۔

بہت سی عورتیں فضائل نفسانی اور عقل کی اطاعت کی بنا پر انسانیت کے

---

[1] تمدن اسلام و عرب صفحہ ۵۱۹ نقل از کتاب مقدس۔

مدارج عالیہ پر فائز ہیں اور بہت سے مرد جذبات کے بندے ہو کر عقل کی مخالفت کر کے دنیا کے بدبخت ترین و شقی ترین ہو گئے ہیں۔ (کیونکہ ذاتاً کسی کو فضیلت نہیں فضیلت کا دارومدار اعمال پر ہے۔ مترجم)

طلوعِ اسلام کے بعد عورتوں کی شخصیت میں اتنی ترقی ہوئی کہ وہ حکومت وقت کے رفتارِ عمل پر حق انتقاد رکھتی تھیں چنانچہ شیعہ سنی تاریخوں میں لکھا ہے: عمرؓ نے ایک دن مجمع کثیر کے سامنے منبر سے اعلان کیا جو شخص پانچ سو درہم "مہر السنتہ" سے زیادہ مہر معین کرے گا میں اس زیادتی کو لے کر بیت المال میں داخل کر دوں گا۔ منبر کے نیچے سے ایک عورت نے فوراً ٹوکا اور کہا تمہارا یہ حکم خدا کے حکم کے مخالف ہے قرآن کہتا ہے: جو مہر تم لوگ زیادہ دو اس کو واپس نہ لو[1] پس تم حکم خدا کے خلاف حکم دینے والے کون ہو؟ کیونکہ خدا مہر السنتہ سے زیادہ لینے کی اجازت دیتا ہے اور تم منع کرتے ہو! یہ سن کر عمرؓ نے کہا مرد نے اشتباہ کیا عورت نے صحیح بات کہی (اس سے زیادہ آزادی عورت کو کس مذہب نے دیا ہے؟ مترجم) اسلام کے پہلے عورت کی جو حیثیت تھی اس کو نظر میں رکھتے ہوئے سوچئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے عورت کی شخصیت کو کتنا بلند کر دیا! اب عورت کو یہ حق ہے کہ مجمع عام میں خلیفہ وقت کو ٹوک دے اور اس کو مجبور کر دے کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور اپنے ارادے سے صرف نظر کر لے۔

جی ہاں یہ اسلام ہی تو ہے جس نے مردوں کو "عورتوں کی آقائیت" کی منزل سے نیچے کھینچ لیا اور عورتوں کو کنیزی سے نجات بخشی اور مرد و عورت کو مقامِ انسانیت برابر لا کھڑا کیا۔

بشریت اور حقوق بشریت کے لحاظ سے مرد و عورت میں مساوات ایک

---

[1] سورہ نساء آیت ۲۰۔

فطری و طبعی چیز ہے لیکن ذات و ماہیت، وظیفۂ زندگی اور اس کے راستے میں مساوات یا مساوات مطلقہ یہ صرف خیالی چیز ہے خارجی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اور اسلام نے چونکہ فطرتِ بشری کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر قانون بنایا ہے۔ اس لئے جہاں پر عورت و مرد میں مساوات فطرت و طبعیت کے مطابق ہے وہاں تو اس نے مساوات قرار دیا ہے لیکن جہاں پر دونوں میں تفاوت ہونا چاہئے وہاں فرق کا قائل ہوا ہے۔

۱۵۸۶ء میں فرانس کی دینی کانفرنس نے بحث و نظر کے بعد عورت کے لئے طے کیا: عورت انسان تو ہے مگر مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ کچھ مدّت پہلے یورپ کے متمدن ممالک عورت کو مالکیت اور تصرف در املاک کے حق سے محروم رکھتے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں انگلینڈ کے اندر جو قانون بنایا گیا اس میں عورتوں کو ملک کے افراد میں شمار نہیں کیا گیا تھا، حد یہ ہے کہ جسم پر موجود لباس کا بھی عورت کو مالک نہیں مانا گیا تھا۔ ہنری ہشتم کے ایک فرمان کے مطابق انگلستان میں عورتوں کو کتاب مقدس کے مطالعے سے روک دیا گیا تھا۔[1] ۱۸۸۲ء میں برطانیہ کے اندر ایک قانون بنایا گیا جس کی بناء پر عورتوں کو کچھ حق دیا گیا تھا وہ قانون یہ تھا کہ اپنی کمائی ہوئی دولت عورت خود خرچ کر سکتی ہے وہ مجبور نہیں ہے کہ اپنی آمدنی عورت کے سپرد کر دے۔

لیکن اسلام نے چودہ سو سال پہلے عورت کا اقتصادی استقلال، حقِ مالکیت اور جملہ مالکانہ تصرفات مرد کی ماتحتی کے بغیر خود عورت کے سپرد کر دیا تھا اور عورت کو یہ حق دیا گیا کہ تجارت، ہبہ یا دوسرے ذرائع سے جو اس کی آمدنی ہو اس میں شوہر یا کسی دوسرے شخص کی اجازت کے بغیر ہر طرح کا حق تصرف اسے حاصل ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ چیز بھی اسلام کے مفاخر میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ قرآن اعلان

---

[1] رُوح الدین الاسلامی صفحہ ۲۳۱

کرتا ہے، مرد اپنی آمدنی سے اور عورت اپنی آمدنی سے فائدہ حاصل کر سکتی ہے[1]

حق مالکیت کے علاوہ زندگی کے حساس ترین اور اہم ترین مسئلے یعنی شادی بیاہ ـــــ میں اسلام نے عورت کو استقلال و آزادی بخشی ہے۔ اور کلّی طور پر عورت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شریک زندگی کو خود منتخب کرے۔ یورپ میں کچھ مدت پہلے ضرورت مجبوری کی بنا پر عورتوں کے جو حقوق مانے گئے ہیں اسلام نے صدیوں پہلے وہ حقوق عورت کو دے دئے تھے اور اس میں ضرورت یا مجبوری کو دخل نہیں تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے زندگی میں پیش آنے والی ہر مشکل کا حل اسلام نے بہت خوبصورت طریقے سے کیا ہے۔

آج اگرچہ مشرق میں بہت سی عورتوں کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے مگر یہ نقص اسلامی قانون کی بنا پر نہیں ہے بلکہ سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور غیر اسلامی نظام جو اسلامی معاشرے پر حاکم ہے اس کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا ان کوتاہیوں کی تلاش اسلام میں نہیں بلکہ دوسری جگہوں پر کرنا چاہئے۔

سرزمین مشرق میں عمومی فقر بھی عورتوں کے مشکل ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ اجتماعی مظالم نے ایک گروہ کو جہاں دولت و نعمت سے نوازا ہے وہاں دوسرے طبقے کو بدبختی اور گرسنگی کا شکار بنایا ہے۔ انھیں مظالم نے مردوں سے بھی تاب و مقاومت چھین لی ہے اور انھیں مجبوریوں کا نتیجہ ہے کہ عورت اپنے سارے غصّے کا اظہار شوہر کے ظلم و جور کو روکنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ عورت کو یہ خطرہ ہے کہ کہیں حالات اتنے نہ بگڑ جائیں کہ وہ شوہر سے بھی جدا ہو جائے اور کوئی قرابت دار اس کی کفالت بھی نہ کر سکے یہ بات اپنی جگہ پر طے ہے کہ فقیر و محروم معاشرہ اخلاقی فضائل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اور انسانی فضائل کو کھو دیتا ہے۔ ظلم و بے انصافی اخلاقی فضائل کی جگہ لے لیتی ہے۔

---

[1] سورہ نساء آیت ۳۲۔

پس عورتوں کی زبوں حالی میں سب سے بڑا مسئلہ یہی فقر ہے۔ اور اس میں کبھی شک نہیں ہے کہ ان ساری بدبختیوں کا ذمہ دار اسلام نہیں ہے اور نہ یہ تیرہ سامانی اسلام کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

اسلام تو ایسا نظام ہے جو فقر و نا انصافی سے مقابلہ کرتا ہے۔ دولت کو لوگوں کے تمام طبقات میں عدالت کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے۔ اسراف و تجمل کو حرام قرار دیتا ہے۔ طبقاتی فاصلوں اور اجتماعی مظالم کو ختم کرتا ہے۔ اسلام اجتماع کو اتنا موقع ہی نہیں دیتا کہ وہ مرد کو اپنے ناکامی و محرومیت کے شکنجے میں کس لے تاکہ اس کے نتیجے میں مرد اپنی ذہنی و قلبی گتھیوں کو سلجھانے کا علاج زن و فرزند پر ظلم کی صورت میں خیال کرنے لگے۔ اور فقر و فاقہ کے ڈر سے عورت بھی اپنے حقوق کے مطالبے سے صرف نظر کرے۔ کیا کوئی منصف مزاج اور عقل مند انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ جن حالات کی بنا پر مجبور ہو کر مرد اپنے اہل و عیال پر ظلم کرتا ہے وہ حالات اسلام کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔؟

کیا اسلام کا دستور تہذیبِ نفس، رعایت عدالت، لوگوں سے محبّت خصوصًا افراد خاندان سے محبت پر استوار نہیں ہے؟ یہ وہی اسلام تو ہے جس نے عورت کو اس معراجِ ترقی پر پہونچایا اور معاشرے میں اس کی حیثیت متعین کی۔

اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ آج کی متمدن دنیا کی نظر میں عورت کی کیا قدر و قیمت آج کے تمدّن نے عورت کی کوئی اہمیت نہیں بڑھائی بلکہ ضرورت سے زیادہ سے زیادہ انحطاط پیدا کر دیا ہے کیونکہ آج کی دنیا میں عورت صرف مرد کے شہوانی جذبات کے تسکین کا ذریعہ ہے اور عورت ہی کے ذریعے مختلف تبلیغات ہوتے ہیں مثلاً سینما ٹیلی ویژن وغیرہ میں عورتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ آج عورت کی شہرت و شخصیت کا دار مدار اخلاقی فضائل اور علم و دانش پر نہیں ہے۔ متقی عورتیں زیادہ تر گمنام ہیں۔ احترام و شہرت تو اُن عورتوں کے لئے ہے جنھوں نے اپنے کو "ہنر مند" کے نام سے مشہور کر رکھا ہے۔

اور جو معاشرے میں کوئی بھی مثبت اقدام نہیں کر سکتیں وہ تو بس آوارگی، دہرزگی کا مظاہرہ کرنا جانتی ہیں۔

ایک امریکی دانش مند جذبات پرستی اور فکری اجتماع کے انحرافات کو اس طرح ذکر کرتا ہے آج کی دنیا میں برہنہ سینہ دکھانے والی عورت ایک ملیون ڈالر کماتی ہے۔ اور وہ مرد جو ایک گھونسے سے کسی کی جان لے سکتا ہے صرف آدھا ملیون ڈالر کماتا ہے۔ اور وہ شخص جو ملیونوں انسان کی نجات کے لئے اپنے بال سفید کر لیتا ہے اس کی درآمد مرنے کے لئے زیادہ اور زندگی کے لئے کم ہے۔

پروفیسر البرٹ کانلی (PROFESSOR ALBERT CONNOLLY) لکھتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں جب عورتیں پارلیمنٹ میں داخل ہونے کے لئے جنگ کر رہی تھیں اور اس وقت قید و موت تک سے نہیں ڈرتی تھیں اس وقت کسی کو بھی احساس نہیں تھا کہ آدھی صدی کے بعد ان کا مطالبہ آزادی ان کی پوتیوں اور نواسیوں کے ہاتھوں اتنی متبذل شکل اختیار کر لے گا کہ جس سے عورت کی شخصیت اور اس کا اجتماعی مقام بالکل متزلزل ہو جائے گا۔

آج اگر وہ عورتیں زندہ ہوتیں تو ان کو اپنی آزادی کی واپسی اور پارلیمنٹ سے محرومیت کا مطالبہ قطعی طور پر کرنا چاہئے کیونکہ پچاس سال کے تجربے نے بتایا آزادی حاصل کر کے عورتوں کو کچھ ملتا تو کیا انھوں نے اپنی سابقہ ساکھ کی بھی قربانی دے دی[1]

---

[1] روشن فکر شمارہ ۸۲۹

طلاق در اسلام

سب سے پہلے تو یہ جان لینا چاہئے کہ طلاق وجدائی ایک غیر فطری اور سُنن آفرینش کے خلاف ہے جس معاشرے میں طلاق کی کثرت ہو جائے اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ معاشرہ فطری زندگی کے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ علم حقوق کے علماء نے زن و شوہر کے تعلقات کو خصوصی مرکزِ توجہ بنایا ہے اور اظہارِ نظر بھی فرمایا ہے۔ اور چونکہ طلاق کی وجہ سے خاندان پر بُرا اثر پڑتا ہے، گھر کا ماحول منقلب ہو جاتا ہے، بچے مختلف قسم کے ذہنی و روحی مفاسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے بہت سے علم الاجتماع کے ماہرین کی رائے ہے مجبوری کے علاوہ طلاق کو ہر صورت میں ناجائز قرار دے دینا چاہئے اور اس سلسلے میں سختی سے کام لینا چاہئے تاکہ کوئی شخص طلاق کا اقدام ہی نہ کر سکے۔

علم الاجتماع کے ماہرین کی رائے مناسب صحیح مگر بعض موقعوں پر اخلاقی یا روحی لحاظ سے طلاق ناگزیر بن جاتی ہے ایسی صورت میں طلاق نہ دینا تباہی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، ذرا سوچئے! اگر شوہر و زوجہ کے حالات میں بہتری کی کوئی صورت ممکن ہی نہ ہو تو اس وقت کیا کرنا چاہئے؟ کیا اس وقت خانوادے کو آگ کی طرح جہنم میں جلنے دیا جائے یا ایسی صورت میں اس مسئلے کا حل طلاق کی صورت میں کرنا چاہئے تاکہ وہ لوگ داخلی کش مکش اور ذہنی تکلیف سے نجات حاصل کر سکیں؟ اب ان دونوں راستوں میں کونسا راستہ اس دوزخ سے بچانے کیلئے استعمال کرنا چاہئے۔؟

اِس قسم کے مواقع پر اسلام نے مخصوص شرائط کے ساتھ طلاق کو جائز قرار دیا ہے تاکہ خانوادے کو اِس دوزخ سے بچایا جا سکے برخلاف مسیحیت کے کہ اس نے ایسی صورت میں بھی طلاق کو جائز نہیں سمجھا بلکہ طلاق کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔!

ایسی صورت میں طلاق دے دینا ہی بہتر ہے کیونکہ طلاق نہ دینے کی صورت میں اختلاف کم ہونے کے بجائے بڑے ازدواجی زندگی بہرحال نہیں بسر ہو سکے گی لہٰذا اِس موقع پر حقیقت کو تسلیم کر لینا ہی چاہئے اور حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز کا ارتکاب کر لینا ہی بہتر و مناسب ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ طلاق کے بعد مرد و عورت کے ذہن بدل جائیں اپنے کئے پر نادم ہوں اور از سرِ نو زندگی کی گاڑی کو کھینچنے پر متحد ہو جائیں تو ان کے لئے اسلام نے اس کی گنجائش رکھی ہے کہ عدّہ کے زمانے میں رجوع کر سکتے ہیں۔

اسلام کی نظر میں بقائے زوجیت اور استحکام خانوادہ نہایت ضروری چیز ہے اسی لئے نظام خانوادے کو محفوظ کرنے کی خاطر بعض قسم کی آزادیوں پر پابندی لگا دی ہے اور طلاق کے مسئلے میں عورت کے اختیار مطلق کو سلب کر کے محدود اختیار دے کر عورت کے مصالح کو محفوظ کرنا چاہا ہے۔ کیونکہ اگر مرد و عورت دونوں کو طلاق کا اختیار دے دیا جائے تو احتمال طلاق دوگنا ہو جائے گا اور ایسا رشتہ جو دونوں طرف سے ٹوٹ جانے والا ہو طرفین کے اعتماد کو متزلزل کر دے گا۔ لہٰذا یہ حق کسی ایک ہی کے ہاتھ میں ہونا چاہئے اور چونکہ انتخاب شوہر میں عورت کو کلی اختیار دیا گیا ہے اس لئے طلاق میں بربنائے انصاف مرد کو یہ اختیار ملنا چاہئے اور اسلام نے یہی کیا بھی ہے۔

مرد اور عورت کی جسمانی ساخت ایک کو دوسرے سے جُدا کرتی ہے اور دونوں کے فطری خصائص بھی الگ الگ ہیں چنانچہ مرد میں قوّتِ فکریہ کا غلبہ ہے۔

لیکن عورت کے اندر "احساس و عاطفہ" کو غلبہ حاصل ہے چنانچہ ڈاکٹر آلکیس کارل (DR. ALEKASE KARAL) کہتا ہے: مرد و عورت کے بدن اور بدن کے تمام اجزار خصوصاً اعصابی سلسلے اپنے اپنے جنس کی نشان دہی کرتے ہیں اس لئے تعلیم و تربیت کے ماہرین کو مرد و عورت کے عضوی اختلاف اور ان کے فطری وظائف کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ اس اساسی نکتہ کی طرف توجہ ہمارے آئندہ تمدن کے بنیادیں کافی اہمیت رکھتی ہے اور کسی بنیادی اور اہم نکتہ کی طرف توجہ نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کی ترقی کے طرفدار مرد و عورت کے لئے ایک قسم کی تعلیم کے بارے میں سوچتے ہیں اور دونوں کے مشاغل و اختیارات اور عہدے بھی ایک ہی قسم کے چاہتے ہیں [1]

مندرجہ بالا تحریر عورت و مرد کے حقوق و وظائف و ذمہ داریوں کے اختلاف پر اچھی خاصی روشنی ڈالتی ہے اسی دقیق حساب کی بنا پر اسلام نے حکم دیا ہے کہ "طلاق کا اختیار مرد کو ہے" [2]

عورت کا ظرف و مزاج ـــــ جو سراپا ہیجان و تلوّن ہے ـــــ اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ضروری اور مشترک زندگی کے بقار کے عدم امکان کی صورت میں عورت اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اپنے حق سے استفادہ کر سکے بلکہ معمولی بہانہ بھی اس کو مشترک زندگی کے خاتمے پر اور خانوادے کے سکون کو غارت کر دینے کے لئے کافی ہے۔

جس طرح اسلام نے تشکیل خانوادے کے لئے قسم قسم کی سہولتوں کو مہیّا کیا ہے اور اس میں پیش آنے والی مشکلات و رکاوٹوں کو ختم کیا ہے اسی طرح طلاق دینے اور خانوادے کے سکون کو غارت کر دینے کے لئے بہت زیادہ سختی برتی ہے اسلام

---

[1] انسان موجود ناشناختہ صفحہ ۸۴ تا ۸۷ [2] جواہر کتاب الطلاق۔

کسی بھی قیمت پر رشتۂ ازدواج کو توڑنے اور گھر کے سکون کو درہم برہم کرنے پر تیار نہیں ہے اسلام کا مطمح نظر یہ ہے کہ تمام خانوادے امن وامان سے رہیں دلوں کو سکون رہے مرد وعورت ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کریں اسی لئے ابتدائی ہی مرحلے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دیتا ہے کہ عقد نکاح مضبوط سے مضبوط تر ہو، ہاں اگر اصلاح سے مایوس ہو جائے تب بات اور ہے۔ چنانچہ ایک طرف مردوں کو مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے: عورتوں کے ساتھ شائستگی کے ساتھ زندگی بسر کرو اگر ان سے کراہت محسوس کرتے ہو (تو یہ جان لو کہ) خدا نے بہت سی ایسی چیزوں میں بہت زیادہ خیر وخوبی قرار دیا ہے جس کو تم مکروہ سمجھتے ہو[1]

درحقیقت نفرت وکراہت کے شعلوں کو خاموش کرنے کے لئے اور ناراضی کو دور کرنے کے لئے مردوں کے وجدان کو بیدار کرنے کے لئے اسلام مردوں کو اس امر مکروہ پر صبر وشکیبائی کی تلقین کرتا ہے کہ جن عورتوں کو ناپسند کرتے ہیں ان کو چھوڑ نہ دیں۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ ان عورتوں کے وجود ہی میں خیر وبرکت ہو اور لوگ اس سے غافل ہوں۔ اور انھیں عورتوں کو ناپسند کرنے کے باوجود جدا نہ کرنے سے خیر وبرکت کے دروازے کھلتے ہوں۔ اور دوسری طرف عورتوں کو مخاطب کر کے سفارش کرتا ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے اعتنائی کا خطرہ ہو تو ان کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اپنے بعض حقوق کو معاف کر کے صلح و آشتی کی فضا پیدا کر لیں اور بعض حقوق کو معاف کر کے صلح کر لینا طلاق سے بہتر ہے[2]

پیشوایان اسلام نے بھی طلاق کو نہایت ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے اور مختلف بیانات سے اس کی مذمت کی ہے چنانچہ معصوم کا ارشاد ہے: جو عورت بغیر کسی اہم ضرورت کے اپنے شوہر سے طلاق مانگے تو خدا اس کو اپنی رحمت وعنایت سے محروم کر دے گا[3]

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۹ [2] سورہ نساء آیت ۱۲۸ [3] مستدرک جلد ۳ صفحہ ۲۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: شادی کرو مگر طلاق نہ دو کیونکہ طلاق عرشِ الٰہی کو ہلا دیتا ہے[1] اسلام نے مردوں کو حق طلاق تو ضرور دیا ہے مگر اس اختیار سے غلط فائدہ حاصل کرنے پر پابندی لگا دی ہے اور اختیارات کو بھی مخصوص دائرے میں محدود کر دیا ہے (مثلاً) مرد ظلم و ایذا کی نیّت سے عورت کو طلاق نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اگر طلاق سے مفاسد و خطرات کا یقین ہو تو طلاق کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے جو شرائط و قیود طلاق کے لئے معین کر دئے ہیں وہ طلاق کی قلّت کے اہم اسباب ہیں۔

عورت و مرد کے اختلاف کو دُور کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم گھریلو عدالت ہے اور یہ چیز اسلام کے ابتکارات میں سے ہے۔ ابھی تک مغربی ممالک میں اس قسم کا کوئی مؤثر حربہ کشیدگی دُور کرنے اور زن و شوہر میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے اب تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ اس گھریلو عدالت کا مطلب یہ ہے کہ عورت و مرد دونوں کی طرف سے ایک ایک ایسا آدمی منتخب کیا جائے جس میں حاکمیت کے سارے شرائط موجود ہوں پھر یہ دونوں مل بیٹھ کر تمام حالات میں غور و فکر کر کے ایک ایسا فیصلہ دیں جو دونوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: اگر ان کے اختلاف سے ڈرتے ہو تو ایک شخص مرد کی طرف سے حکم بنے اور ایک عورت کا قریبی رشتے دار حکم بنے۔ اگر یہ لوگ صلح کرنا چاہتے ہوں۔ خدا ان کے درمیان صلح قرار دے گا وہ حکیم و دانا ہے[2]

لیکن اگر اسباب طلاق بہت گہرے ہوں اور اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو پھر دونوں اپنا اپنا راستہ الگ کر لیں۔ لیکن عمومی عدالتوں کا ان مسائل میں دخیل ہونا بہت مضر ہے کیونکہ یہ بات ضرور تجربے میں آچکی ہے کہ عمومی عدالتوں کے دخل دینے سے میاں بیوی کے حالات اور زیادہ خراب ہو جاتے ہیں

---

[1] وسائل جلد ۳ صفحہ ۱۴۴ [2] سورہ نساء آیت ۳۵۔

کیونکہ عمومی عدالتوں کا فریضہ ہے کہ وہ خشک اور ناقابل جھکاؤ قانون کے ماتحت طرفین کی دلیلوں کو سُن کر فیصلہ کریں۔ اب جس کے دلائل مضبوط ہوں گے اس کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا وہ لوگ آتش اختلاف کو بجھانے کی کوشش نہیں کرینگے اور نہ اختلاف کے اسباب دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی خرابی اور بھی ہے کہ طرفین خالص گھریلو باتوں کو اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے بیگانہ افراد کے سامنے پیش کریں گے جس سے مرد و عورت کے احساس مجروح ہوتے ہیں ان کی شخصیتیں متاثر ہو جاتی ہیں اور پھر اختلاف کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتا ہے۔

طلاق کے شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ دو عادل شخصوں کے سامنے صیغہ طلاق جاری کیا جائے۔ طلاق پر دو[۲] عادل مسلمانوں کو گواہ بناؤ[۱]۔ اب اگر دو[۲] عادل شخصوں کے بغیر صیغہ طلاق جاری کیا گیا تو طلاق باطل ہے۔ طلاق میں دو[۲] عادل کی شرط کا فائدہ یہ ہے کہ جب اُن کے سامنے مسئلہ آئے گا تو وہ اپنے عادل ہونے کی وجہ سے اس بات پر مجبور ہیں کہ کوشش کر کے میاں بیوی میں اختلاف کو ختم کرا دیں۔ اور حتی الامکان طلاق نہ ہونے دیں۔ لیکن طلاق کے بعد اگر شوہر رجوع کرنا چاہے تو پھر رجوع کے لئے کوئی شرط نہیں ہے یہاں معاملہ طلاق کے بالکل برعکس ہے کیونکہ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اتحاد و اتفاق اور رشتۂ ازدواج کی بقاء میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہونی چاہیئے۔ اختلاف و جدائی کو دُور کرنے اور الفت و محبّت کو بحال کرنے کے لئے اسلام نے مختلف سہولتیں مہیّا کی ہیں۔

اس کے علاوہ ہر وقت دو[۲] عادل کا ملنا بھی ممکن نہیں ہے اس لئے حتی الامکان طلاق میں کمی ہوگی کیونکہ جب تک دو عادل کا تحقیق نہ ہو جائے مرد چاہنے کے بعد بھی طلاق

---

[۱] سورۂ نساء آیت ۲۵

نہیں دے سکتا اسی طرح طلاق کے لیے عورت کا حیض ونفاس سے پاک ہونا بھی
شرط ہے۔ بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں کہ مرد طلاق دینے پر آمادہ ہے لیکن عورت
کی ناپاکی اس ارادے میں حائل ہوجاتی ہے اور وہ ایک مدت کے لئے ٹل جاتا ہے
بہت ممکن ہے کہ اتنے دنوں میں حالات بدل جائیں اور مرد اپنے ارادے سے
باز آجائے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب مشترک زندگی مرد کے لئے مشکل ہوجائے
اور عورت سے بیزاری کی وجہ ہے مرد طلاق دینا چاہے تو طلاق کے بعد بھی رشتہ
ازدواج منقطع نہیں ہوتا اور میاں بیوی (شرعی طور سے) ایک دوسرے سے جدا نہیں
ہوتے بلکہ عدہ ختم ہونے سے پہلے جس وقت مرد چاہے پھر سے اس سلسلے کو دوام بخش سکتا ہے

آخری اقدام جو اسلام نے بقائے عقد کی خاطر کیا ہے وہ یہ ہے کہ طلاق
رجعی دینے کے بعد بھی مرد کا فریضہ ہے کہ عدت کے زمانے ـــــ یعنی تین ماہ و کچھ دن
تک عورت کو گھر سے نکال نہیں سکتا اور خود بھی کسی بہت ضروری امر کے بغیر گھر سے
باہر نہیں نکل سکتی، چنانچہ ارشاد ہے (زمانہ عدہ میں) عورتوں کو گھروں سے باہر نہ کرو
اور وہ بھی گھر سے باہر نہ نکلیں مگر یہ کہ کسی ناپسند امر کا ارتکاب کریں (تو پھر ان کو نکالا
جاسکتا ہے مترجم) یہ (احکام) خدا کے حدود ہیں اور جو شخص حدود الٰہی سے تجاوز
کرے گا وہ اپنے پر ظلم کرے گا۔ تم کو معلوم نہیں ہے شاید خدا اس کے بعد کچھ ظاہر
کرے[1]

تین مہینے اور کچھ دن کی مدت ـــــ جس میں عورت کو اپنے شوہر کے گھر
رہنا ہی چاہیئے ـــــ مرد کو طلاق دینے پر نادم وپشیمان بھی بنا سکتی ہے اور بہت ممکن
ہے کہ اس مدت میں محبت والفت پھر پیدا ہوجائے اور دوبارہ مرد ازدواجی زندگی

---

[1] سورہ طلاق آیت ۱۔

آمادہ ہو جائے۔ اسی بات کی طرف آیت قرآنی کا آخری حصّہ اشارہ کرتا ہے یعنی اس حکم کا فلسفہ کہ عورت عدّہ کے زمانے میں کیوں شوہر کے گھر پر رہے بیان کر رہی ہے۔

اور اس میں خوبی یہ ہے کہ عِدّہ رجعیہ میں رجوع کرنے کے لئے کسی خصوصی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مرد کی بقاء نکاح کی معمولی خواہش بھی اس بات کیلئے کافی ہے۔ رجوع میں اتنی سہولت دینی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام اتحاد خانوادے کو ہر قیمت پر باقی رکھنا چاہتا ہے اور طلاق و جدائی و انتشار کو سخت ناپسند کرتا ہے۔

اسی طرح خلع ـــــ یعنی عورت مرد کو ناپسند کرتی ہو اور مہر یا دوسرا مال دے کر شوہر سے جدائی حاصل کرلے ـــــ میں بھی یہ بات ملحوظ ہے کہ اگر عورت خلع لینے پر نادم و پشیمان ہو تو اپنے دئے ہوئے مال کو واپس لے کر پھر شوہر کے حق کو دوبارہ محفوظ کر دیتی ہے کہ وہ چاہے تو رجوع کرلے اور زندگی پھر پرانے ڈھرے پر چل نکلے۔

اسلام نے نکاح کے مقدّس رابطے کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے قوانین بنا کر ناقابل تصوّر حد تک رعایت دی ہے اور خانوادے کے اتحاد کو دوام بخشا ہے کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مختلف اسباب و عوامل کی بناء پر مالہ و ماعلیہ پر غور کرنے سے پہلے عجلت میں کوئی فیصلہ کر دیتے ہیں اور پھر بعد میں پچھتاتے ہیں اسی لئے طلاق کے لئے اسلام نے اتنے قیود و شرائط معین کر دئے کہ انسان جلدی سے فیصلہ نہ کر سکے اور اس کی وجہ سے حتمی طور پر طلاق کی تعداد میں کمی ہو گی۔

اِن تمام باتوں کے پیشِ نظر غیر متعصب و منصف مزاج آدمی یہ ماننے پر مجبور ہے کہ دنیا کے ہر نظام سے زیادہ اسلام نے حفظِ نکاح میں کوشش کی ہے اور مدعیانِ اسلام کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

جہاں عورتوں کے حقوق کو خطرہ لاحق ہو جائے وہاں اسلام نے عورت کی قانونی حمایت کی ہے اور ایسے مواقع کے لئے عورت کو راستے بتائے گئے ہیں تاکہ وہ ایسے حالات میں اپنے کو اس ماحول سے الگ کر سکے۔ مثلاً

۱۔ نکاح کے وقت عورت مرد سے شرط کر سکتی ہے کہ اگر مرد نے اس کے ساتھ ناروا سلوک کیا، یا نان و نفقہ میں کوتاہی برتی، یا مسافرت کی یا دوسری شادی کی، تو وہ خود وکیل یا وکیل در وکیل ہو کر مرد سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔

۲۔ امور جنسی کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لے تاکہ شوہر خود ہی اس کو طلاق دے دے۔

۳۔ اگر شوہر نان و نفقہ نہ دے سکتا ہو، یا جنسی امور کی انجام دہی نہ کرے یا اس کے دیگر واجب حقوق کو پورا نہ کرے تو ایسی صورت میں عورت حاکم شرع سے رجوع کر سکتی ہے۔ اب اگر حاکمِ شرع کے سامنے عورت کا دعویٰ صحیح ثابت ہو جاتا ہے تو وہ شوہر کو عدالت، اتحاد، ادائیگی حقوق پر مجبور کرے گا اور اگر شوہر پھر بھی نہیں مانتا تو حاکم شرع اس کو طلاق پر مجبور کرے گا اور اگر شوہر پھر بھی نہیں مانتا تو حاکمِ شرع اس کو طلاق پر مجبور کرے گا (اگر طلاق بھی نہ دے تو حاکمِ شرع خود طلاق جاری کر دے گا۔ مترجم)

۴۔ اگر شوہر عورت پر زنا کا الزام لگائے اور بچے کا انکار کر دے کہ یہ میرا نہیں ہے تو عورت کو حق ہے کہ عدالت شرعیہ کی طرف رجوع کرے اگر شوہر اپنے دعوے کو ثابت نہ کر سکے تو مخصوص شرائط کے ساتھ قاضی کے حکم سے دونوں میں جدائی ہو جائے گی۔

۵۔ اگر میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے متنفر ہوں تو یہاں بھی بہت آسانی سے جدائی ممکن ہے اس طرح کہ عورت اپنے مہر کو ختم کرے اور مرد زمانۂ عدہ

کے مصارف سے معاف کیا جائے تو ایسی صورت میں بھی عورت مہر کا مطالبہ کئے بغیر اور شوہر زمانۂ عدّہ کا خرچ دئے بغیر آپس میں طلاق حاصل کر سکتے ہیں۔

۶۔ اگر شوہر مفقود الخبر ہو جائے اور عورت نفقہ یا دوسری باتوں کی وجہ سے سختی و پریشانی میں مبتلا ہو تو وہ حاکم شرع کی طرف رجوع کر سکتی ہے اور طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے اور حاکمِ شرع قانونی مراحل کو پورا کر کے طلاق دے سکتا ہے۔

اسلام نے جس طرح مرد کے تنفّر کی طرف توجہ دی ہے عورت کے تنفّر کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اسی لئے اگر عورت شوہر سے نفرت کرتی ہے اور اپنے کو کسی بھی طرح مشترک زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی تو شوہر کو مہر بخش کر یا کچھ دے کر طلاق پر آمادہ کر سکتی ہے۔ قرآن میں ہے۔ جو مال تم نے اپنی بیویوں کو دیا ہے اس کو واپس لینا تمھارے لئے جائز نہیں ہے مگر یہ کہ حدودِ خدا کے برقراری سے خوف زدہ ہو (اور نکاح کو باقی نہ رکھ سکتے ہو) ایسی صورت میں اس مال سے کچھ لے سکتے ہو اور طلاق دے سکتے ہو[1]

اس سے پتہ چلا کہ اسلام نے عورتوں کے احساسات کا بھی خاص خیال رکھا ہے اور اس کے لئے بھی تکلیف دہ زندگی سے چھٹکارا پانے راستہ کھول رکھا ہے جیسا کہ رسولؐ خدا کے زمانے میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا تھا۔ ابنِ عباس کہتے ہیں ایک دن "ثابت بن قیس" کی بیوی "جمیلہ" پریشاں حال پیغمبرؐ کی خدمت میں آئی اور عرض کرنے لگی خدا کے رسولؐ اب میں ایک منٹ بھی "ثابت" کے ساتھ زندگی نہیں بسر کر سکتی اور کسی قیمت پر ہم دونوں کا سر ایک تکیئے پر اکٹھا نہیں ہو سکتا اور اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگی کہ میری جدائی و طلاق کی خواہش "ثابت بن قیس" کے ایمان یا اخلاق یا کیفیت معاشرت کی کمی کی بناء پر نہیں ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ

---

[1] سورہ بقر آیت ۲۲۹۔

اگر میں طلاق نہ لوں تو کہیں کفر و بے دینی کی طرف مائل نہ ہوں۔ میرے نفرت کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اتفاقاً خیمے کا پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ثابت چند لوگوں کے ساتھ آرہے ہیں اور وہ سب میں سب سے زیادہ کالے، بدصورت، پستہ قد ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے کراہت محسوس ہونے لگی اور میرے دل میں نفرت پیدا ہوگئی اب میں کسی قیمت پر ان کے ساتھ زندگی نہیں بسر کر سکتی۔ پیغمبر اسلام نے اس کو بہت پند و نصیحت فرمائی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس وقت آپ نے ثابت کو بلا کر پورا قصہ سنایا۔ ثابت جمیلہ کو ضرورت سے زیادہ چاہنے کے باوجود اس تکلیف دہ بات پر تیار ہو گئے اور مہر میں جو باغ جمیلہ کو دیا ہے اس کو واپس لے کر طلاق دے دیں۔ مختصر یہ کہ اس طرح جمیلہ نے اپنے شوہر ثابت بن قیس سے طلاق خلعی حاصل کر لی [1]

اسلام میں بعض ایسے موارد بھی ہیں کہ جہاں پر مرد کو طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ خود عورت کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ عقد نکاح باطل قرار دیدے کچھ مقامات پر عدالتِ اسلامی کی طرف رجوع کرنے کے بعد عقد نکاح باطل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اور ایسے بھی مقامات ہیں جہاں عدالتِ شرعیہ کی طرف مراجعہ کئے بغیر بھی طلاق ہو سکتی ہے مثلاً اگر عورت یا مرد دیوانہ ہو جائیں تو دوسرے کو نکاح فسخ کر دینے کا حق ہے [2]

اسی طرح مرد کا خصی ہونا یا عنین ہونا بھی عورت کے لئے حق فسخ کو ثابت

---

[1] مجمع البیان جلد ۱ صفحہ ۱۶۷۔

[2] جرمنی و سوئزرلینڈ جیسے مغربی ممالک میں بھی دیوانہ ہونا عقد نکاح کے ختم کرنے کا سبب ہے لیکن بعض دوسرے یورپی ممالک میں جیسے فرانس کے اندر شوہر یا بیوی کا پاگل ہو جانا سبب طلاق نہیں ہے بلکہ اس پر لازم ہے کہ اپنے پاگل جیون ساتھی کو قبول کرے اور اسکے ساتھ زندگی بسر کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک چوتھی قسم کا حکم ہے لیکن اسلام نے ایسی صورت میں یہ حق دیا ہے کہ اگر جی چاہے تو پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرے اور نہیں جی چاہتا تو عقد کو فسخ کر کے اپنے کو آزاد کر لے۔

کرتا ہے۔ اسی طرح جبر و اکراہ بھی نکاح کے فسخ ہونے کا سبب ہے۔ دوسرے اور بھی مواقع ہیں جہاں پر بعض فقہاء نے حقِ فسخ کو مانا ہے ——

مغربی معاشرے کا سب سے بڑا دردِ سر ارکان خانوادے کا متزلزل ہونا ہے مغربی دنیا کی موجودہ آزادی و بے راہ روی کلیسا کی زبردستیوں کا ردِ عمل ہے کیونکہ عیسائی مذہب میں سرے سے طلاق کا وجود ہی نہیں ہے۔ کلیسا کی سختیوں سے مجبور ہو کر حکومتوں نے طلاق کو قانونی حیثیت دی مثلاً اکتوبر ۱۷۸۹ء کے انقلاب سے پہلے عیسائی مذہب کی بنا پر فرانس میں طلاق ممنوع چیز تھی۔ لیکن جدید مدنی حقوق کے تنظیم کے وقت ۱۸۰۴ء میں لوگوں کے دباؤ کی وجہ سے طلاق کو قانونی حیثیت دی گئی۔ لیکن اس پندرہ سال کے اندر —— جس میں طلاق کو قانونی حیثیت حاصل تھی —— بڑی سرعت کے ساتھ طلاق کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اور پھر کلیسا کے دباؤ میں آکر ۱۸۱۶ء میں قانونِ طلاق کو ختم کر کے "تفریق جسمانی" نام کے قانون کو نافذ کیا گیا۔ لیکن پھر لوگوں کا شدید دباؤ پڑنے پر حکومت نے مجبور ہو کر ۱۸۸۴ء میں محدود طریقے پر عورت و مرد کو قانوناً حقِ طلاق دیا۔ مندرجہ ذیل مقامات پر قانوناً عورت و مرد کو حق طلاق حاصل ہے۔

۱۔ اگر مرد یا عورت کسی ایسے جرم کے مرتکب ہو جائیں جس کی بنا پر قانوناً مندرجہ ذیل کسی ایک سزا کے مستحق ہو جائیں۔ پھانسی، حبس دوام، ملک بدری اجتماعی حقوق سے محرومیت، محنت شاقہ کے ساتھ وقتی قید۔

۲۔ دونوں میں سے کوئی زنا کا مرتکب ہو جائے لیکن عورت کو حق طلاق اس صورت میں ہو گا کہ جب مرد اس کے گھر میں زنا کا ارتکاب کرے۔ پولیس کی نظر میں مکمل طور سے یہ خیانت ثابت ہو۔ اس بنا پر جب میاں بیوی ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرنا چاہیں تو تیسرے فریق کے بھی موافقت کی ضرورت ہو گی

اس طرح کہ وقتِ معین پر سوتے وقت ـــــ شوہر پولیس کو لاکر دکھائے کہ میری بیوی دوسرے مرد کے ساتھ سو رہی ہے۔ پھر جب پولیس شوہر کے ساتھ آکر کسی غیر مرد کو سوتا ہوا دیکھے گی تب جاکر طلاق ہوگی[1]

ذرا سوچئے کہ حق طلاق کتنی بے حیائی کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ آج کی متمدن دنیا ایک طرف تو عورت کو اجتماعی و سیاسی امور میں شریک ہونے کا حق دلاتی ہے اور دوسری طرف اس کی عزت و شرف کو بازیچۂ اطفال بناتی ہے اور کسقدر بے حیائی کا مظاہرہ کراتی ہے۔

۳- شوہر یا عورت ایک دوسرے کو آزار پہنچائیں یا اہانت کریں، یا فحش کلامی کریں۔ اسی طرح کے دوسرے مواقع ہیں جہاں ایک دوسرے کو طلاق لینے کا حق حاصل ہے۔

موجودہ دور میں فرانس، پرتگال، اٹلی کے اندر "تفریق جسمانی" کا رواج ہے۔ تفریقِ جسمانی کا مطلب یہ ہے کہ علیحدگی چاہنے والے میاں بیوی الگ الگ وقتی طور پر زندگی بسر کریں۔ اس جدائی کی مدت زیادہ سے زیادہ تین سال ہوتی ہے اور اس مدت میں اگرچہ عورت جنسی آسودگی دینے سے اور مرد نان و نفقہ دینے سے معاف ہیں مگر دوسرے تمام آثارِ زوجیت باقی رہتے ہیں۔ اس مدت کے بعد بھی اگر عورت یا مرد مشترک زندگی بسر کرنے پر تیار نہ ہوں تو طلاق دی جائے گی۔

امریکہ نے عورت و مرد کو طلاق کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ آزادی دے رکھی ہے اس لئے وہاں طلاق بکثرت ہوتی ہے۔ یہ بے حساب آزادی اور مساوی طور سے مرد و عورت کو حق طلاق دینے کی وجہ سے ارکانِ خانوادہ تزلزل کے شکار ہو گئے ہیں اور اس کے تلخ ترین نتائج ظاہر ہونے لگے ہیں۔ عورتیں معمولی

---

[1] طلاق و تجدد صفحہ ۹۹

معمولی بہانوں سے جب جی چاہتا ہے مرد سے الگ ہوجاتی ہیں درحقیقت مغربی دُنیا خانوادے اور عورتوں کی خدمت کرنے کے بجائے جنایت کی مرتکب ہوتی ہے۔

جن ممالک میں عورتوں کو حق طلاق دیا گیا ہے ان کے اجمالی اعداد وشمار کو دیکھ کر ہر عقلمند انسان محو حیرت ہوجاتا ہے۔ عورتوں کی خواہش پر مغربی دنیا میں ہونے والی طلاقوں کی کثرت اور طلاق لینے کی دلیلوں کو دیکھ کر اسلام کی ژرف نگاہی روز روشن کی طرح آشکار ہوجاتی ہے۔ متمدن مغربی دنیا میں ہونے والی طلاقوں کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے ایک مشہور ہفتہ واری اخبار لکھتا ہے:

شہر اسٹراسبورگ میں ہونے والی چوٹی کانفرنس کے صدر نے مختلف ممالک میں ہونے والی طلاقوں کا اعداد وشمار افراد کانفرنس کے سامنے اس طرح بیان کیا۔

اس اعداد وشمار کے مطابق آخری ایک سال کے اندر فرانس میں ۲۷ فیصد طلاق عورتوں کی "مدپرستی" کے افراط کی وجہ سے ہوئی اور یہی تعداد جرمنی میں ۳۲ فیصد اور ہالینڈ میں ۳۶ فیصد اور سوئیڈن میں ۱۸ فیصد ہوئی۔

پیرس کی ہر عورت جو مدپرستی کی عادی ہوچاہے افراط کی حد تک نہ بھی ہو پھر بھی ایک سال کے اندر تقریباً پانچ ہزار تومان بیکار و بیہودہ مصرف میں خرچ کردیتی ہے۔

اور یہ کثیر رقم نہ تو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے اور نہ اسکی شخصیت کو بلند و بالا کرتی ہے اور نہ خانوادے کے فلاح و بہبود پر خرچ ہوتی ہے۔

براہ راست عورت کو حق طلاق دینے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ جب صرف ایک پرستی جیسی بے ارزش چیز کی وجہ سے اتنی طلاقیں ہوتی ہیں تو دوسرے اسباب کی بناء پر کیا عالم ہوگا۔؟

عورتوں کو حقِ طلاق دینے کے جو بُرے نتائج برآمد ہوتے ہیں انھوں نے ذمہ دارانِ حکومت میں عجیب وحشت پیدا کر دی ہے اب وہ لوگ اس کے محدود کرنے کے طریقے پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ گذشتہ سال فرانس میں تیس ہزار طلاقیں ہوئیں اور چونکہ ہر سال اس تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اس لئے فرانسیسی خانوادوں کے فیڈریشن نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ ۱۹۴۱ء کے مخصوص قانون کو جو ۱۹۴۵ء میں ختم کر دیا گیا تھا دوبارہ لاگو کیا جائے۔ اس قانون کے مطابق شادی سے تین سال تک کسی بھی وجہ سے طلاق نہیں دی جا سکتی اور نہ لی جا سکتی ہے۔ یہی قانون انگلستان میں بھی نافذ ہے صرف اس میں دو صورتوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

۱۔ مرد کی طرف سے فوق العادۃ سختی و وحشت گری۔

۲۔ عورت کی طرف سے خیانت اور بے اندازہ فساد[1]

امریکی دانش مند لوسون (LOSUN) تحریر کرتا ہے، جس کے اندر بھی ذرہ برابر انسان دوستی موجود ہے وہ اس وحشت ناک اعداد و شمار سے رنجیدہ ہے اور اس کے علاج کی فکر میں ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ۸۰ فیصد طلاق عورتوں کی خواہش سے واقع ہوئی اور ہو رہی ہے۔ کثرتِ طلاق کی علت بھی اسی جگہ سے تلاش کرنا چاہئے اور قطعی طور پر اس کو محدود کر دینا چاہئے[2]

یہاں پر معاشرے کے اندر (VOLTAIRE) کا قانون طلاق کے سلسلے میں اسلام کی جامعیت کے اعتراف کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے۔ وہ لکھتا ہے:

محمدؐ ایسے عقل مند واضع قانون ہیں جو بشریت کو جہل و فساد و بدبختی سے

---

[1] خواندن ہائے سال ۲۵۔ شمارہ ۱۰۳ [2] المرأۃ المسلمۃ محمد فرید وجدی۔

نجات دینا چاہتے تھے۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے انھوں نے دنیا کے تمام انسانوں ـــــ عورت مرد، چھوٹا بڑا، عاقل و دیوانہ، سیاہ و سفید، زرد و سرخ کے نفع کا خیال رکھا۔ انھوں نے تعدد ازواج کی اجازت ہرگز نہیں دی۔ بلکہ اس کے برخلاف ایشیائی ممالک کے حکمرانوں اور بادشاہوں کی بے حساب شادیوں پر پابندی لگا کر چار عورتوں تک محدود کر دیا۔ شادی بیاہ اور طلاق کے سلسلے میں ان کے قوانین سے بدرجہا بہتر ہیں۔ شاید طلاق کے سلسلے میں قرآن سے زیادہ مکمل قانون اب تک نہیں بنایا جا سکا۔[1]

---

[1] اسلام از نظر والٹیر۔

مُتعہ

اسلام یقینی طور پر سعادتوں اور خوش بختیوں کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلام لوگوں کو بلا اور بدبختی میں گرفتار کرنے کے لئے ہرگز نہیں آیا ہے اور نہ اس لئے آیا ہے کہ لوگوں کو مشکلات کے پیچ وخم میں پھنسا دے۔ زندگی کے کسی شعبے میں کمزوری کا پہلو نہیں لایا ہے۔ انسانی خوش بختی میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں معمولی فروگذاشت بھی نہیں برتی ہے اور اپنی انھیں گوناگوں خصوصیات کی بنا پر کامل ترین مذہب ہے۔

اسلام اپنے اندر اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے جملہ ضرورتوں کا مثبت جواب دے سکے۔ شادی بیاہ و تشکیل خانوادے سے متعلق قوانین اسلام کے ان عظیم قوانین میں داخل ہیں جس کا جواب دنیا کا کوئی مذہب نہیں پیش کر سکا۔ کلیسا کا صحیح رویہ شادی بیاہ کے مسئلے میں اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام جس قدر تشکیل خانوادے کو اہمیت دیتا ہے کلیسا ضرورت سے زیادہ سختی کر کے تشکیل خانوادے کو روکتا ہے۔ سابق عیسائیوں کی نظر میں تجرد ایک پسندیدہ اور شادی ایک ناپسندیدہ فعل تھا۔ دنیائے عیسائیت کے موجودہ رہبر بھی سابق لوگوں کی پیروی کر رہے ہیں واتیکان میں کچھ دنوں پہلے جو عظیم کانفرنس منعقد کی گئی تھی اس میں یہ مسئلہ بھی اٹھایا گیا اور طولانی بحث و مباحثہ و تبادل نظریات کے بعد مندرجہ ذیل نظریئے کو قبول کیا گیا: شادی بیاہ پہلے ہی کی طرح ناپسندیدہ فعل ہے اور کلیسا اس سلسلے میں کسی قسم کے درگزر

کا قائل نہیں ہے۔!

یہ بات بدیہی ہے کہ جب فطرت کے تقاضوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی اور اس فطری مانگ کا صحیح جواب نہ دیا جائے گا تو جنسی بے راہ روی کا ہونا ناگزیر ہو جائے گا۔ عیسائیت کا یہی غلط نظریہ دنیائے عیسائیت میں بہت سے مفاسد اور جنسی بے راہ روی کا سبب بنا ہے۔ کیونکہ عیسائیت کا آئیڈیل زندگی پر کسی قیمت پر منطبق نہیں ہوتا اور یہ ناقابل برداشت نظریہ جو لوگوں پر جبراً ٹھونسا جا رہا ہے بہتوں کے بس سے باہر ہے۔ اسی لئے بہت سے عیسائی پنجرے سے بھاگنے والے پرندوں کی طرح عیسائیت کے "شہوت کشی" سے بھاگ کر بغیر سوچے سمجھے بے لگام شہوت کے راستے پر لگ جاتے ہیں اور اپنی آزادی کو ثابت کرنے کے لئے ہر چیز کو روندتے چلے جاتے ہیں۔

اسلام کا لوگوں کو ابتدائے بلوغ سے ہی شادی کی تشویق دلانا درحقیقت اس جنسی قوت سے استفادہ کرنے کی دلیل ہے لیکن اسی کے ساتھ اسلام حیوانوں کی طرح اس قوت سے لطف اندوز ہونے کو منع کرتا ہے اور ایسے طریقے پر آمادہ کرتا ہے جو انسان کے لائق و سزاوار ہو۔

چونکہ بال بچوں سے محبت کرنا انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور انسانی فطرت کے اندر جنسی قوت کا وجود بھی ایک واقعی چیز ہے لہٰذا اسلام اس کا اعتراف کرتا اور اس قوت سے بھرپور لطف اندوز ہونے کی اجازت دیتا ہے اور لوگوں کے شادی بیاہ کو زینت تصور کرتا ہے "جنسی خواہش کی بنیاد پر عورتوں کو دوست رکھنے اور اولاد سے محبت کرنا انسانوں کے لئے باعث زینت قرار دیا گیا ہے"۔[1]

چودہ سو سال پہلے اجتماعی ضرورتوں کی بنا پر آج کی موجودہ عالمگیر فحاشی و بدکاری

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۱۲۔

کے خاتمے کے لئے اسلام نے نہایت ہی آسان وسادہ شرائط کے ساتھ متعہ کا قانون بنایا تھا اور اس طرح مفاسد کا خاتمہ کر کے بشریت کو فلاح و بہبود کی طرف دعوت دی تھی۔

اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں دیگر ناشائستہ افعال کی طرح فحاشی اور نامشروع جنسی روابط بھی ایک عام چیز تھی، کھلے عام فحاشی کے اڈے بنائے گئے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے اعمال واخلاق وافکار کی اصلاح اور جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لئے متعہ کا قانون بنایا اور اسی قانون کے زیر سایہ جنسی خواہش کو صحیح راستے پر لگایا۔ رسولؐ اسلام کی طرف سے ایک منادی کوچہ و بازار میں اعلان کر رہا تھا: لوگو رسولِ خدا نے تمہارے لئے متعہ کو جائز قرار دیا ہے۔ جنسی پیاس بجھانے کے لئے صحیح طریقوں کا استعمال کرو، بدکاری و جنسی راہ روی کو چھوڑ دو۔[1]

اس قانون کی بناء پر مرد و عورت نکاح دائمی کے بوجھ سے بچتے ہوئے محدود وقت کے لئے متعہ کر سکتے ہیں۔ اور مدت کے ختم ہونے تک زوجیت کی رعایت کی جائے گی۔

متعہ میں نہ تو توارث ہے اور نہ مرد و عورت کے خوراک، پوشاک، گھر کا ذمہ دار ہے لیکن حفاظتِ نفس کی خاطر نکاحِ دائمی کے جو اصول ہیں وہ سب متعہ پر لاگو ہیں۔ متاعی عورت واقعاً مرد کی بیوی ہے اور زوجیت کے سارے احکام اس پر نافذ ہیں۔ قرآن کہتا ہے: جن عورتوں سے متعہ کرو اُن کا مہر ادا کرو۔[2]

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اگر متعہ میں مدّت معین نہ کی جائے تو وہ نکاح دائمی شمار ہو جائے گا جو ہمیشہ باقی رہے گا اور اس کو ختم کرنے کے لئے طلاق جیسی چیزوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ لیکن چونکہ اس کی مدت معیّن ہوتی ہے

---

[1] وسائل ابواب متعہ۔ [2] سورہ نساء آیت ۲۸۔

اِس لئے اُس کو متعہ کہا جاتا ہے۔ نکاح و متعہ سے ہونے والی بیوی میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ متعہ محدود وقت کے لئے ہوتا ہے اور نکاح غیر محدود وقت کے لئے ہوتا ہے۔ اِسی طرح نکاحی اور متاعی اولاد میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ نکاحی بچّے کو جتنی قانونی، شرعی رعایتیں حاصل ہیں وہ سب متاعی بچّے کو بھی حاصِل ہیں۔

بدکاری کے عام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ نکاح نہیں کر سکتے کیونکہ شادی کی ذمہ داریاں خصوصاً مالی پریشانی، کمر توڑ خرچ ہر شخص کو تشکیں خانوادے کی اجازت نہیں دیتے اور یہ مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے۔

(اِسی طرح) تجارت، دفاعی و نظامی مقاصد، تحصیل علم، تفریح اور اسی قسم کی مختلف چیزوں کی انجام دہی کے لئے انسان کو مسافرت کرنی پڑتی ہے اور وطن سے دُور رہنا پڑتا ہے اور یہ چیز بھی یعنی سفر زندگی کی ضروریات میں داخل ہے۔ اب حالت سفر میں نکاح دائمی یا بال بچّوں کو ہر موقع پر ساتھ لئے رہنا مسافرت اور اکثر مقامات پر شخصاً بہت ہی دشوار بلکہ ناممکن ہے (ایسے موقع پر مُتعہ کے علاوہ کوئی بھی حل نہیں ہے مترجم) اس بات کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھئے کہ عموماً طولانی سفر کرنے والے نوجوان افراد ہوتے ہیں جو بھرپور جوانی سے مالا مال ہیں اور جنسی خواہش اُن کے یہاں عروج پر ہوتی ہے تو ایسی صورت میں متعہ کے علاوہ اِس مسئلے کا کوئی اور حل ہے۔؟

اسی لئے اگر نظم و ضبط کے ساتھ یہ اصلاح و مترقی قانون عمل میں لایا جائے اور صحیح طریقے سے اس کو استعمال کیا جائے تو انحرافات اجتماعی اور فحشاء و مفاسد کے خلاف بہترین ہتھیار ہے۔ اور اس طرح فساد و جسم فروشی کو روکا جا سکتا ہے عمومی اخلاق بہتر ہو سکتے ہیں اور بہت سی عورتیں جن کا دامن آلودہ ہے نجات پا سکتی ہیں۔

میں نے "صحیح طریقے سے استعمال" کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ کچھ نادان و آزاد

لوگ اس قانون سے غلط فائدے حاصل کرنے لگے ہیں اور پھر مخالفین و کوتاہ نظروں کی اس مسئلے کے خلاف بے بنیاد قسم کی تبلیغات نے مسئلے کی صورت ہی بدل دی ہے اور حقیقت کے بالکل برخلاف اس کا تعارف کرایا ہے۔ اگر متعہ کو ــــ جو ایک پاکیزہ شادی ہے ــــ گناہ کی اہمیت نہ سمجھنے والوں کے لئے استعمال کیا جائے تو صورت حال بالکل بدل سکتی ہے اور پھر قطعی طور پر جسم فروشی و بدکاری کو روکا جاسکتا ہے ــــ

صرف متعہ ہی کے لئے یہ بات نہیں ہے کہ لوگ اس کا غلط استعمال کرتے ہیں بلکہ لوگ تو ہر چیز کو غلط استعمال کرسکتے ہیں۔ ان باتوں کے لئے تہذیب روح اور لوگوں میں اخلاقی بلندی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اسلام نے لوگوں کے اخلاقی فضائل کی طرف بہت زیادہ توجہ دی ہے۔

ہر قانون کی خلاف ورزی کرنے پر کچھ نہ کچھ تادیب ہوتی ہے اس لئے قانونِ متعہ کی خلاف ورزی پر بھی تادیب ہونی چاہئے اور واقعی بات یہ ہے کہ بغیر تادیب کے متعہ کا فائدہ بھی حاصل نہ ہوسکے گا چونکہ یہ قانون اجتماع کے فائدے کے لئے ہے اس لئے مخالفت کی صورت میں حکومت کو دخل دینا چاہئے اور سرکشوں کو صحیح راستے کی طرف لگانا چاہئے تاکہ فردی و اجتماعی مصالح محفوظ رہ سکیں امام پنجمؑ نے حضرت علیؑ سے نقل فرمایا ہے: اگر خلیفہ دوم متعہ کو حرام نہ کرتے تو کمینہ و پست فطرت افراد کے علاوہ کوئی بھی شخص زنا کا ارتکاب نہ کرتا[1]

علماء و دانش مندان سُنی و شیعہ نے حضرت عمرؓ کا جو قول نقل کیا ہے اس میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ متعہ یقینی طور پر رسولِ خدا(ص) کے زمانے میں رائج تھا لیکن عمر نے نہ معلوم اسباب کی بناء پر اپنے دورِ خلافت میں یہ کہہ کر حرام قرار

---

[1] وسائل ابواب متعہ۔

دے دیا، دو متعہ جو رسولِ خدا (ص) کے زمانے میں رائج و مرسوم تھے، میں ان دونوں کو روکتا ہوں اور حرام کرتا ہوں جو بھی یہ کام کرے گا اس کو سزا دوں گا اور وہ دونوں متعہ ایک تو متعہ حج ہے اور دوسرا متعہ زنان ہے۔ اِس عبارت سے واضح ہے کہ عمرؓ نے اپنی شخصی رائے سے متعہ کو حرام قرار دیا۔ حالانکہ بہت سے اصحاب پیغمبرؐ نے عمرؓ کی بات پر کوئی اعتنا نہیں کی، اور برابر متعہ کو جائز و حلال سمجھتے رہے[1]

آج کی دنیا میں ہر طرف فتنہ اور آزاد روی ہے اور عصمت و عفت کے خلاف رسالے، روزنامے، شہوت کو اُبھارنے والی فلمیں، سنیمے، اور غلط قسم کی باتوں کو نشر کرنے والے ریڈیو، ٹیلی ویژن، عورتوں کی نیم عریانی، یہ ایسی چیزیں ہیں جو جوانوں کے اخلاق کو خراب کرنے والی ہیں۔ پاک دامن جوان ایک بند گلی میں پھنسے ہیں اسلامی قوانین سے ناواقف لوگ جو متعہ کے بارے میں غلط افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں اور نامعقول قسم کا شور و غل کرتے رہتے ہیں اس مشکل کا کیا حل پیش کریں گے۔؟

کیا سارے جوان اپنے نفس پر کنٹرول کر لیں گے؟ اور جوانی کی بدمستیوں کے سامنے سینہ سپر ہو سکیں گے؟ نفسِ امارہ کو عقل کا تابع بنا سکیں گے؟ چلئے تھوڑی دیر کے لئے ہم مان لیتے ہیں کہ سارے جوان اپنے نفس کو قابو میں کر لیں گے لیکن کیا اس سے مقصدِ خلقت فوت نہ ہو جائے گا؟ کیونکہ نسلِ انسانی میں قلت ہو گی نطفہ ہائے حیاتی بیکار ہو جائیں گے اور یہ سب روحِ اسلام کے منافی ہے کیونکہ قرآن مقدس نے اعلان کر دیا ہے: خداوند عالم نے دین (اسلام) میں دشوار اور ناقابل برداشت بوجھ تمھارے کندھوں پر نہیں ڈالا ہے[2]

اب حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد میں پوچھتا ہوں کہ متعہ کو ختم کر کے کیا تمام بداخلاقیوں کی اجازت دے دی جائے؟ اور ان مفاسد و بدبختیوں کو — جو آج

---

[1] مزید تفصیل کے لئے اہلِ سنّت کی کتب تفسیر، فقہ، حدیث کا مطالعہ فرمائیے۔ [2] سورہ حج آیت ۷۸

پورے معاشرے میں سرائیت کر چکی ہیں ـــــ اپنی تمام بے شرمیوں کے ساتھ رائج و عام کر دیا جائے؟ تاکہ بشریت دریائے شہوت میں ڈوب جائے اور ایک عام ہرج مرج پیدا ہو جائے؟ قرآن کہتا ہے: کیا اچھی چیزوں کو چھوڑ کر بُری باتوں کو اختیار کرو گے۔؟[1]

اور یا پھر متعہ کے قانون کو رائج کر کے ملیونوں مطلقہ، بن بیاہی، بیوہ عورتوں کو ـــــ جو پریشانی و عسرت کی زندگی بسر کر رہی ہیں ـــــ نجات دی جائے اور ان کی زندگی کی گاڑی پھر راستے پر لگ جائے۔؟

چلئے ہم مانے لیتے ہیں کہ یہ عورتیں اپنی عسرت و تنگ دستی کا علاج کر سکتی ہیں لیکن کیا یہ اپنے باطنی احساسات، اور روحانی جنبوں کی بھی تکمیل کر لیں گی؟ اور مردوں کی طرف فطری میلان اور علاقہ و وابستگی کا صحیح جواب دیا جا سکتا ہے؟ اگر فطری احساسات، جنسی شہوت کا صحیح تدارک نہ کیا گیا تو بہت ممکن ہے اس کی وجہ سے عورتیں تباہی و بربادی اور آلودگی کے راستے پر لگ جائیں۔

آج مغربی ممالک میں عورتوں اور مردوں کے درمیان متعہ کی جگہ عملی طور پر ناجائز "جنسی تعلقات" نے لے رکھی ہے۔ اور مغربی مفکرین اس وضع نکبت بار کے لئے ایک قانون کی ضرورت کا احساس کر رہے ہیں اور جواز متعہ کو معاشرے کے لئے ایک ضروری چیز سمجھنے لگے ہیں۔

انگریز فلسفی برٹرانڈ راسل (BERTRAND RUSSELL) لکھتا ہے: آج کی دنیا میں اجتماعی و اقتصادی مشکلات اور ضرورتوں نے ہمارے جوانوں کی شادی میں تاخیر پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ سو دو سو سال پہلے ایک طالب علم اٹھارہ بیس سال کی عمر میں اپنی تعلیم مکمل کر کے عین عنفوان شباب میں شادی کے لئے تیار

---

[1] سورہ بقر آیت ۶۱۔

ہو جاتا تھا۔ بہت کم ایسے لوگ تھے جو تیس چالیس سال محنت کر کے کسی فن میں اکسپرٹ ہو کر شادی کرتے تھے ـــــ لیکن آج کل بیس سال کے بعد (اگر اکسپرٹ ہو بھی گئے) تحصیلِ معاش کے چکر میں کافی وقت گزر جاتا ہے پھر شادی کی نوبت آتی ہے عموماً ۳۵ سال سے پہلے شادی بیاہ کی نوبت نہیں آتی، اسی لئے آج کل کے نوجوان تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اور شادی کرنے کے وقت تک زندگی کا حصّہ جو بہت ہی اہم ہوتا ہے مجبوراً جس طرح بھی ممکن ہو گزارتے ہیں۔ زندگی کے اس حصّے سے کسی بھی قیمت پر چشم پوشی نہیں کی جا سکتی، اگر ہم اس کے لئے کوئی فکر نہ کریں گے تو نسل، اخلاق، معاشرتی اصول سب میں فساد پیدا ہو جائے گا اسی لئے کچھ کرنا چاہئے مگر کیا کریں؟ اس مشکل کا حل صرف یہ ہے کہ عمر کے اس حساس حصّے کے لئے موقت شادی ـــــ متعہ ـــــ "لڑکیوں اور لڑکوں کے" کو قانوناً تسلیم کیا جائے جو عائلی زندگی اور نکاح دائم کے مشکلات کے زیر باری سے محفوظ ہو اور نہ صرف مختلف غلط اعمال اور نامشروع افعال اور گناہ سے محفوظ رکھے بلکہ بہت سی بیماریوں سے بھی محفوظ رکھے ـــــ

امریکہ یونیورسٹی کے استاد ویلیان وان لوم (VELYAN WAON LOME) تحریر کرتے ہیں کہ تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے نکاح کی عمر گزر جانے کے بعد مرد تازگی نشاط آور کی طرف مائل نہیں ہوتے اسی لئے جنسی انحرافات کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اعداد و شمار بتاتے ہیں ۳ سے ۶۵ فی صد شادی شدہ مرد اپنی بیویوں سے خیانت کرتے ہیں (یہ بات مغربی ممالک کے لئے ہے)

اس جنسی بے راہ روی کو ختم کرنے کے لئے اور نکاح کے مصارف کو سبک و ہلکا کرنے کے لئے مخصوص شرائط کے ساتھ جس مدت تک

۲۷۷

میاں بیوی تیار ہوں حکومت کو متعہ جائز قرار دینا چاہیئے[1]

---

[1] بہداشت ازدواج از نظر اسلام صفحہ ۱۷۸ -

تعدّدِ ازدواج

نظامِ اجتماع کے لئے بنائے گئے قوانین اسی وقت کامل و ترقی پسند و فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں جب انسانی فطرت کے مطابق ہوں اور بشری ضرورتوں کو مکمل طرح پورے کرتے ہوں۔ اور معاشرے کے تمام حالات قوانین بناتے وقت واضعِ قانون کے سامنے ہوں۔ اگر یہ صورت نہیں ہے تو پھر وہ قوانین شرمندۂ بقاء و دوام نہیں ہو سکتے۔

اسلامی قوانین دنیا کے کسی خاص طبقے یا جگہ کے لئے نہیں ہیں بلکہ یہ تمام دنیا کے لئے ہر زمانے اور ہر جگہ کے لئے ہیں اور نظامِ آفرینش کے عین مطابق بھی ہیں۔ اسی لئے ہر زمانے میں بشری تقاضوں کو پورا کرتے رہے ہیں۔ حوادثات کے مدوجزر میں مضمحل و نابود نہیں ہوئے۔ اور نہ نابود ہو سکتے ہیں بلکہ اس دنیا میں جب تک انسان موجود ہے یہ قوانین اپنی برتری اور قدر و قیمت منواتے رہیں گے۔

کلیسا اور مسیحی مبلغین کی اسلام کے خلاف مسئلہ "تعدّدِ ازدواج" کا غلط طریقے سے پیش کرنا بھی ہے۔ اس مسئلے کو آج کی دنیا میں محلِ بحث بنا دیا ہے اپنی کمزور و سست پوزیشن کو بچانے کے کلیسا ناواقف لوگوں پر ہزاروں تہمت و تبدیلیٔ حقائق کے ساتھ تعدد ازدواج کے مسئلے کو پیش کرتا ہے اور

یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ مسئلہ عورتوں پر ظلم وجور کے مرادف ہے۔ کیونکہ عیسائی مبلغین لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ مردوں کو جب دل خواہ کسی قید و بند کے بغیر عورتوں سے شادی کرنے کا اختیار ہے اور اپنی سختیوں کا پابند بنانے کا حق ہے ——

درحقیقت اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے حالانکہ ان لوگوں کے ذہنوں میں اس مسئلے کے خلاف دور از کار اور خلافِ انصاف باتیں موجود ہیں۔ لیکن اگر تعصّب کی عینک اُتار کر، واقع بین کے عنوان سے، عقل و منطق کی رُو سے، انسانی معاشرے کی فطرت میں غور کرے بے شمار واقعات و حادثات کو نظر میں رکھتے ہوئے، قوموں کی زندگی کے تغیرات اور تحولات کو دیکھتے ہوئے، اس اسلامی قانون کے بارے میں سوچا جائے اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے فیصلہ کیا جائے تو اس قانون کے اصولی و منطقی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہے گا ——

اسلام سے پہلے مختلف معاشروں میں بے حد و حساب عورتوں سے شادی کرنا ایک عام بات تھی۔ بلکہ بعض قوموں کے یہاں متعدد شادی کرنا بڑاپن کی دلیل تھا۔

گذشتہ انبیاء کی تاریخ اور موجودہ ادیان کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تعددِ ازواج کا مسئلہ اسلام سے پہلے مروج و مرسوم تھا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جس کو صرف اسلام نے ایجاد کیا ہو۔ مثلاً چین میں "لیکی" قانون کی بناء پر ہر شخص کو ۱۳۰ عورتوں سے شادی کا حق تھا اور یہودی قانون میں ایک مرد کئی سو عورتوں سے شادی کر سکتا تھا[1]

---

[1] حقوق زن در اسلام و اروپا۔ صفحہ ۲۱۵

اسی طرح "اردشیر بابکان" اور "شارلمانی" کے لئے لکھا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے حرم سرا میں تقریباً چار سو عورتیں تھیں۔

توریت ـــــ جو تعدد ازدواج کو جائز سمجھتی ہے ـــــ کے خلاف انجیل نے بھی کوئی آواز نہیں اُٹھائی بلکہ اس مسئلے میں خاموش ہے۔ اسی لئے آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک یعنی شارلمانی بادشاہِ فرانس کے زمانے تک مسیحی یورپ میں تعدّدِ ازدواج کی باقاعدہ رسم تھی اور کلیسا اس کی مخالفت نہیں کرتا تھا۔ لیکن اسی بادشاہ ـــــ شارلمانی ـــــ کے زمانے میں کلیسا کے حکم سے پورے یورپ کے اندر یہ مسئلہ منسوخ قرار دیا گیا۔ اور جن لوگوں کے پاس کئی کئی عورتیں تھیں ان کو شرعی لحاظ سے صرف ایک ایک عورت پر اکتفا کرنا پڑا۔ اور اسی باعث عیسائی بدکاری و زناکاری کی طرف مائل ہونے لگے اور جن کے پاس صرف ایک بیوی تھی وہ فسق و فجور کی طرف مائل ہو گئے

زمانۂ جاہلیت میں عرب کے مختلف قبیلوں میں نہایت ناپسندیدہ اور سخت عنوان سے تعدّدِ ازدواج کا مسئلہ رائج تھا اور مالی حیثیت کا لحاظ کئے بغیر عدالت یا دوسری شرائط کی طرف توجہ دئے بغیر ہر شخص اپنی حسبِ خواہش جتنی عورتیں چاہے رکھ سکتا تھا۔ اس وقت عورتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، اُن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنا ایک عادی بات تھی۔ مردوں کی مطلق العنانی نے عورتوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔

اسلام نے اس ظلم کی مخالفت کی اور اس فساد کا خاتمہ کر دیا لیکن مخصوص شرائط کے ساتھ اصل مسئلہ تعدّدِ ازدواج کو قبول کیا البتہ معاشرے کی ضرورتوں اور مرد و عورت کے مصالح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عورتوں کی تعداد کو صرف چار میں محدود کر دیا۔

درحقیقت اسلام نے اِس قانون کو مردوں کے بے قید و بند غیر محدود ہوس رانی کی وجہ سے بنایا ہے تاکہ مخصوص شرائط کے ساتھ اِس کام ـــــ تعددِ ازواج ـــــ کی انجام دہی کی جاسکے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اسلام کی نظر میں شادی بیاہ کے مسئلے میں اصل تعدد نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی پیش بندی ہے جس کی بنیاد یہ ہے کہ مختلف خطروں کو دُور کیا جاسکے۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹا ضرر انسان کو برداشت کرنا پڑتا ہے مثلاً جان بچانے کے لئے مال کی قربانی مذموم نہیں ہے۔

اس کے علاوہ تعددِ ازواج کا قانون تمام مسلمانوں کے لئے نماز، روزے کی طرح ہر شخص پر واجب و لازم نہیں ہے۔ کہ اگر ایک شخص چند عورتوں کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کرسکتا ہو اور اس کی معاشی حالت بھی چند عورتوں سے شادی کی اجازت دیتی ہو اور وہ اس کے باوجود صرف ایک عورت سے شادی کرے تو گویا اس نے فعلِ حرام کا ارتکاب کیا! جی نہیں ایسا نہیں ہے۔

تعددِ ازواج کے مسئلے میں عورتوں کو بھی ارادہ و عمل کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ وہ اپنی مرضی سے اس کام کو کریں کوئی جبر نہیں کیا گیا ہے۔ تعددِ ازواج کی اجازت دے کر اسلام نے عورتوں کی کسی قسم کی اہانت نہیں کی ہے، بلکہ عورتوں کو صرف اجازت دی گئی ہے کہ حالات کے لحاظ سے اگر وہ چاہیں تو ایسا کرسکتی ہیں ان کو قید تنہائی پر مجبور نہیں کیا گیا ہے۔

اگر شادی کرنے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد برابر ہو تو وہاں پر ہر مرد کے حصّے میں ایک ہی عورت آئے گی اور تعددِ ازواج کا مسئلہ خود بخود حل ہوجائے گا۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب معاشرے کو ضرورت نہ ہو تو پھر اس مسئلے کا وجود ہی نہ ہوگا لیکن اگر معاشرے کو شدید ضرورت ہو مثلاً

عورتوں اور مردوں کا توازن مختلف اسباب کی وجہ سے باقی نہ رہے بلکہ مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابل میں کم ہوجائے تو فاضل عورتوں کا اچار توڈالا نہیں جاسکتا، آخران کا حل کیا ہونا چاہئے۔

آئے دن کی جنگوں، مشکل کاموں کی انجام دہی، معاون کے اندر کام کرنا ـــــ جس میں ہزاروں آدمی ہلاک ہوتے رہتے ہیں ـــــ ان اسباب کی بناء پر مردوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اب یہاں پر اعداد و شمار کر کے فیصلہ کیجئے کہ کیا کیا جائے کیونکہ صحیح فیصلہ تو مردم شماری کے بعد ہی ہوگا۔ اعداد و شمار کے مطابق پوری دنیا میں قطعی طور پر عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ زیادتی مندرجہ بالا اسباب کی بناپر ہمیشہ سے دنیا میں رہی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ اب ذرا سوچئے تعددِ ازواج کے علاوہ اس کا کوئی اور حل ہوسکتا ہے؟ جی نہیں ناممکن ہے۔!

فرانس کی اعداد و شمار کے مطابق وہاں ہر سو پیدا ہونے والی لڑکیوں کے مقابلے میں ایک سو پانچ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عورتوں کی تعداد ایک ملیون سات سو پینسٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔ حالانکہ پورے فرانس کی آبادی چالیس ملیون سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں امراض کا مقابلہ کرنے کی طاقت کم ہے اس لئے پانچ فیصد لڑکے انیس ۱۹ سال کی عمر تک ختم ہوجاتے ہیں، کچھ پچیس سال تک اسی طرح مردوں کی تعداد گھٹتی رہتی ہے اور اب یہ حال ہے کہ ۶۵ سال کی عمر میں ۱½ ملیون عورتوں کے مقابلے میں ۷½ ہزار سے زیادہ مرد باقی نہ رہیں گے[1]

---

[1] اطلاعات ۱۱، ۹، ۳۵

اِس وقت امریکہ میں بیس ملیون عورتیں شوہر نہ ملنے کی وجہ سے کنواری ہیں اور مختلف عادتوں کی شکار ہیں[1]

پروفیسر "پیٹر مڈاوار" (PROFESSOR PETER MUDAWAR) مندرجہ بالا نظرئے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں اِس سبب سے اور دوسرے اسباب کی بنا پر بھی دنیا میں مردوں کی تعداد رُو بہ نقصان ہے[2]

جس طرح عورت ضروریات زندگی کا احساس کرتی ہے اسی طرح وہ اندرونی طور پر شوہر، تولید نسل، پرورشِ اولاد کی بھی ضرورت کا احساس کرتی ہے اور اس کی یہ خواہش شادی کے بغیر پوری نہیں ہوسکتی محض وسائلِ زندگی کا مہیّا ہوجانا اس کے باطنی التہاب کو ختم نہیں کرسکتا، اور عورت ہی کیا مرد کے یہاں بھی یہ احساس موجود ہے اور اصولاً اِن باتوں کا انکار ممکن نہیں ہے۔

دنیا میں عورتوں کی کثرت کی عِلّت بیان کرتے ہوئے اخبار اس اہم مسئلے کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ عورتوں کی تعداد روز بروز دنیا میں کیوں بڑھ رہی ہے؟ اِس کی دو علتیں ہیں۔

۱۔ عورتوں کی پیدائش (مردوں کے بہ نسبت) زیادہ ہوتی ہے۔

۲۔ مردوں کے مقابلے میں اُن کی عمریں بھی لمبی ہوتی ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ عورتوں کے بہ نسبت مردوں کی عمریں کم ہوتی ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ایک رنڈوے مرد کے مقابلے میں بیس بیوہ عورتیں موجود ہیں؛ عورت کی تنہائی اس کے لئے بہت دشوار اور سستی لانے والی چیز ہے۔ غیر شوہر دار عورتیں ہمیشہ شریکِ زندگی کے انتظار میں رہتی ہیں اور اُن کی پوری زندگی انتظار کے کمرے میں گزر جاتی ہے۔

---

[1] خواندنیہا شمارہ ۱۷ سال ۱۴ [2] کیہان ۳، ۱۲، ۳۸

آخر کیا بات ہے کہ بڑی زحمت و محنت سے پکائے ہوئے کھانے میں عورتوں کو تنہا کھانے میں لطف نہیں آتا؟ اس کی وجہ یہ ہے محض اپنے لئے کام کرنے کو عبث و بیکار سمجھتی ہیں، حالانکہ بچوں اور شوہر کے لئے کام بڑی رغبت سے کرتی ہیں۔ کنواری اور بیوہ عورتوں کی دس فی صد تعداد "ہر چہ پیش آید خوش آید" کے عنوان سے ہرگز غذا نہیں کھاتیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ایسی عورتیں زیادہ تر اپنے دن کو بے مقصد اور بد دلی سے گزارتی ہیں۔ دوستوں، قرابت داروں کے یہاں شوہر دار عورتوں کو دیکھ کر ان کا احساس مزید ہو جاتا ہے[1]

فاضل اور زائد عورتوں کا حل اسلام نے تعددِ ازواج کی صورت میں نکالا ہے کہ عورتوں کو یہ حق ہے کہ شادی شدہ مرد کے ساتھ شادی کر کے اپنے رنج تنہائی اور دیگر محرومیتوں سے نجات حاصل کریں۔

مردوں میں تولیدِ نسل کی صلاحیت اور جنسی خواہش تقریباً ہمیشہ باقی رہتی ہے لیکن عورتیں پچاس سال کے بعد حمل و پیدائش کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہیں۔ اب جس زمانے میں عورت کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے مرد کی شہوت پھر بھی بیدار رہتی ہے، اس لئے اگر مردوں کے لئے دوسری شادی کرنا غیر قانونی ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمر کے ایک حصے میں مرد کو اپنی اس خاصیت سے فائدہ کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ بہت سی عورتیں بانجھ ہوتی ہیں لیکن میاں بیوی کے آپسی محبت کی بنا پر مرد سے جدائی بھی نہیں چاہتیں اور ادھر مرد کے اندر وجودِ فرزند اور بقائے نسل کی فطری خواہش موجود ہے، ایسی صورت میں کس جرم

---

[1] سروس مخصوص خبر گزاری فرانس اطلاعات ۱۲۲۳۹

کی بنا پر مرد پوری زندگی اولاد کی خاطر آتشِ حسرت میں جلتا رہے اور اپنے مقصد کو کیوں نہ حاصل کرے۔؟

روزنامہ اطلاعات۔"ایک مرد کی تین بیویاں شوہر کی چوتھی شادی پر راضی" کے عنوان سے لکھتا ہے: کل ظہر کے بعد ایک مرد اپنی تین عورتوں کو لے کر رشت کی عدالت میں حاضر ہوا اور حاکم سے خواہش کی کہ میں ایک لڑکی سے محبّت کرتا ہوں مجھے اس سے شادی کی اجازت دی جائے اور میری موجودہ بیویاں اس پر راضی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ تینوں عورتوں نے عدالت کے سامنے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ـــــ اس شخص نے عدالت کے سامنے اپنی مجبوری اس طرح بیان کی کہ میری تینوں بیویاں بانجھ ہیں لیکن زراعت کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹاتی ہیں اس لئے ان کو طلاق بھی نہیں دینا چاہتا۔ اور چاہتا ہوں کہ ایک اور لڑکی سے شادی کروں جس سے میرے یہاں اولاد پیدا ہو ـــــ لڑکی نے بھی ہمارے رشت کے نامہ نگار سے کہا ہمارا ہونے والا شوہر ہمارے دیہات "سفید کپلتہ" کے بہت اچھے لوگوں میں سے ہے۔ (اس کے علاوہ) ہمارے دیہات میں دو ہزار عورتیں اور صرف چار سو مرد ہیں۔ مردوں میں بھی آدھے دس سے سولہ سال کے لڑکے ہیں یعنی ہمارے دیہات میں ایک مرد کے حصّے میں پانچ عورتیں پڑتی ہیں۔ ان دلائل کے پیشِ نظر اگر میں چوتھی بیوی بنوں تو جائے تعجّب نہیں ہے[1]

جو قانون مرد کو اس کی خواہش پوری نہ کرنے دے یعنی اولاد کی خواہش کو پوری نہ ہونے دے، کیا وہ مرد کے حق میں ظالم قانون نہیں ہے۔؟

اسی طرح زائد عورتوں کی صورت میں جب مرد و عورت دونوں کے

---

[1] اطلاعات ۲۰۔ بہمن ۴۸ شمارہ ۱۳۱۶۔

مصالح پیشِ نظر رکھے جائیں تو تعددِ ازواج کی صورت کے علاوہ کون سا ایسا طریقہ ہے کہ معاشرے میں خلل واقع نہ ہو اور تعاون و توازن نسل کے اندر موجود رہے؟

یہ ایک رُوحی وحیاتی واجتماعی ضرورت ہے اور ایک واقعی حقیقت ہے جس کا سامنا کرنا ہی ہے کوئی افسانہ یا تخیل نہیں ہے۔ اسی طرح کبھی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عورت کسی زَمِنْ (زمین گیر) بیماری میں گرفتار ہوجائے جو ناقابل علاج ہو اور ہمبستری کے لائق بھی نہ ہو اور مرد کی شہوت میں کوئی کمی نہ ہو اور اسلام عفت و پاکدامنی کے مخالف کام کی اجازت تو دیتا نہیں اَب دوسری شادی کو بھی روک دے تو سوچئے کہ کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ اِس موقع پر تعددِ ازواج کے قانون سے بہتر کونسا طریقہ ہے جس سے مَرد کی شہوت بجھائی جائے؟

(اسی طرح اگر شوہر کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوجائے جو ناقابلِ علاج ہو اور جنسی رابطہ عورت کے لئے نقصان دہ ہو تو اس کو بھی حق ہے کہ قاضی اسلام کی طرف رجوع کرکے طلاق کی خواہش کرے اور حاکم شرع شوہر سے اس کو طلاق دلوادے گا۔ اگر شوہر طلاق دینے پر تیار نہ ہو تو حاکم شرع اپنے اختیارات کو استعمال کرکے خود طلاق نافذ کرسکتا ہے)

اب ایسی صورت میں ـــــ جب عورت زمین گیر مرض میں مبتلا ہو کیا یہ بہتر ہے کہ مرد اس کو طلاق دیدے اور اس عضوِ معطل کے ذریعہ معاشرے کے بے سروسامان لوگوں میں ایک اور فرد کا اضافہ کردے؟ یا پھر تعددِ ازواج پر عمل کرتے ہوئے دوسری شادی کرلے اور اس عورت کو اپنی سرپرستی میں رکھ کر علاج و معالجہ کرائے؟ ظاہر ہے دوسری صورت بہتر ہے کیونکہ جس عورت نے اپنی زندگی کے قیمتی حصّے کو شوہر کے گھر میں گزارا ہو اس کے رنج و غم خوشی و مسرّت میں برابر کی شریک رہی ہو کیا انصاف اور وجدان

کا تقاضہ یہ ہے کہ شوہر تندرستی کے زمانے میں تو شریکِ زندگی بنائے لیکن بیمار ہونے کے بعد اس کو علیٰحدہ کردے؟ کیا یہی انسانیت ہے یہی شرافت ہے۔؟

اگر معاشرے کے افراد مختلف اسباب کی بناء پر فقر و فاقہ سے دوچار ہوجائیں اور مال داروں کو کئی شادیاں کرنے کا حق حاصل نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شادی بیاہ کا توازن بگڑ جائے گا، کیونکہ جو مال دار عورتوں میں عدل و انصاف برت سکتے ہیں ان کو غریب عورتوں سے شادی کرنے کا حق نہیں ہے اور غریب بے چارہ شادی ہی نہیں کرسکتا، پھر ایسی صورت میں کتنی ہی عورتیں بن بیاہی رہ جائیں گی اس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔

حفظِ عفتِ عمومی اور جنسی بے راہ روی کی روک تھام کرنے ہی کیلئے اسلام نے "تعددِ ازواج" جیسا موثر قانون ایجاد کیا ہے جس سے لاکھوں عورتوں کو انحرافاتِ جنسی سے بچا کر ان کی فطری خواہش ـــــ شوہر و اولاد ـــــ کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم میں جب ملیونوں افرادِ لقمۂ اجل بن گئے اور بہت سی عورتیں بغیر شوہر کے رہ گئیں تو عورتوں کی انجمن نے جرمنی حکومت سے جرمن کے اندر "تعددِ ازواج" کے قانون کے نفاذ کی مانگ کی۔ لیکن کلیسا کی مخالفت کی وجہ سے ان کی مانگ پوری نہیں کی گئی اور خود کلیسا نے اس مسئلے کا کوئی عملی و منطقی حل نہیں پیش کیا اس لئے عورتیں مختلف اخلاقی مفاسد اور جنسی بے راہ روی کی شکار ہوگئیں اور ناجائز اولاد کی بھرمار ہوگئی۔

اخباروں نے اس طرح تفصیل لکھی ہے۔

"دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جرمنی کی بے شوہر عورتوں نے حکومت سے

تعدّدِ ازواج کے قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا تاکہ عورتوں کی شرعی و فطری مانگ ـــــ شوہر و اولاد ـــــ پوری ہو سکے مگر کلیسا نے مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا یورپ بدکاری کا اڈّا بن گیا۔[1]

زندگی کی وحشتِ تنہائی بیس سالہ عورتوں تک میں عام ہو رہی ہے تیس چالیس سالہ عورتوں کا پوچھنا ہی کیا۔ مردوں اور عورتوں کی آزادی بھی عورتوں کے دل سے "شوہر" کی خواہش نہیں نکال سکی۔ آج بھی "بنتِ حوّا" کی نظریں "ابنِ آدم" کی متلاشی ہیں۔ تمام امکانی صورتوں اور ترقیوں کے باوجود جو اتحادی جرمنی کے اندر عورتوں کے لئے مہیّا کی گئی تھیں آج بھی عورت اپنی حفاظت و پاسداری کے لئے شوہر کی تلاش میں ہے۔

بیس[۲۰] سے پچیس[۲۵] سالہ لڑکیوں کے لئے شوہر زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن تیس[۳۰] سے چالیس[۴۰] سالہ عورتوں کے لئے شوہر ایک ناممکن سی چیز ہو گیا ہے۔ پچاس سالہ عورتیں تو بے شوہر ہی رہ جاتی ہیں اعداد و شمار کے مطابق فقط پچاس فیصد پینتیس[۳۵] سالہ اور بیس[۲۰] فیصد چالیس[۴۰] سالہ عورتوں کے لئے شوہر کا چانس ہے اور پانچ فیصد پچاس سالہ عورتیں شادی کی اُمید کر سکتی ہیں (مگر شوہر کا ملنا ناممکن ہے) اس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ چھ[۶] ملیون سے چالیس[۴۰] سال زیادہ کی عورتیں آج اتحادی جرمنی میں بغیر شوہر کے ہیں۔

چونکہ ۱۳ فیصد مرد بغیر عورت کے ہیں اور ۷، ۹ فیصد عورتیں شادی کی خواہشمند ہیں اس وجہ سے شوہر چاہنے والی عورتوں، اور عورت چاہنے والے مردوں کے لئے ایک مشکل درپیش آ گئی ہے۔

جوان شوہروں سے شادی کے امکانات محدود ہیں اور چھ[۶] ملیون بے شوہر

---

[1] اطلاعات ۲۹/۸/۴۰۔

عورتوں کا مسئلہ قابلِ حل نہیں ہے اس لیے جرمنی سے بہت زیادہ باہر جانے والی عورتوں میں پچاس فیصد ایسی عورتیں ہیں جو شوہر کی تلاش میں جرمنی سے باہر کا سفر کرتی ہیں [1]

مغربی جرمنی کے اس مسئلے کا حل صرف یہی ہے کہ "تعددِ ازواج" کو قانونی شکل دے کر اس مشکل کو حل کیا جائے اور عورتوں و مردوں کی بے راہ روی کی روک تھام کی جائے۔

مغرب کا دعویٰ ہے کہ اس نے عورتوں کے ساتھ بڑی مہربانی برتی ہے اور ان کو کامل آزادی بخشی ہے اگر ایسا ہے تو اُن کی جائز خواہشوں اور گھر بسانے کی تمنّا کے سامنے کیوں دیوار کھڑی کرتا ہے؟ ان کو ان کے اصلی فریضے — تولید فرزند و تربیتِ اولاد — سے کیوں محروم کرتا ہے؟ جو مرد و عورت مِل جُل کر خانگی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ان کو اپنے مقصد کی تکمیل کیوں نہیں کرنے دیتا؟ عورتوں کو بے دفاعی کی حالت سے کیوں نہیں نکلنے دیتا؟ آخر اِن بے شوہر عورتوں کی تکلیف کیا ہے؟ کیا ان کو ہمیشہ کے لئے تشکیل خانوادہ، اولاد، جنسی پیاس بجھانے سے محروم کیا جا سکتا ہے؟ اسلام کے تعدّدِ ازواج کا مسئلہ عورتوں کے حق میں مُفید ہے یا نقصان دہ؟ اسلامی قانون نے عورتوں کو زیادہ آزادی بخشی ہے یا اُن کی فطری خواہشات کو محدُود کر دیا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات محترم پڑھنے والوں کے اوپر چھوڑتا ہوں آپ حضرات خود ہی جواب دیں اور صحیح راستہ اختیار کریں۔!

ایک مرد کے گھر میں ایک یا چند عورتوں کے ساتھ رہ کر زندگی بسر کرنے پر آمادگی خود بتاتی ہے کہ بے شوہری اور تنہائی کی زندگی سے "تعدّدِ ازواج"

---

[1] اطلاعات ۳/۳/۴۹۔

بہتر ہے۔ یہ تو بے چارہ مرد ہے جو کئی شادیاں کر کے اپنی ذمّہ داریوں میں اضافہ کر لیتا ہے۔

ایک پڑھی لکھی مُعزز خاتون جنھوں نے حقوق میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اس مسئلے پر اظہار رائے کرتے ہوئے واضح الفاظ میں تحریر کرتی ہیں، کوئی بھی عورت چاہے وہ پہلی بیوی ہو یا دوسری یا کوئی اور "تعددِ ازواج" سے اس کو کوئی نقصان نہیں ہوتا! بلکہ طے شدہ بات یہ ہے کہ اس قانون سے مَردوں کو ضرر پہونچتا ہے کیونکہ ان کا بوجھ بڑھ جاتا ہے ان کی تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے اس لئے کہ جب کوئی مرد کسی عورت سے شادی کرے گا تو شرعاً، اخلاقاً قانوناً، عرفاً اس عورت کا ذمہ دار ہوگا اور آخر عمر تک اس عورت کے شایانِ شان وسائلِ زندگی مہیّا کرنا مَرد کا فریضہ ہوگا۔ اسی طرح عورت کے صحت کی ذمّہ داری بھی اس پر ہوگی یعنی بیماری کی صورت میں علاج معالجہ کرانا اس کے مصارف برداشت کرنا ہوں گے اور فطرات سے بچانا بھی اس کا فریضہ ہوگا۔!

اگر مَرد ان چیزوں میں کوتاہی کرتا ہے تو عرف اس کو فرائض کی انجام دہی پر مجبور کرے گا۔ لکھنے والی کے عقیدے کے لحاظ سے "تعدّدِ ازواج" کے سلسلے میں نادانستہ جتنے اعتراض عورتوں کی زبان سے ہوتے ہیں، یہ درحقیقت مردوں کے اعتراض ہیں جو عورتوں کی زبان سے کہلائے گئے ہیں۔ عورتیں طوطی کی طرح رٹ کر ہر جگہ اس راگ کو الاپتی رہتی ہیں (گویا یہ عورتوں کی بے وقوفی اور مَردوں کی عقل مندی ہے۔ مترجم) کیونکہ درحقیقت مرد مختلف شبہات پیدا کر کے شادی سے روکتے ہیں کیونکہ اس قانون سے انھیں کو نقصان ہے عورتوں کو کوئی نقصان نہیں ہے اور مرد یہ چاہتا ہے کہ قانونی پابندی سے بچ کر اپنی جنسی خواہش پوری کرتا رہے۔ مگر نادان عورت اس بات کو نہیں سمجھ پاتی۔ اگر کسی مَرد کے دو بیویاں ہیں تو جنسی

تعلّق سے عورت کو کوئی نقصان نہیں ہے بس روحانی طور پر عورت کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میرے شوہر کی دوسری بیوی بھی ہے لیکن یہ رُوحانی تکلیف بھی حقیقی چیز نہیں ہے بلکہ مَردوں کی سوجھائی ہوئی بات ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے زمانۂ سابق میں لوگوں کے کئی بیویاں ہوتی تھیں اب بھی ایسی مثالیں مل جائیں گی کہ ایک گھر میں دو تین بیویاں مل کر زندگی بسر کرتی ہیں اور کسی کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ لیکن مَردوں کے بہکائے میں اگر اب اُن کو بھی تکلیف کا احساس ہونے لگا ہے اگر واقعًا دوسری بیوی باعث تکلیف ہوتی تو پہلے زمانے میں یہ احساس کیوں نہیں تھا۔؟

اب آپ سمجھئے کہ مغرب نے جنسی بے راہ روی تو جائز قرار دے دی لیکن فطری خواہش ـــــ شوہر و اولاد ـــــ پر پابندی لگا دی۔ لیکن اسلام لوگوں کو معقول آزادی دیتا ہے اور ایسی آزادی جو مصالحِ فرد یا اجتماع کے لئے نقصان دَہ ہو اس کی کسی قیمت پر اجازت نہیں دیتا۔

چونکہ اسلام کی نظر میں عَدل و انصاف فرد و اجتماع کی سَعادت کا اہم جُزو ہے اسی لئے "تعدّدِ ازواج" میں بھی اسلام نے عدالت کی شرط رکھی ہے اور مختلف اُمور میں عَورتوں کے ساتھ کیسی عدالت بَرتی جائے اس سلسلے میں فقہ اسلامی کے اندر بہت زیادہ دستور بتائے گئے ہیں اور عَورتوں کی آزادی برابر کے حقوق وغیرہ کی بہت عمدہ طریقے سے ضمانت دی گئی ہے۔

بہت سی ایسی عورتیں بھی ہیں جو رضا و رغبت کے ساتھ اپنے شوہروں کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہیں۔ عورتوں کی یہ رضامندی اس بات کی دلیل ہے کہ "تعدد ازواج" کا مسئلہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ اگر یہ خلاف فطرت قانون ہوتا تو عورت کسی بھی قیمت پر برضا و رغبت مرد کو دوسری شادی کی اجازت

ہرگز نہ دیتی۔ کیونکہ ان کو یہ ڈر لگا رہتا کہ شوہر نکاح کے دستور پر عمل نہ کرے گا اور اس طرح ہمارے حقوق برباد ہو جائیں گے۔

اگر کسی گھر میں ناراضی، اختلافات دکھائی دیتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں امتیاز برتا جاتا ہے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا ہے اسلام کا اعلان ہے، حلال عورتوں میں دو یا تین بلکہ چار تک عورتوں سے تم شادی کر سکتے ہو (بشرطیکہ عدالت کر سکو) لیکن اگر یہ ڈر ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک سے زیادہ شادی نہ کرو[1]

مختصر یہ ہے کہ کچھ مردوں کے غیر معقول اور سخت گیر رویہ سے گھروں میں شدید اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور شرعی و اخلاقی فریضہ میں بیویوں سے انصاف نہ کرنے کی وجہ سے گھریلو ماحول مہر و محبت کے بجائے دہکتا ہوا جہنم بن جاتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے اعمال کی طرف توجہ دئے بغیر اسلام کے احکام کی گہرائی کو سوچنا چاہئے تاکہ حقیقت کا پتہ چل سکے ـــــ اسلام کے اندر ایسے بھی دستور و قانون موجود ہیں جن کی بنا پر مردوں کو عورتوں سے منصفانہ سلوک کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے مثلاً اگر کوئی مرد بیوی کا نان نفقہ نہیں دیتا، یا بیویوں میں عدالت سے کام نہیں لیتا اور اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا تو اس سے شرعی باز پرس ہوگی اور اس کو سزا بھی دی جائے گی۔

ہاں ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ دلی لگاؤ اور قلبی جھکاؤ انسان کے قدرت سے باہر کی چیز ہے اور بہت ممکن ہے کہ کسی عورت کے اندر زیادہ خصوصیات ہوں جس کی بنا پر مرد اس سے زیادہ محبت کرتا ہو، اسی لئے اسلام نے مرد کو نان و نفقہ، مکان، ہمبستری اور تمام روحانی، جسمانی، مالی خواہشات

---

[1] سورہ نساء آیت ۳

کی مساوات پر مجبور کیا ہے یعنی جو چیزیں انسان کے بس کی ہیں اُن میں عدالت شرط ہے اس میں کسی قسم کی زیادتی، ظلم وستم جائز نہیں ہے۔ لیکن جو باتیں انسان کے بس سے باہر ہیں ان میں عدالت شرط نہیں ہے۔

عورتوں کے لئے جن حقوق کی خانگی زندگی میں زیادہ اہمیت ہے اسلام نے ان کی حفاظت کی ہے اور یہ طے شدہ بات ہے کہ دلی لگاؤ کی وجہ سے اگر برتاؤ میں فرق پڑ جائے تب تو عورت کے حقوق ضائع ہوتے ہیں، لیکن اگر کسی عورت سے قلبی لگاؤ ہونے کے باوجود لباس، خوراک، مکان، اور دیگر ضروریاتِ زندگی میں مثلاً ہمبستری وغیرہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ عدالت کے موافق کام ہوتا ہے تو پھر اس قلبی لگاؤ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی لئے خانگی زندگی میں بے مہری کے آثار نہیں پیدا ہونے دینا چاہئے! قرآن کہتا ہے: عورت کو معلّق ——— نہ شوہر دار، نہ بے شوہر ——— نہ کرو اس کو موت و زندگی کے بیچ میں مت پھنساؤ[1]

اسی لئے کسی مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی کچھ بیویوں کے ساتھ بے رُخی سے پیش آئے اور ان کو بیچ منجدھار میں چھوڑ دے۔

حضور سرکار کائنات کے زمانے میں جب یہ حکم نافذ ہوا ہے تو جن اصحاب کے پاس چار بیویاں تھیں اُن کو پابند بنایا گیا کہ اگر سب کے ساتھ انصاف نہ کر سکو تو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو اور اگر انصاف بھی کر سکتے ہو تو چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتے۔ اس ذریعے سے اسلام نے "تعدّدِ ازواج" کے غیر عادلانہ برتاؤ، اور عورتوں کے حقوق سے بے پرواہی مطلق العنان

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۲۲۔

جنسی بے راہ روی پر پابندی عائد کر دی اور ہر ظلم و ستم کا خاتمہ کر دیا۔

مسلمانوں میں جو مذہبی قانون کے پابند تھے ان میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنھوں نے عورتوں کے مرنے کے بعد بھی عدالت و انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا مثلاً "معاذ بن جبل ـــــ صحابی پیغمبرؐ ـــــ کے دو بیویاں تھیں اور طاعون میں دونوں ایک ساتھ مر گئیں۔ معاذ اس وقت بھی عدل انصاف سے کام لینا چاہتے تھے کہ کس کو پہلے دفن کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کام کے لئے قرعہ اندازی سے کام لیا"۔[1]

مغرب میں بھی بعض ایسے منصف مزاج دانش مند پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اس مسئلے پر کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ دیا ہے کہ "تعدّدِ ازواج" معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مشہور جرمنی فلسفی شوپنہاور (SCHOPENHAUER) اپنی کتاب ـــــ عورتوں کے بارے میں چند باتیں ـــــ میں تحریر کرتا ہے: جس مذہب میں "تعدّدِ ازواج" کا قانون موجود ہے اس میں اس کا امکان ہے کہ عورتوں کی ایسی اکثریت "جو کل کے قریب ہو شوہر فرزند، سرپرست سے ہمکنار ہو" کافی تعداد میں پائی جائے لیکن یورپ کے اندر کلیسا ہم کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا اس لئے شوہر دار عورتیں بغیر شوہر والی عورتوں سے کئی گنا کم تعداد میں ہیں کیونکہ بہت سی کنواریاں شوہر کی آرزو لے کر اور بہت سی عورتیں اولاد کی خواہش لے کر اس دنیا سے چلی گئیں اور بہت سی عورتیں اور لڑکیاں جنسی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی عفّت کھو بیٹھیں اور بدنام ہو گئیں اور ساری زندگی آتشِ عصیاں و تنہائی میں جلتی رہیں اور انجام کار اپنی فطری خواہش ـــــ شوہر و اولاد ـــــ تک نہ پہنچ سکیں (اگر "تعدّدِ ازواج"

---

[1] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۱۲۱۔

کا قانون ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی۔ مترجم)

میں نے بہت سوچا مگر مجھے کوئی دلیل نہیں ملی کہ اگر کسی مرد کی بیوی مزمن مرض میں گرفتار ہو یا بانجھ ہو، یا عملِ حمل و وضع سے عاجز ہو تو وہ بے چارہ دوسری عورت سے شادی کیوں نہ کرے؟ اس کا جواب کلیسا کو دینا چاہئے مگر کلیسا کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ بہترین قانون وہ ہوتا ہے جس کے سہارے زندگی کی سعادت محفوظ رہے نہ کہ وہ جس کی بدولت زندگی جہنّم کا نمونہ بن جائے

میسز آنی بسنٹ (MRS. ANIE BESANT) تحریر کرتا ہے:

مغرب کا دعویٰ ہے کہ اس نے "تعدّدِ ازواج" کے قانون کو نہیں قبول کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ بغیر ذمہ داری کے یہ قانون مغرب میں موجود ہے بایں معنی کہ مرد جب اپنی معشوقہ سے سیر ہو جاتا ہے تو اس کو بھگا دیتا ہے اور یہ بے چاری گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی ہے کیونکہ پہلا عاشق اپنی کوئی ذمہ دار محسوس ہی نہیں کرتا اور عورت کی یہ حالت ہزار درجہ اس عورت کی حالت سے بدتر ہے جو قانونی شوہر رکھتی ہے بال بچّے والی ہے، خاندان میں شوہر کے زیرِ حمایت زندگی بسر کر رہی ہے ـــــ میں جب ہزاروں عورتوں کو رات کے وقت سڑکوں پر حیران و سرگرداں دیکھتا ہوں تو مجبوراً سوچتا ہوں کہ اہلِ مغرب کو اسلام کے "تعدّدِ ازواج" کے قانون پر ہرگز اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ جو عورت "تعددِ ازواج" کے قانون کے ماتحت شوہر رکھتی ہے، گود میں چھوٹے چھوٹے بچّے رکھتی ہے، اور نہایت احترام کے ساتھ شوہر کے خاندان میں زندگی بسر کرتی ہے وہ ہزاروں ہزار درجے اس عورت سے بہتر ہے جو گلی کوچے میں حیران و پریشان گھومتی ہے، گود میں ناجائز

786
2128

بچہ رکھتی ہے۔ جس بچے کو کوئی قانونی حمایت حاصل نہیں ہے، جو دوسروں کی شہوتوں کے قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ چکی ہے۔

ڈاکٹر گوسٹاوے لیبون (DR. GUSTAVE LEBON) لکھتا ہے:

مشرقی رسم و رواج میں "تعددِ ازواج" کے مسئلے کو مغرب میں جس قدر غلط طریقے سے پیش کیا گیا ہے کسی بھی رسم کے بارے میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ اور کسی بھی مسئلے پر مغرب نے اتنی غلطی نہیں کی ہے جتنی "تعددِ ازواج" کے مسئلے پر کی ہے۔ میں واقعاً متحیر ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ مشرق کا "تعددِ ازواج" کا مسئلہ مغرب کے "فریبی ازدواج" سے کس طرح کم ہے۔ اور اس میں کیا کمی ہے۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ "تعددِ ازواج" کا شرعی مسئلہ ہر لحاظ سے بہتر و شائستہ ہے[1]

———: تمام شد :———

---

[1] تمدن اسلام و عرب صفحہ ۵۲۶، ۵۲۷

نوٹ۔ دوسرا ایڈیشن حروف و صفحات کے لحاظ سے پہلے ایڈیشن سے دوگنا ہے۔ بہت سے حک و اصلاح کے بعد یہ پہلے ایڈیشن سے بہت بہتر ہے۔ حجم کتاب نہ بڑھ جائے اس لئے قرآنی آیات و اسلامی روایات کے ترجمے پر اکتفا کی گئی ہے اصل عبارت کو نہیں لکھا گیا ہے ———

(کتبہ عباس گبھروی)

بمیمنت چهارمین سالگرد

انقلاب اسلامی

(دهه فجر)